ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں

نگراں

پروفیسر قاضی افضال حسین

مرتّب

پروفیسر سیّد محمد ہاشم

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مذاکرہ

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں

نگراں

پروفیسر قاضی افضال حسین

مرتّب

پروفیسر سیّد محمد ہاشم

شعبۂ اُردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(بسلسلۂ مطبوعات شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

اشاعت : ۲۰۰۷ء / ۱۴۲۸ھ
مطبع : اے. ایم. یو. پریس، علی گڑھ
کمپوزنگ : محمد شاہد عالم
ناشر : شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ملنے کا پتہ : پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Hum Adab Kiyon Padhte Hain
Compiled by:
Prof. Syed Mohammad Hashim

Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002
INDIA

فہرست شرکاء

●

عرضِ مرتب

اسلام کا پہلا سبق، قرآن کریم کی پہلی آیت اور رسول اکرمؐ پر پہلی وحی یہ نازل ہوئی کہ پڑھو اُس رب کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا۔......اور...... انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

احادیث میں علم حاصل کرنا، پڑھنا اور سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا اور بچپن سے موت تک علم سیکھتے رہنے کی تلقین کی گئی، یہ بھی کہا گیا کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمھیں چین جانا پڑے اور رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو علم مجھ سے سیکھو وہ دوسروں تک پہنچا دو، چاہے وہ ایک ہی بات (آیت) ہو، اُس زمانے میں قرآن پاک جتنا نازل ہوتا جاتا تھا وہ صحابہ کرام کو پڑھایا اور سمجھایا جاتا تھا، مسجد نبوی میں تو باقاعدہ طور پر اس کا درس ہوتا تھا۔

ارسطو نے اپنے زمانے کے علوم اور اپنی تخلیقات کو پڑھانے کے لیے لیسوم میں ایک مدرستہ المشائین قائم کیا تھا جہاں وہ خود درس دیتا تھا، اور اپنی تخلیقات پر اپنے شاگردوں سے تبادلۂ خیال کرتا تھا اور وہاں اس کے شاگرد اس کی کتابوں کی شرحیں لکھتے تھے۔ غرض پڑھنے پڑھانے کی یہ روایت ہر جگہ موجود رہی ہے، اور ہزاروں سال سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اور یہ تعلیمی و تدریسی ادارے اور دانش گاہیں ہمیشہ سے ہی علوم وفنون کی تعلیم و تربیت کے اہم مراکز رہے ہیں، جہاں دوسرے علوم کے علاوہ زبان و ادبیات کے مستقل شعبے قائم ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو نہ صرف علی گڑھ بلکہ پورے برصغیر کی دانش گاہوں کے اُردو کے شعبوں میں ممتاز ترین حیثیت رکھتا ہے، یہاں ارسطو کے مدرستہ المشائین کی طرح ادب تخلیق بھی ہوتا ہے، اسے باقاعدہ پڑھایا بھی جاتا ہے اور اس کی شرحیں اور تجزیے بھی لکھے جاتے ہیں اس کے علاوہ

مختلف اصناف، تحریکات، رجحانات اور تخلیقات پر کھل کر تبادلۂ خیال اور مذاکرے ہوتے ہیں، ان مذاکروں میں شعبہ کے اساتذہ، شعبہ سے باہر یونیورسٹی کے بعض دیگر شعبوں کے دانشور، علی گڑھ سے باہر پورے ہندوستان کے ادباو اساتذہ اور کبھی کبھی پاکستان، بنگلہ دیش، امریکہ اور دیگر ملکوں کے اُردو اساتذہ بھی باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔

ہمارے شعبہ میں پروفیسر آل احمد سرور کے زمانے سے سیمناروں اور مذاکروں کا باقاعدہ آغاز ہوا جس میں جدید ترین ادبی موضوعات پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا اور بعد میں ان مقالات ومباحث کو کتابی شکل میں بھی پیش کر دیا جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ سیمناروں اور مذاکروں کی یہ روایت توانا تر ہوتی گئی، اور گذشتہ تقریباً پندرہ سال سے یعنی جب سے شعبہ کو ڈپارٹمنٹ آف اسپیشل اسسٹنس کا درجہ ملا ہے، سال میں دو یا تین بھرپور سیمنار ہو جاتے ہیں، جن میں تمام ہی اہم ادبی موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں اور بہت ہی کشادہ ذہنی اور فکری آزادی کے ساتھ شرکاء مباحثوں میں حصہ لیتے ہیں اور سیمنار کے تمام مقالات ومباحث کتابی شکل میں شائع ہوتے ہیں۔

اسی طرح کے دوروزہ ادبی مذاکرہ کا انعقاد شعبۂ اُردو میں گذشتہ ۲۹؍۳۰ مارچ ۲۰۰۷ء کو کیا گیا۔ جس کا موضوع تھا ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں۔'' صدر شعبہ پروفیسر قاضی افضال حسین نے روایت سے ذرا ہٹ کر یہ موضوع تجویز کیا تھا، جس کے پس پشت ان کا یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اس طرح مذاکرہ کے شرکاء کو اپنے اصلی اور حقیقی خیالات پیش کرنے اور حاضرین کو ان خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ اس موضوع کو پسند کیا گیا۔ صدر شعبہ نے اس بات پر بھی اصرار کیا کہ شعبہ کے تمام اساتذہ اس مذاکرہ میں اپنے مقالے پڑھیں۔ گذشتہ سال ''معاصر ادب'' پر منعقدہ سیمنار میں یہ تجربہ بڑی حد تک کامیاب رہا تھا، لیکن اس بار پتھر ذرا زیادہ بھاری تھا اور خاردار بھی۔ کمان ایک سیّدزادہ کے ہاتھ میں دے دی گئی، جو فطری تواضع وانکسار کے سبب اپنے خوردوں کو بھی علمی اعتبار سے بہت بلند سمجھتا ہے، نتیجہ ظاہر تھا پتھر بتدریج پگھل گیا اور شعبے کے ایک ایک ہیرے کا جگر پھول کی اس کمزور پتی سے واقعی کٹ گیا، چنانچہ

انھائیس میں سے پچیس اساتذہ نے اس مذاکرے میں اپنے مقالے پیش کیے، بعض اساتذہ اس وقت دیگر ذمہ داریوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے اپنے مقالے بعد میں دے دیے جو شاملِ کتاب ہیں، شعبہ سے باہر سے پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر سعید الظفر چغتائی، محترمہ کنیز خواجہ احمد اور پروفیسر کے۔ ایم شرا ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے شرکت کی، علی گڑھ سے باہر سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ انگریزی کے سابق صدر پروفیسر نقی حسین جعفری، جناب شموئل احمد (پٹنہ)، جناب پیغام آفاقی، دہلی، جناب فرحت احساس اور ڈاکٹر خالد جاوید (جامعہ ملیہ اسلامیہ) تشریف لائے تھے۔

اس مذاکرہ کا افتتاحی اجلاس ۲۹ر مارچ صبح ۱۱ بجے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں شروع ہوا، جس کی صدارت عہد حاضر کے مشہور و معروف افسانہ نگار جناب جوگیندر پال نے کی، اس اجلاس کا کلیدی خطبہ شعبہ کے وزیٹنگ پروفیسر، جناب شمیم حنفی نے پیش کیا، اور خصوصی مقالہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پڑھا۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر کے۔ ایم شرا نے بھی اس موضوع پر دلچسپ انداز میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ صدر شعبہ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مذاکرہ کی غرض و غایت بیان کی، جب کہ سید محمد ہاشم نے اپنی تعارفی تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس مذاکرہ میں شرکت پر تمام مہمانوں کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔

اس دو روزہ مذاکرہ میں افتتاحی سیشن کے علاوہ کل چار اجلاس ہوئے، جن میں ۲۹ مقالے پڑھے گئے۔ ان کی پوری تفصیل اور مذاکرہ کی مکمل روداد اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ اس لیے یہاں اس پر مزید گفتگو غیر ضروری اور تکرار کا باعث ہوگی، البتہ کچھ اشارے ضروری ہیں۔

اس مذاکرہ کی غرض و غایت کے عین مطابق تمام ہی مقالہ نگاروں نے ادب پڑھنے کے اپنے ذاتی اسباب پر کم و بیش پوری دیانت داری کے ساتھ روشنی ڈالی، اور حقیقت یہ ہے کہ بڑے رنگا رنگ اور دلچسپ حقائق سامنے آئے، اس ضمن میں لوگوں نے اپنے بعض کھٹے میٹھے تجربات بھی بیان کیے۔ مقالہ نگاروں کو جو تخلیق کار یا ان کے رویّے

پسند نہیں تھے، انھوں نے ان کا بھی بہت خوب صورتی سے اظہار کیا۔ اکثر حضرات نے شروع میں اپنے مطالعہ کے سفر کی روداد بیان کی، اور پھر موجودہ دور میں اپنے مطالعۂ ادب کے اسباب بیان کیے، بعض حضرات نے اصل موضوع پر کم بلکہ بہت کم اور ادب کی ماہیت پر زیادہ اظہار خیال کیا۔ بیرونی مہمانوں میں پروفیسر نقی حسین جعفری بنیادی طور پر تو انگریزی کے عالم اور استاد ہیں، لیکن عربی، فارسی اور ادبیات میں بھی ان کی فتوحات بہت قابلِ قدر ہیں ان کے وقیع مقالہ اور صدارتی کلمات نے سامعین کو بہت متاثر کیا۔ پروفیسر سعید الظفر چغتائی اور جناب شموئل احمد کے مقالات بھی بہت دلچسپی سے سُنے گئے۔ ڈاکٹر خالد جاوید جو بہت اچھے افسانہ نگار ہیں، انھوں نے بھی اپنا مقالہ بہت خوب صورتی سے پیش کیا۔ جناب پیغام آفاقی آئی. پی. ایس، جو علیگرین بھی ہیں، نے اپنے مطالعہ کے اسباب پر ایک مختصر لیکن دلچسپ اور جامع تقریر کی اور تمام مقالہ نگاروں سے الگ، اپنے ایمان کی آبیاری اور ایمان کی مضبوطی کے لیے ادب پڑھنا بنیادی سبب بتایا۔ جناب فرحت احساس بھی پُرانے علیگرین ہیں، وہ جامعہ ملیہ دہلی سے تشریف لائے تھے، انھوں نے بہت دلچسپ مگر دقیق داستانوی زبان و اسلوب میں اپنا مقالہ پیش کیا وہ جو کچھ سنا رہے تھے اس بیانیہ کے خود ہی مرکزی کردار بھی تھے۔ محترمہ کنیز خواجہ احمد نے اپنا فاضلانہ اور مدلّل مقالہ انگریزی میں پڑھا، وہ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں انگریزی کی استاد ہیں۔ اس مضمون کو پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب نے اُردو میں منتقل کیا ہے، مرتب ان کا بے حد شکر گذار ہے۔ جناب جوگیندر پال نے اپنے مخصوص پنجابی لب ولہجہ میں صدارتی تقریر کی، ان کی تقریر بہت سے بلیغ ادبی اشاروں پر مبنی تھی، اور حاضرین اس سے بہت محظوظ ہوئے۔ یونیورسٹی کی شان ہمارے سینئر (سبکدوش) اساتذہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور پروفیسر قاضی عبدالستار صاحبان کی موجودگی اور صدارتی تقاریر نے بھی حاضرین کو غیر معمولی طور پر مسرّت و شادمانی سے ہمکنار کیا، اور شعبہ کے وزیٹنگ پروفیسر، جناب شمیم حنفی کے عالمانہ کلیدی خطبے سے بھی لوگ سرشار ہوئے۔ شعبہ کے سینئر اساتذہ نے تو بھرپور علمی شان کے

ساتھ اپنے افکار عالیہ پیش کیے لیکن اس بات پر حیرت انگیز خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نئے اساتذہ نے بہت محنت سے اپنے مقالے تیار کیے اور بہت اعتماد اور سرشاری کے لہجہ میں پیش بھی کیے۔ اور اس طرح ان تمام مقالات میں غیر معمولی حسن اور تنوّع پیدا ہو گیا تھا۔ اب ان مقالات و تقاریر کا مجموعہ کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے، جس سے بیک وقت تمام شرکائے مذاکرہ کے خیالات اور فنّی تجربات سے واقف ہونے کا موقع ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مقالات بڑی وقعت و بصیرت کے حامل ہیں، مجھے اُمید ہے کہ وہی مسرّت و بصیرت اس کتاب کے قارئین تک بھی منتقل ہو سکے گی، اور مطالعۂ ادب کی نئی راہیں کھلیں گی اور نئے گوشے منوّر ہوں گے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا، اس مذاکرہ کے انعقاد کی ذمہ داری، راقم الحروف کو سونپی گئی تھی اور بفضلہٖ تعالیٰ تمام رفقائے شعبہ کے تعاون سے یہ مذاکرہ بحسن خوبی انجام پذیر ہوا۔ صدر شعبہ پروفیسر قاضی افضال حسین نے ان مقالات کی ترتیب و اشاعت کا بھی حکم دیا، اور اس طرح یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہیں، اس کے لیے قاضی افضال حسین صاحب کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جب کوئی کام سپرد کرتے ہیں تو درمیان میں کسی طرح کی مداخلت روا نہیں رکھتے۔

چوں کہ یہ ادبی محفل پوری طرح سیمینار نہیں بلکہ مذاکرہ تھا اور اس میں مقالات و تقاریر کا صرف ایک ہی موضوع تھا کہ ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں'' لہٰذا ہر مقالہ کی پیشانی پر بار بار ایک ہی عنوان دینا کچھ بہتر نہیں معلوم ہوا، اس لیے مذاکرہ کی مناسبت سے ہر مضمون کے شروع میں مذاکرہ نگار کا صرف نام لکھا گیا ہے اور مضمون کا عنوان حذف کر دیا گیا ہے، اسی طرح فہرست مقالہ نگار کے بجائے فہرست شرکاء درج کیا گیا ہے۔ البتہ جن حضرات نے میرے مطالعۂ ادب کے اسباب، میں ادب کیوں پڑھتا ہوں، ادب اور میں، مطالعۂ ادب کے ذاتی اسباب وغیرہ وغیرہ عناوین کے علاوہ کوئی بالکل ہی مختلف اور نیا عنوان دیا ہے اس کو ''مصنف کا عنوان'' لکھ کر نیچے حاشیے میں درج کر دیا گیا ہے۔

اس موقع پر میں مذاکرہ میں شریک سبھی مندوبین کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جن کی شرکت سے مذاکرہ کی رونق میں اضافہ ہوا اور حاضرین کو ان کے قیمتی خیالات سننے کا موقع ملا۔ اپنے رفقائے گرامی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھی مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ان سبھی نے بھرپور محبت اور انہماک کے ساتھ اس مذاکرہ کو کامیاب بنایا اور اپنے قیمتی مقالات پیش کیے۔ مقالات کے اس مجموعہ کی اشاعت میں مالی تعاون کے لیے میں اپنے وائس چانسلر جناب نسیم احمد آئی. اے. ایس اور اب پروفیسر پی. کے. عبدالعزیز صاحب کا بھی بے حد شکر گذار ہوں۔

اس کتاب کی ترتیب اور طباعت و اشاعت کے لیے بوجوہ مجھے بہت کم وقت ملا، موسم گرما کی تعطیلات کے بعد اس کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے وقت میں تنگی محسوس ہونے لگی، یہ وقت مزید مستعدی اور کام میں تیز رفتاری کا مطالبہ کرنے لگا۔ پروف ریڈنگ کا کام بہت ذمہ داری اور لیاقت و توجہ کا ہوتا ہے۔ عزیزی ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی، ڈاکٹر محمد علی جوہر، ڈاکٹر راشد انور راشد، ڈاکٹر علی عمران عثمانی اور میرے ریسرچ اسکالر عزیزی محمد شہاب الدین نے بڑی تندہی اور مستعدی سے پروف ریڈنگ میں میری معاونت فرمائی، اور ہر وقت اپنی خدمات کی مزید پیش کش کا اطمینان دلاتے رہے۔ البتہ مؤخر الذکر دونوں اصحاب یعنی علی عمران عثمانی اور شہاب الدین نے تو متواتر کئی دن تک لگ کر دن و رات میرے ساتھ تعاون کیا، اس کے علاوہ جن حضرات نے بھی، جس مقدار میں اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں مدد کی، میں درجہ بہ درجہ ان سبھی حضرات کا شکر گذار ہوں۔

سیّد محمد ہاشم

پروفیسر شعبۂ اُردو،

(مرتّب)

و

وکوآرڈی نیٹر مذاکرہ

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

مذکورہ بالا عنوان میں جو استفسار مضمر ہے، اس کا ایک بین اور صریحی جواب تو یہ ہے کہ ادب کا پڑھنا مہذب انسان کی فطری جبلّت کا تقاضا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اوّلین دور کے انسان کی یہ دلچسپی جب کہ ادب کو تحریر اور اشاعت سے شناسائی نہیں ہوئی تھی، اس وجہ سے تھی کہ ادیب ہماری روز مرّہ کی کائنات کے متوازی اور پہلو بہ پہلو ایک اور کائنات تخلیق کرتا ہے، اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ ذرا ہم اس کائنات کی بھی سیر کریں، اور اس میں داخل ہو کر اس سے لطف اندوز ہوں۔ جب ہم باقاعدہ ادب کا ذکر کرتے ہیں تو لامحالہ ہمارا واسطہ لفظ سے پڑتا ہے۔ لفظ یا زبان کے دو اطراف ہیں۔ جنھیں ہم مفہوم یعنی SENSE اور آواز یعنی SOUND کے نام سے پکارتے ہیں۔ زبان جب تاریخی یا سائنسی مواد کے ابلاغ کے لیے استعمال کی جاتی ہے، تو وہ زیادہ تر اشاراتی یعنی REFRENTIAL رہتی ہے، یعنی DENOTATIVE واسطے کا کام کرتی ہے، اور ادب میں ہم الفاظ کے CONNOTATION سے سروکار رکھتے ہیں۔ یعنی اس کے مفاہیم کثیر الجہت یا MANIFOLD ہوتے ہیں۔ یہاں زبان اکہرے مفہوم کی حامل نہیں ہوتی۔ زبان کو لامحدود توانائیوں یعنی POTENCIES کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ توانائیاں ایک سے زیادہ مفہوم کو محیط ہوتی ہیں۔ ادب پڑھنے کا ایک محرک تو یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک نئی دنیا میں سانس لینا اور وقتی طور سے زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور روز مرّہ کی فرسودہ زندگی کو بھلا دینا چاہتے ہیں، اور دوسرے ہم دانستہ یا نادانستہ طور پر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم

خود اشیا یا افراد کا جو ادراک یعنی PERCEPTION رکھتے ہیں، اس کی ادب اور ادیب کے واسطے سے کس طرح تصدیق، توسیع اور تکرار ہوتی ہے۔ غیر شعوری طور پر ان توسیع شدہ یعنی ENLARGED مدرکات یعنی PERCEPTION سے دوچار ہونے پر ہم ایک طرح کی مسرّت یا حظ حاصل کرتے ہیں۔ آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ یہ سب ایک طرح کی تعمیمہ سازی ہے۔ عام انسان تو بس کوئی نظم، افسانہ یا ناول اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے، جو اس کی دسترس میں ہو۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ عام قاری پہلے سے مقدماتِ کبریٰ و صغریٰ قائم نہیں کرتا۔ اس کا عمل تو جبلّی اور غیر شعوری ہوتا ہے، یہاں ہم یہ اضافہ کرنا چاہیں گے کہ تخلیقی فن کار ایک سحر کارانہ FICTIONAL کائنات تعمیر کرنے میں لگا رہتا ہے، جس میں ہم دیر تک رہنا چاہتے ہیں۔ روزمرّہ کی زندگی سے گریز کرنا اور افسانوی دنیا کی کشش سے مسحور ہونا ایک فطری عمل ہے، لیکن معاملہ صرف اس پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس افسانوی دنیا کی قدر و قیمت کو کون سی شے متعیّن کرتی ہے۔ کیا ہم ادب کو محض تلذذ کی خاطر پڑھتے ہیں، یا کسی نئی بصیرت حاصل کرنے کی جستجو ہم کو اس کام پر اُکساتی ہے، کیا ہم کسی پیغام کی اشاعت کی خاطر یا کسی اخلاقی درس دینے کی غرض سے اسے پڑھنے والے کے ذہن میں اُتارنا چاہتے ہیں؟ ایسے بہت سے سوالات ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ مشہور امریکی نقاد MACLEISH نے کہا تھا:

"A POEM MUST NOT MEAN, BUT BE."

یہ ایک جزوی صداقت کا بیان ہے۔ یہ مکمل صداقت نہیں ہے، اس کی تغلیط اقبال کے اس شعر میں دیکھیے:

ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنے خاکستر میں ہے

بلاشبہ تخلیقی ادب پارے میں جمالیاتی قدریں اور جمالیاتی ڈھانچہ بڑی قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے غالب کی شاعری میں جمالیاتی کُل یعنی AESTHETIC

WHOLES، لیکن راقم الحروف محض جمالیاتی قدروں کے ذکر اور ان کے انعکاس سے تشفی محسوس نہیں کرتا۔ حسن، خیر اور یقین کے ڈانڈے آپ میں مدغم ہیں۔ برطانوی شاعر کیٹس نے حسن اور خیر کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ علم الیقین کو بھی شامل کر لیجیے، تو شاید بات مکمل ہو جائے۔ اگر علم الیقین کی اصطلاح ذہن پر بار محسوس ہو تو اس کی جگہ VISION یا بصیرت رکھ دیجیے، جہاں تک پہنچنے کو تخلیقی فن کار کا ہدف قرار دیا جاسکتا ہے۔

آگے پیش قدمی سے پہلے اور غور و تامل کا مرکز بنانے کے لیے ضرب کلیم میں شامل شدہ 'صوفی سے' کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے:

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

دراصل تخلیقی فن کار کا عمل تین منزلوں سے گزرتا ہے، اوّل حادثات یعنی DAILY OCCURRENCES کی دنیا۔ دوسرے حیات و ممات کی دنیا، جو SPACE BOUND ہے۔ اور تیسرے ممکنات کی دنیا یعنی THE WORLD OF POSSIBLE۔ پہلا منطقہ یا ZONE حادثات کی دنیا کا ہے، اور آخری مرحلہ ممکنات کی دنیا جسے جرمن فلسفی کانٹ نے THING IN ITSELF کا نام دیا ہے۔ آپ اس سے ہرگز چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ اب ایک نظر ذرا اس عنصر کی طرف بھی لے جایئے جسے شروع ہی میں SOUND کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، آواز کی طرف کشش بھی ایک طبعی جبلت ہے۔ قرون وسطی سے قبل انگریزی ادب کے بالکل ہی ابتدائی دور میں ہمیں وہ گیت ملتے ہیں، جنھیں ENGLISH AND SCOTTISH

BALLADS کا نام دیا گیا ہے، جن کا خالق وہ MINSTREL ہوتا تھا، جو ایک پوری جماعت کی سربراہی کرتا تھا، اور دراصل وہ سب مل کر ان BALLADS کی تخلیق کے ذمے دار ہوتے تھے۔ یعنی تخلیق کا عمل انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتا تھا۔ غالباً یہی صورت ان عوامی گیتوں کی بھی ہوگی، جو ابتدائی دور میں اُردو اور ہندی زبانوں میں مروج رہے ہوں گے۔ انگلستان میں چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد ہی ان BALLADS کی موجودہ شکل وجود میں آئی ہوگی۔ ان کے خالق تمام تر گم نام یعنی ANONYMOUS ہی رہے اور ہیں۔ یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کیوں کہ ہمارا دل غیر شعوری طور پر آوازوں کی طرف کھنچتا ہے۔ آہنگ اور ترنم معمولی سطحوں پر ان شکلوں میں موجود ہیں۔ اب ان کی ایک وابستہ یعنی COGNATE شکل پہ بھی غور کیجیے۔ نبی کریمؐ کی بعثت سے لے کر آج تک قرآن کریم کی تلاوت کھربوں لوگوں نے کی ہوگی، اور آج تک کر رہے ہیں۔ اس عمل میں سورۃ رحمٰن کی تلاوت بھی لازمی طور پر شامل ہے، کم لوگ اس کے الفاظ کے مفہوم سے براہِ راست واقف ہوں گے۔ لیکن سورۃ رحمٰن میں تکرار، ترنم اور آہنگ کا جادو پڑھنے والے کی روح کے اردگرد ایسا جال بن دیتا ہے، جس سے نکلنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ الفاظ کا یہ سحر آفریں ترنم اعلیٰ ترین سطح پر جس طرح ہمارے حواس کو متاثر کرتا ہے، اس کی تعبیر بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ اضافہ کرنا غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ قرآن کریم کی زبان نہ نثر ہے اور نہ شاعری، بلکہ دونوں اسالیب کا ایسا امتزاج ہے جو دونوں سے تجاوز اور ماورا ہے۔ اس ضمن میں یہ سمجھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی زبان پر زبانوں کے ارتقا کا کوئی قانون چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الفاظ کی ادائیگی کی اعلیٰ ترین سطح اور منزہ ترین شکل ہے، جس کی VALIDITY آج تک قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ یہ محض لفظ یعنی WORD کی تقدیس کا آئینہ نہیں ہے، بلکہ REVEXLED WORD کی کرشمہ سازی ہے جس سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اس کے ورد سے وہ GRACE وجود میں آتا ہے جو روح کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ ●

جناب جوگیندر پال

دوستو اور عزیزو!

سب سے پہلے میں صدر شعبۂ اُردو قاضی افضال صاحب کا شکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے یہاں بلایا۔ لیکن میں یہاں آ کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں، خاص طور سے اس مجلس میں جہاں ادب کے بڑے بڑے علماء اور دانشور جمع ہیں۔ اور ایک اچھے موضوع پر گفتگو ہونا ہے۔

ادب کیوں، کیسے اور کیا، یہ سوال اب اپنی اہمیت کھو چکا ہے، اس لیے کہ ادب ایک حقیقی اور زندہ و پائندہ چیز ہے، یہ ایک متوازی زندگی ہے۔ یہ ''متوازی زندگی'' اپنا معنی آپ ہے۔

ادب وہ ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ برائے نام لکھنے اور پڑھنے کے لیے ہے۔ اصل ادب تو وہ ہے کہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں وہ واقعتہً ہوتا ہوا نظر آئے۔ زندگی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، ادب بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ زندگی کے وہی مفاہیم ہیں جو آپ اخذ کر لیں۔ غالب کی اتنی شرحیں لکھی گئیں، کیوں؟ اسی لیے تو کہ ہر ایک نے اپنی توفیق کے مطابق غالب کو پڑھا اور ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ اس کی تفہیم سب سے زیادہ درست ہے۔ ظاہر ہے غالب نے جو کچھ بھی لکھا........وہ اپنی ذہنی سطح سے لکھا، ہم اسے اپنی ذہنی سطح سے پڑھتے ہیں، اور مطلب نکالتے ہیں۔

جس طرح لکھنے والا فن کار ہوتا ہے، اسی طرح پڑھنے والا بھی فن کار ہوتا ہے۔ ایک آدمی لکھ کر اپنے مفاہیم اخذ کر رہا ہے، دوسرا پڑھ پڑھ کر اپنے مفاہیم اخذ

کر رہا ہے۔ اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ کوئی کتاب کاغذ کے صفحات پر ختم نہیں ہوتی، وہ قاری کے ذہن میں ختم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے لکھنے والے کے سامنے جو مفاہیم ہوں، پڑھنے والے کے سامنے وہ مفاہیم کچھ اور شکل اختیار کرلیں۔ کلامِ غالب میں آج سیکڑوں مفاہیم شامل ہوچکے ہیں۔ اسی طرح شیکسپیئر وہ نہیں ہے، جو اُس وقت تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ راتوں رات بڑے ادیب بن جائیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ بڑا ادیب بڑی ریاضت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ آج شیکسپیئر نہیں ہے، لیکن اس کا ادب موجود ہے۔ اس نے احساس اور فکر کی جو خوب صورتی ہمیں عطا کی ہے، وہ ہمارے اندر تحریک پیدا کر رہی ہے۔

ادب اپنے آپ کو سونپنے کا نام ہے۔ جب آپ اپنے آپ کو لٹانے پر اصرار کرنے لگیں۔ جب یہ جذبہ پیدا ہوجائے، تب خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ ادب دراصل غموں کی رفاقت کا ایک ذریعہ ہے۔ سب کا غم میرا غم ہے، ہر ایک کا دکھ میرا دکھ ہے، جب آپ کے اندر جذبہ پیدا ہوگا تو بہت خوب صورت لگیں گے۔ جب کوئی بہت اچھی کہانی آپ کو سوجھتی ہے تو درس دینے کے لیے نہیں لکھتے، سبق تو قاری خود اخذ کرتا ہے۔

کوئی بہت اچھی کہانی یا نظم جب آپ پر اترتی ہے تو وہ آپ کو پرے کر دیتی ہے۔ (اس سلسلے میں اپنی کہانیوں اور ان کے کرداروں سے متعلق جوگندر پال صاحب نے کئی واقعات بھی سُنائے۔) ادب لکھنے کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے ساری دنیا کو جی لیا۔ یعنی اگر میں آپ کو پیش کر رہا ہوں تو میرا فرض یہ ہے کہ میں ''آپ'' بن جاؤں۔ آپ کا سارا دکھ اپنے اندر اس طرح جذب کرلوں کہ آپ میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رہے۔ اس طرح لکھنے والے کا انعام یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کھو کر ساری دنیا کو جی لیتا ہے۔

اچھی کتاب کے اسرار آپ پر اس طرح کھلتے ہیں کہ آپ سوچنے لگتے ہیں کہ اچھا یہ ساری چیزیں ایسی ہیں!

ادب میں ہم اپنی وارداتوں کو بیان کرتے ہیں۔ تجربہ کرنا بُری بات نہیں ہے، لیکن ہر تجربے کو واردات کے مطابق ہونا چاہیے۔ آپ ہر ایک کے چہرے کو دیکھیے، ہر چہرہ الگ الگ ہے۔ فن کار کی ہر کہانی کو بھی الگ الگ ہونا چاہیے۔ ہر کردار کو الگ الگ ہونا چاہیے۔ میں اپنے کرداروں کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا رہتا ہوں۔ دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں کہ بے چارہ اکیلا بیٹھا ہے۔ لیکن میں اکیلا نہیں ہوتا، بھیڑ بھاڑ کا عالم ہوتا ہے۔ میں اپنی نوجوان نسل سے یہی کہنا چاہوں گا کہ ابھی تمھیں بہت سے عمدہ کام کرنے ہیں۔ ہر آنے والی نسل، پچھلی نسل سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔ یہی زمانے کا دستور ہے۔ اس لیے میرے دوستو! تمھیں بھی بڑے ہو کر بہت خوب صورت ہونا ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں! شکریہ!

●

پروفیسر کے۔ایم مشرا

حضرات! میں شکر گذار ہوں صدر شعبہ پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب کا اور مذاکرہ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر ہاشم صاحب کا، جنھوں نے اتنے اچھے اور میری پسند کے موضوع پر مجھے اظہارِ خیال کا موقع دیا۔کل سے فیکلٹی میں امتحان شروع ہیں اس لیے مختصر وقت میں چند باتیں عرض کروں گا۔

میں ادب کیوں پڑھتا ہوں ۔اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اپنے لیے پڑھتا ہوں اور اپنے مزے کے لیے پڑھتا ہوں ۔ یہ ادب ہی ہے جو ہمیں سیمناروں اور مذاکروں کے لیے روایت سے ہٹ کر نئے نئے موضوعات سجھاتا ہے۔

ناول پڑھنا میرا سب سے محبوب شوق ہے۔ میں نے سب سے پہلا ناول جو پڑھا، وہ آسکر وائلڈ کے انگریزی ناول کا ہندی ترجمہ تھا، ''چھایا'' کے عنوان سے۔ میں نے یہ ناول اپنے اسکول کی لائبریری سے لے کر پڑھا تھا۔اسکول ہی میں ''ہندی تنقید'' سے میں پہلی بار متعارف ہوا۔ ہندی کے مشہور شاعر جے شنکر پرساد پر مجھے مضمون لکھ کر اپنے استاد کو دکھانا تھا، اس کے لیے میں نے اپنی لائبریری سے پرساد کی شاعری اور فن کاری پر ایک کتاب نکالی، اسے گھر لا کر پڑھا اور مضمون لکھ کر اپنے استاد کو دکھایا۔ انعام میں مجھے دو الفاظ ملے ــــــ ''ویری گڈ''! یہ اسی ''ویری گڈ'' کا کمال ہے کہ میں

آج بھی ہندی سیکھ رہا ہوں اور پڑھ رہا ہوں۔ (موصوف شعبۂ ہندی کے سینئر پروفیسر ہیں صدر شعبہ اور ڈین بھی رہ چکے ہیں۔)

ناول پڑھنے کا سلسلہ جو ''چھایا'' سے شروع ہوا تھا، آج بھی جاری ہے۔ کچھ کم ضرور ہو گیا ہے، لیکن ختم نہیں ہوا۔ پھر تو ادب کا ایسا شوق ہوا کہ بی کام میں داخلہ کا ارادہ ترک کر کے بی۔ اے میں داخل ہو گیا۔

بی۔ اے کے دوران میں نے بے شمار ناول پڑھے۔ گھر سے ذرا فاصلے پر پبلک لائبریری تھی، اسے کھنگال ڈالا۔ ہندی کے سارے اچھے ادیبوں کی تحریروں کو پڑھ ڈالا۔ اسی زمانے میں پریم چند کو پڑھا۔ مانسرووَر کے سارے کھنڈ پڑھ ڈالے۔ ناول پڑھنے سے فرصت ملتی تو سائیکلوجی کی کتابیں اُٹھا لیتا۔

سوال یہ ہے کہ اس مطالعے سے ہمیں کیا ملا؟ بہت طاقت ملی۔ سکھ دکھ کس آدمی کی زندگی میں نہیں آتے۔ دکھوں سے لڑنے کی طاقت ہمیں ادب سے ہی ملی ہے۔ زندگی کی مشکلات سے اگر کوئی آپ کو نجات دلاتا ہے تو وہ 'لفظ' اور ادب ہی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ وہ ''تم'' ہے جو ہمیں بڑی سے بڑی مصیبت سے، بڑے سے بڑے تناؤ سے نکالتا ہے، اور یہ ''تم'' سب کا الگ الگ ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر ایک کے مسائل اور ان کے حل الگ الگ ہیں۔

ادب نہ بھی پڑھیں تو دنیا کچھ دنوں تک چلتی رہے گی، لیکن دنیا کو مصائب سے باہر نکالنے کے لیے، مستقبل کے ویژن کے لیے ادیبوں اور شاعروں کے کلام کی ضرورت ہے۔ جو لوگ رات دن چودہ چودہ گھنٹے بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں میں کام کرتے ہیں، انھیں کسی بڑے شاعر کا ایک شعر کتنی طاقت دے سکتا ہے، یہ بات وہی آدمی جان سکتا ہے جس نے شعر کا مزا چکھا ہے۔

کسی کو زبردستی ادب نہیں پڑھایا جا سکتا۔ نہ زبردستی کسی ادیب سے کچھ لکھوایا جا سکتا ہے۔ یہ تو ہماری اندرونی خواہش ہے، جو ہم سے ادب لکھواتی ہے، ادب پڑھواتی ہے در اصل ادب اہل ذوق کی زندگی کا ایک حصہ، ایک پہچان ہے، جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ یہ ایک پیاس ہے۔ ادب کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جاتا ہے آدمی اتنا ہی ادب میں ڈوبتا جاتا ہے اور جو ادب میں ڈوب جاتا ہے ادب وہ چیز ہے کہ پھر اس میں سے نکلتا نہیں۔ بہت بہت شکریہ!

●

پروفیسر شمیم حنفی

(۱)

یہ سوال کہ میں ادب کیوں پڑھتا ہوں، میرے لیے اتنا ہی ذاتی ہے جتنا یہ کہ میں نے محبت کیوں کی یا یہ کہ مجھے نیلا آسمانی رنگ کیوں پسند ہے۔ اس موضوع پر گفتگو میں کسی طرح کی بقراطیت یا مصنوعی پندار کا انداز اختیار کر کے میں اپنی (اور شاید دوسروں کی) نظروں میں خود کو تماشا نہیں بنانا چاہتا۔ پتہ نہیں، یہ خیال دماغ میں کب آیا، کہ شاعری انسان کی مادری زبان ہے اور میرے لیے ادب کی مبادیات سے شناسائی کا پہلا زینہ ہے۔ لوریاں تخلیقی لفظ سے تعارف کا پہلا ذریعہ بنی تھیں۔ پھر وہ وقت آیا جب میں نے یہ سوچنا ضرور شروع کر دیا تھا کہ جینے کی طرح مرنا بھی ایک انسانی ضرورت ہے اور ایک مجبوری بھی ہے اور اس مسئلے کے رمز میری سمجھ میں صرف شعروادب کے واسطے سے آتے ہیں۔ شاید اسی طرح آ بھی سکتے ہیں۔ انسانی تجربوں، خیالوں، سوالوں کو سب سے زیادہ مکمل، ہمہ جہت اور ہمہ گیر زبان ادب نے ہی دی ہے۔ تخلیقی لفظ کی رسائی زمین و آسمان کے تمام علاقوں تک ہے، علوم مادّی دنیا اور تاریخ کے حصار سے آگے نہیں جاتے۔ اتفاق سے میری رہائش تاریخ کے مضافات میں ہے۔ باہر کی دنیا میں انسانی کامرانیوں کا اور ارتقا کا جو عجیب و غریب رنگ جما ہوا ہے، جو حشر بپا ہے اور مختلف علوم کی مدد سے انسانی شعور جن دشوار مرحلوں سے گذر رہا ہے، وہ سب کچھ بہت پرکشش، بہت طاقت ور، بہت دلچسپ ہونے کے بعد بھی میرے احساسات کی دنیا میں میرے لیے مانوس اور قابل فہم نہیں تھا۔ جس دریا سے

مصنّف کا عنوان ''اپنی تلاش میں''

پیاس نہ بجھائی جا سکے اس میں پانی ہو یا صرف ریت، اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ کارل مارکس نے مجھے ایک طرف جہاں اپنی دنیا کے بہت سے معاملات کو سمجھنا سکھایا وہیں یہ بھی بتایا کہ ہر وہ شے جو ٹھوس اور مادّی ہوتی ہے بالآخر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ خیال اور مادّے کے تعلق کا وظیفہ پڑھتے وقت یہ چھوٹی سی بات بھی یاد رکھنی چاہیے۔

میرے ایک دوست (زاہد ڈار) ادب جن کا اوڑھنا بچھونا ہے، ان کا کہنا ہے کہ کتاب انھیں تنہائی کے آشوب سے بچائے رکھتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ انھیں تنہا رہنے کا موقع بھی دیتی ہے۔ میرا مسئلہ بھی شاید تنہائی سے زیادہ تنہائی کی تلاش کا ہے۔ ادب ہمیں تنہا بھی رکھتا ہے اور تنہائی کی آزمائشوں سے ہمیں محفوظ بھی رکھتا ہے۔ آج کی دنیا میں، خاموشی کی طرح، تنہائی کی حیثیت ایک اخلاقی قدر کی بھی ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے گرد و پیش کے بیشتر سوالوں کا جواب نہ ہو جو مطلقیت کے کسی تصور سے مناسبت نہ رکھتا ہو، جو آرٹ اور ادب کو کیریئر نہ سمجھتا ہو، جس کے نزدیک ہر انسانی عمل کے مفہوم کا تعین اس کی اخلاقی قدر کا تابع ہو، جسے اکیلے پن سے گھبراہٹ نہ ہوتی ہو اور جو بھیڑ بھاڑ سے الجھتا ہو، اس کے لیے اپنے بچاؤ کا ایک راستہ ادب سے ہو کر بھی نکلتا ہے۔ بے شک اور بھی راستے ہوں گے جدھر دھیان نہیں گیا اور جن کا تجربہ میرے حصے میں نہیں آیا۔ انسانی علوم اور ادب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ ہم کو کسی اور کے سُر میں سُر ملانے کی ترغیب نہیں دیتے۔ ہماری تنہائی، ہماری خاموشی اور ہماری آزادروی کا احترام کرتے ہیں۔ یہ تو ہماری فکری معذوریوں اور نارسائیوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں، ایک اچھے دوست کی طرح۔

انسانی ادراک کا کوئی بھی شعبہ تاریخ کے بندھن سے آزاد نہیں ہے۔ ہر علمی اور فکری روایت اپنے ماضی یا تاریخ کے ملبے پر اپنی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ اس سے توانائی اخذ کرتی ہے۔ اس کے آزمودہ وسیلوں کو اپنا زادِ سفر بناتی ہے۔ لیکن تخلیقی عمل اور ادبی سرگرمی کے راستے میں، تاریخ کبھی کبھی رکاوٹ بھی بن جاتی ہے اور کوئی بڑا ادبی یا تخلیقی کارنامہ انجام دینے کے لیے، بہ قول نطشہ، بعض اوقات تاریخ کو بھولنا ناگزیر

ہو جاتا ہے۔ میں نے ہر ادب پارے کو، وہ چاہے جتنا پرانا ہو، ہمیشہ تلاش اور تجسس کی ایک دائم و قائم کیفیت کے ساتھ پڑھا ہے خیال پرانا ہو سکتا ہے، مسترد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر تخلیقی تجربہ میرے احساسات پر ہمیشہ ایک نئے تجربے کی طرح وارد ہوتا ہے اور میرے لیے ایک نئے شہر طلسمات کا دروازہ کھولتا ہے۔ شاید اسی لیے، میں ادب کے سیاق میں جب بھی عمر گذشتہ کا حساب کرتا ہوں، میرا سب سے بڑا ذاتی سہارا اور زندگی کی ہر مہم میں اعتبار کا سب سے بڑا ذریعہ وہ روشنی بنتی ہے جو مجھے اضمحلال اور افسردگی کے انتہائی شدید اور بے بس کر دینے والے لمحوں میں بھی، شعر کی کسی کتاب، کسی ناول، کسی ڈرامے یا کسی کہانی کے واسطے سے مجھ تک پہنچی۔

(۲)

میں نے ہر طرح کی چہل پہل سے خالی جس ماحول میں ہوش کی آنکھیں کھولیں، اور زندگی کے پہلے پندرہ برس جس اونگھتی ہوئی، ایک حد تک بے آواز بستی میں گزارے، وہ چھوٹے سے بڑے ہونے کے لیے شاید زیادہ مناسب جگہ نہیں تھی۔ وہاں درسی کتابوں کے سوا، اچھی اور شوقیہ پڑھی جانے والی کتابوں کی کوئی دوکان نہیں تھی۔ ہمارے گھر سے تھوڑی دور پر ایک لائبریری ضرور تھی۔ وہ جگہ جہاں لائبریری کی عمارت واقع تھی گومتی ندی کے کنارے اور پُرانے بے لگام درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے بہت سنسان اور بھیدوں بھری دکھائی دیتی تھی۔ لائبریری کی عمارت اپنے اونچے ستونوں، مہیب دروازوں اور وکٹورین وضع کے باعث ہمیشہ پراسرار دکھائی دیتی تھی۔ ان دنوں شہر میں بھی بجلی نہیں آئی تھی۔ شام ڈھلنے کے بعد ادھر اکیلے جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یوں بھی نیم، پیپل اور برگد کے کئی درختوں کے بارے میں کچھ عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں اور اُدھر سے جب بھی جانا ہوتا تھا مجھے انوکھی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور آس پاس سے پرچھائیوں کے گزرنے کا گمان ہوتا تھا۔

میں نے ان دنوں یا تو وہ رسالے اور کتابیں دیکھیں جو میرے والدین پڑھا کرتے تھے اور جن میں اکثریت اُس دور کے مشہور ادبی رسالوں اور ناول یا افسانے

کی کتابوں کی تھی۔ یا پھر وہ کتابیں جو شہر کی اس اکیلی لائبریری سے منگوائی جاتی تھیں اور جن کے موضوعات ادب کے علاوہ اکثر تاریخی یا سیاسی ہوا کرتے تھے۔ گھر میں مجھے کسی طرح کی مذہبی تعلیم کبھی نہیں دی گئی۔ اس سلسلے میں، میں نے جو کچھ بھی پڑھا۔ اپنے شوق اور تجسس کی وجہ سے پڑھا۔

میرے والد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرانے لا گریجویٹ تھے، سر راس مسعود کی وائس چانسلری (۱۹۳۴ء) کے دور کے۔ بی۔اے میں ان کا ایک اختیاری مضمون انگریزی ادب بھی تھا۔ اس لیے گھر میں شیکسپیئر کے ڈراموں اور ہارڈی کے ناولوں کا ایک سیٹ بھی موجود تھا۔ میں نے ان میں سے کچھ کتابیں اسکول کے مروجہ نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے اور کچھ اپنے والد کی تحریک پر، ان کی مدد سے پڑھیں۔ ٹیگور، چارلس ڈکنس، تھیکرے اور اسٹیونس کی تحریروں سے میرے تعارف کا ذریعہ بھی وہی بنے۔ یہ ایک طرح کی انسان دوستانہ اور سیکولر تعلیم تھی۔ اس وقت تک زبان اور ادب ادیبوں کے اخلاقی انحطاط اور دنیاداری یا نظریاتی دہشت گردی کے فروغ کا ذریعہ نہیں بنے تھے۔ نہ ہی مطبوعہ لفظ کا آج کے جیسا سیلاب آیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہمارے زمانے میں کتاب لکھنا تجارت کا حصہ ہے اور ہم کیا پڑھیں، اس کا فیصلہ اب اشتہار بازی کی نذر ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو مارکیٹ اکونومی نے ادب کو بھی جنس بازار یا پروڈکٹ بنا دیا ہے۔

پھر یہ بھی تھا کہ مطبوعہ لفظ اور مطالعے کے ساتھ ساتھ ہم سماعت یا اپنے کانوں کے وسیلے سے بھی تخلیقی لفظ کا کچھ اتا پتا پاتے رہتے تھے۔ دسہرے اور محرم کے دنوں میں بھجن کیرتن، اکھنڈ پاٹھ اور نوحہ خوانی، مرثیہ خوانی کی روایت جاگ پڑتی تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں آلھا گانے والوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ اور تو اور سادھو سنت، فقیر بھی کبیر، تلسی کے دوہے، بھجن نعتیں مناجاتیں گاتے پھرتے تھے۔ ہمارے آبائی مکان سے ملے ہوئے احاطے میں کچھ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں میرے والد کے دور پاس کے دیہاتوں سے آنے والے موکل اپنے مقدمے کی پیشی پڑنے پر اکثر رات کو

ٹھہرا کرتے تھے اور دن بھر کے کام کاج سے اور اپنے کھان پان سے فارغ ہونے کے بعد کبھی اکیلے، کبھی باجماعت طریقے سے رام چرت مانس کا پاٹھ کرتے تھے۔ ہماری بستی ایودھیا سے کوئی تیس میل کی دوری پر واقع تھی اور اس پورے علاقے میں یہ چلن عام تھا۔ سو، میں اپنی نوعمری کے دور میں، آنکھوں کے علاوہ اپنی سماعت کے ذریعے بھی بہت کچھ پڑھتا رہا۔

سُنے جانے والے لفظ کا ایک الگ جادو ہوتا ہے۔ اپنی لوک روایت سے دل چسپی اور میری تھوڑی بہت آگہی کا وسیلہ یہ ''سننا سنانا'' بھی رہا ہے۔ ہمارا معاشرہ ایک انتہائی رنگا رنگ اور مستحکم حکائی روایت سے مالا مال معاشرہ رہا ہے۔ اپنی حکائی روایت کے دائرے میں آنے والے ادب کا خاصا بڑا حصہ گیتوں، کہانیوں، حکایتوں، قصوں، ملفوظات، پروچن کی شکل میں، میں نے پڑھنے کے ساتھ ساتھ سنا بھی ہے۔

ہماری آبائی بستی میں ایک مشہور ہندی کوی رہا کرتے تھے، پنڈت رام نریش ترپاٹھی۔ اپنے اسکول کی طرف آتے جاتے میں ان کے گھر سے ہو کر گزرتا تھا۔ میرے والد سے ان کی ملاقات تھی۔ انہی دنوں میں نے سنا تھا کہ گاندھی جی کی ہدایت پر وہ ہمارے دیس کے مختلف علاقوں کے لوک گیت جمع کر رہے ہیں۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے علاوہ اردو کہانی کار دیوندر ستیارتھی بھی اس کام میں شریک رہے۔ دلی آنے کے بعد ستیارتھی جی سے میری بہت ملاقاتیں رہیں۔ ترپاٹھی جی اور ستیارتھی جی کی زندگی کا ایک پہلو جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، گیتوں کی تلاش میں ان کی آوارہ گردی ہے۔ ستیارتھی جی کو تو میں نے اسّی برس کی عمر میں بھی دلّی کی سڑکوں پر ہمیشہ پیدل چلتے ہی دیکھا۔

یہ جو ادب میں بھی کافی ہاؤس کلچر یا ڈرائنگ روم کلچر قسم کا رویہ عام ہوا ہے، میری طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب صرف پڑھنے کی چیز نہیں ہے اور ادب کو سمجھنے، اس پر اثر انداز ہونے یا اس کا اثر قبول کرنے کا ذریعہ صرف کتابیں

نہیں ہوسکتیں۔ زندگی کی طرح ادب کے مرکز میں بھی ایک ہی سچائی براجمان ہے، اور وہ سچائی ہے ''انسان'' جو صرف کتابوں میں بند نہیں ہوتا اور جسے سمجھنے کے لیے زندگی سے کٹ کر صرف کتابوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ دیوتاؤں کے بہت سے روپ ہو سکتے ہیں اور ان کے اپنے اپنے مشغلے اور علاقے ہیں، مگر انسان کا تو ایک ہی روپ ہے، اچھا ہو یا برا، سب ایک جیسے ہیں۔ بہ قول نظیر ''سو ہے وہ بھی آدمی!''

لیکن زندگی کو جاننے اور برتنے کے سلسلے میں ضروری نہیں کہ ہم زندگی کے ہر پیچ، ہر معاملے، ہر مسئلے سے براہ راست تعلق بھی رکھتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اگر تم زندگی کو جاننا سمجھنا چاہتے ہو تو زندگی تمھارے دروازے پر دستک دیتی ہوئی تم تک خود بخود پہنچ جائے گی۔ گویا کہ یہ سارا معاملہ رویّے کا ہے، عمل کا نہیں۔ میری حالت گنچاروف کے اوبلاموف جیسی تو نہیں تھی اور میں گھر سے باہر کی دنیا کو بھی ہمیشہ پر شوق نظروں سے دیکھتا اور میں مردم بیزار نہیں تھا۔ لیکن میری زندگی میں کچھ کتابوں نے اس لحاظ سے غیر معمولی رول ادا کیا ہے کہ دنیا کے عام معاملات سے میرے شعوری فاصلے، میری تنہائی اور خلوت گزینی، اور بزم آرائی یا جلسے جلوس سے بیزاری یا گریز نے جو خامیاں پیدا کر دی تھیں، انھیں ایک حد تک قابو میں رکھنے کا تھوڑا بہت گُر جو میں نے سیکھا تو ادب کی بعض کتابوں کی رفاقت اور ان کی بخشی ہوئی روشنی کے نتیجے میں اس لحاظ سے کتاب یا مطبوعہ لفظ کا بدل ہماری دنیا نے ابھی تک تو پیدا نہیں کیا ہے۔ بہ قول سوسن سونٹیگ، جس طرح فلم اور ٹیلی وژن تھیٹر کی جگہ نہیں لے سکتے، اسی طرح بصیرت، علم اور اطلاعات کی فراہمی کا کوئی وسیلہ کتاب کی برابری نہیں کر سکتا۔ ایک چھوٹی سی قدرے بے رنگ بلکہ اکتاہٹ کا مستقل احساس پیدا کرنے والی بستی اور ایک مختصر سے خاندان میں پندرہ سولہ برس کی عمر تک کتابوں نے دوستی اور ہم دمی کا جو تجربہ مہیا کیا، اسے میں زندگی بھر تشکر اور احسان مندی کے جذبے کے ساتھ یاد رکھوں گا۔ گھر میں یا گھر سے باہر کی دنیا میں میرے لیے وقت گزاری اور تفریح کے سادھن بہت محدود تھے، میری صحت بہت معمولی تھی بلکہ خراب تھی اور کھیل کود کی طرف ایک تو اپنی جسمانی

کمزوری کے باعث، دوسرے اپنے پیدائشی شرمیلے پن کے باعث طبیعت کبھی مائل نہ ہوتی تھی۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے مجھے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ یہاں مجھ پر ایک نئی دنیا سے جان پہچان کے راستے کھلے۔ گھر کے بند بند سے، گھٹے ہوئے ماحول کی بہ نسبت اس شہر کے ماحول میں مجھے آزادی اور پھیلاؤ کا ایک نیا احساس ہوا۔ ہر بستی اپنا ایک مخصوص لینڈ اسکیپ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایک خاص آہنگ بھی رکھتی ہے جو گھروں، بازاروں، راستوں گلیوں سے اٹھنے والی آوازوں سے ترتیب پاتا ہے۔ ہماری بستی میں ہمیشہ ایک سناٹے کا احساس ہوتا تھا۔ گومتی ندی کا پانی، سوائے باڑھ کے دنوں کے، کبھی پر شور نہیں ہوتا تھا۔ نیم، پیپل اور برگد کے پیڑ جو بستی کی ہر سڑک پر جگہ جگہ سر اٹھائے کھڑے تھے، ہوا کے ساتھ ان کی ایک عجیب موہوم اور مبہم سی آواز رہ رہ کر سنائی دیتی تھی۔ سوائے ان دنوں کے جب بستی میں کسی تہوار یا میلے کی دھوم ہو، بازار تک سوئے سوئے سے لگتے تھے۔ لوگوں کی بات چیت، چال ڈھال، رہن سہن میں ایک طرح کی سستی اور دھیماپن نمایاں تھا۔ شہر میں بجلی نہیں آئی تھی اس لیے سورج ڈوبتے ہی بستی کی سرحدوں سے سیاروں کی ہواں ہواں اور ایک بڑھتے پھیلتے سناٹے کی گونج اندھیرے کے سکوت پر حاوی ہو جاتی تھی۔

لیکن الہ آباد میرے لیے روشن، صاف اور کھلی ڈلی آوازوں کی ایک دل کو کھینچنے والی جادونگری تھی۔ ہر طرف نت نئے رنگ، رونقیں اور دل بستگی کے سامان بکھرے ہوئے تھے۔ ان دنوں الہ آباد ثقافتی اور فکری لحاظ سے تھکا ہوا شہر نہیں تھا۔ اُردو والوں میں وہاں فراق صاحب، اعجاز صاحب، احتشام صاحب، بلونت سنگھ، اپیندر ناتھ اشک تھے۔ ہندی کا تو وہ ایک اہم اشاعتی اور ادبی مرکز ہی تھا۔ ڈاکٹر دھیریندر ورما، ڈاکٹر رام کمار ورما، ایلا چند جوشی، سری کرشن داس، مہادیوی ورما، سمترا نندن پنت، مہاکوی نرالا کے علاوہ بھی بہت سے نئے پرانے لکھنے والے وہاں موجود تھے۔ اگیئے، دھرم ویر بھارتی، ترلوچن شاستری، وجے دیو نارائن ساہی، پرکاش چندر گپت، بھیرو

پرساد گپت اور اس دور کے اچھے برے ادیبوں کے علاوہ وہاں صحافیوں، وکیلوں، ججوں، یونیورسٹی کے اساتذہ اور طالب علموں کی ایک سرگرم جماعت بھی تھی۔ نظریاتی بحثیں کھل کر ہوتی تھیں۔ ادب پر سیاست کی گہری پرچھائیں کے باوجود، آج کی جیسی سستی ادبی سیاست اور ادب میں پبلک ریلیشننگ کی وبا اس وقت عام نہیں ہوئی تھی۔ میرے اساتذہ میں کلاسیکی مزاج اور مذاق رکھنے والے، ترقی پسند تحریک سے جذباتی وابستگی رکھنے والے اور ترقی پسندی مخالف، ہر طرح کے لوگ تھے۔ سب سے خاص بات اس شہر میں یہ تھی کہ وہاں کتابوں کی دوکانیں بہت تھیں۔ یونیورسٹی روڈ تو ان دنوں کتب فروشوں اور چائے خانوں کی سڑک بن گئی تھی۔ سول لائنس کا کافی ہاؤس اپنے ادبی جمگھٹوں کے لیے اور اسی کے ساتھ ساتھ نئی پرانی کتابوں کی دوکانوں کے لیے بھی مشہور تھا۔ زیرو روڈ پر بہت سستی کتابیں مل جاتی تھیں۔ روسی ادب اور چینی ادب کا چرچا اس وقت طالب علموں میں ایک تو بائیں بازو کے خیالات سے دلچسپی کے باعث، دوسرے، بہت کم داموں میں اور کبھی کبھی بے دام کے مل جانے کی وجہ سے مقبول تھا۔ یونیورسٹی روڈ پر کامریڈ چچا حکیم اللہ کی دوکان ہماری بیٹھک بھی تھی اور بائیں بازو کی ادبی، غیر ادبی کتابوں سے گہری شناسائی کا ایک وسیلہ بھی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی یونین کے جلسوں میں ان دنوں ڈاکٹر لوہیا، آچاریہ کرپلانی، کرشنا مینن کا آنا جانا ایک عام بات تھی۔ جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، راج گوپال آچاریہ اور پہلی دوسری صف کے بہت سے سیاسی رہ نما آتے رہتے تھے۔ ایک طرف ایک نئی ذہنی زندگی سے چھلکتا ہوا الہ آباد تھا۔ دوسری طرف پرانا پریاگ جہاں کمبھ کے میلوں کے علاوہ بھی آئے دن بھانت بھانت کے جشن، تہوار، تقریبات، سنگیت سمیلنوں اور پروچنوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ادب کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ، فلسفے، سماجی علوم اور تاریخ سے میری دل چسپی انہی دنوں تیزی کے ساتھ بڑھی اور ادب یا شاعری کو پڑھنے کا میرا عام تناظر (پرسپکٹیو) بدلنے لگا۔ میری ذہنی دنیا اردو زبان و ادب اور فارسی ادب کی روایت تک محدود پہلے بھی نہیں تھی، لیکن اب الہ آباد کی زندگی میں گھل مل جانے کی وجہ سے اس

میں کچھ اور وسعت پیدا ہوگئی، خاص کر ہندی زبان اور ادب کی روایت، اپنی بولیوں کی روایت کے ساتھ میرے لیے بہت پرکشش ہوگئی۔ پاکستان کے معروف جدید شاعر اور میرے دوست صلاح الدین محمود نے لکھا ہے کہ ان کی ہندی اسلام کی تاریخ میرابائی کے بھجن اور سبالکشمی کی آواز کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ الہ آباد کے زمانۂ قیام میں میرا یہ تاثر بتدریج گہرا ہوتا گیا کہ ادب کے معاملے میں تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیے کا ایک طاقت ور رول بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ مغربی ادب سے اپنے تمام تر شغف کے ساتھ مشرقی زبانوں، خاص کر ہندوستانی زبانوں کے ادب سے میری ذہنی اور جذباتی قربت بڑھتی گئی اور یہ خیال رفتہ رفتہ پختہ ہوتا گیا کہ آج کی مٹتی ہوئی، تنگ ہوتی ہوئی دنیا میں بھی ہماری اپنی پہچان کے سادھن ہمیں سب سے زیادہ مشرق اور ہندوستان کی ادبی روایتوں کے واسطے سے ہی مل سکتے ہیں۔ کلکتے کے ایک فکشن سیمینار میں (۱۹۶۴ء) اس وقت جب بھوکی پیڑھی کے شاعر روایت سے اپنی رسہ کشی میں بہت سرگرم تھے، ایک ہندی ادیب (شری کانت ورما) نے بہت زور دے کر یہ بات کہی تھی کہ ہمارا عہد ''انسان کے انٹرنیشنلائزیشن کا دور ہے۔ انٹرنیشنلائزیشن اندر اندر بدلتی ہوئی دنیا ہے۔ کہیں بھی رہ کر کسی بھی جگہ کے آدمی سے جڑا جا سکتا ہے۔ اسی لیے آج کی کہانی سے نام اڑتے جا رہے ہیں'' اور یہ کہ ''نام رکھ دینے سے کہانی جھوٹی معلوم ہوگی۔'' اپنی اسی گفتگو میں شری کانت ورما نے یہ بھی کہا تھا کہ ''ایمانداری سے کہوں تو مجھے پریم چند کی کہانیوں سے زیادہ اچھی کئی مغربی کہانیاں لگتی ہیں۔'' اور اس کا سبب ان کے خیال میں یہی انسان کے انٹرنیشنلائیزیشن والی حقیقت تھی۔ اس خیال کے طلسم میں مجھے بھی ادب کے عالمی اور بین الاقوامی تناظر کی ضرورت کا احساس ہوا اور بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی کے زیادہ تر وقت میں نے ادب کے عالم گیر اور تیزی سے پھیلتے ہوئے جدید تر میلانات کے مطالعے پر صرف کیا۔ تاریخ کے نئے تصورات، اشتراکی حقیقت نگاری، علامت نگاری، ابہام پسندی، سائنسی اور ٹکنولاجیکل تمدن کی ترقی کے ساتھ رونما ہونے والی ذہنی اور جذباتی فضا اور اس فضا میں سانس لیتی ہوئی نئی شاعری

اور نئی کہانی اور نئی ادبی تھیوریز کے بادل پہلے تو بہت گہرے ہوتے ہوئے دکھائی دیے، پھر دھیرے دھیرے چھٹنے لگے اور دماغ میں بتدریج یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ ادب میں تمام تر فلسفیانہ موشگافی تجربہ پسندی کے باوجود، پہلی اور آخری سچائی اس انسانی عنصر کی تعبیر ہے جو کسی لکھنے والے کی گرفت میں آتا ہے اور لکھنے والا اپنی ترجیحات، طرز احساس، جذباتی اور فکری جہات اور اپنی انفرادی صلاحیتوں کے مطابق اس کی تعبیر کرتا ہے۔ مجھے کسی طرح کے فکری اور اصولی (یا تھیوریٹیکل) مسئلے سے اب کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ گلوبلائزیشن، نیٹیو زم (Nativism) موڈرنزم، پوسٹ موڈرنزم یا اس طرح کی دوسری اصطلاحوں میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔ اٹھارویں صدی کے بے مثال اردو شاعر میر نے کہا تھا:

تحصیل علم کرنے سے پایا نہ کچھ حصول
میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں

میرے ساتھ ابھی یہ نوبت تو نہیں آئی کیونکہ ابھی اپنے اور اپنی دنیا کے بھیدوں، بہرویوں کو سمجھنے کی جستجو ختم نہیں ہوئی۔ پھر یہ بھی ہے کہ کتابوں سے بیزاری اور کتابوں پر بڑھتی ہوئی بے اعتباری کے باوجود، میری تلاش میں میرا سب سے زیادہ ساتھ بھی کتاب ہی نے دیا ہے۔ اب بھی کتاب ہی چلتے رہنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے، راستہ دکھاتی ہے اور کبھی کبھی ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ غالب نے کہا تھا:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آ گہی گر نہیں غفلت ہی سہی

تو کتاب سے جب ایک نجی رشتہ قائم ہوتا ہے تو مجھ پر زندگی کی آ گہی اور زندگی کے رمز سے غفلت اور بے خبری کا کچھ مطلب بھی مجھ پر کھلتا ہے یہ ایک مستقل قسم کی وجودی (excitential) صورت حال ہے۔ اس سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں۔ لیکن اس صورت حال کے شعور کا تانا بانا مجھ میں زندگی کے براہ راست تجربے اور کتاب کے بخشے ہوئے تجربے سے مل کر تیار ہوا ہے۔ سو کتاب میری ضرورت ہی نہیں، میری مجبوری بھی

ہے۔ اردو کے ایک نئے شاعر افضال احمد سیّد نے اپنے اشعار کی پہلی کتاب کو ''چھنی ہوئی تاریخ'' (History Snatched Away) کا نام دیا تھا، اور ایک نئی، نمایاں پہچان رکھنے والی حسیت کے ساتھ تاریخ کی غلط سمت (wrong side of history) میں بھٹکتے ہوئے انسانوں کے آشوب اور اذیت کا بیان اپنی ایک نظم میں اس طرح کیا تھا:

کاغذ مراکشیوں نے ایجاد کیا
حروف خونیشیوں نے
شاعری میں نے ایجاد کی

قبر کھودنے والے نے تندور ایجاد کیا
تندور پر قبضہ کرنے والوں نے روٹی کی پرچی بنائی
روٹی لینے والوں نے قطار ایجاد کی
اور مل کر گانا سیکھا
روٹی کی قطار میں جب چیونٹیاں بھی آ کر کھڑی ہوگئیں
تو فاقہ ایجاد ہو گیا

شہتوت بیچنے والے نے ریشم کا کیڑا ایجاد کیا
شاعری نے ریشم سے لڑکیوں کے لیے لباس بنایا
ریشم میں ملبوس لڑکیوں کے لیے کٹنیوں نے محل سرا ایجاد کیا
جہاں جا کر انھوں نے ریشم کے کیڑے کا پتہ بتا دیا

فاصلے نے گھوڑے کے چار پاؤں ایجاد کیے
تیز رفتاری نے رتھ بنایا
اور جب شکست ایجاد ہوئی

تو مجھے تیز رفتار رتھ کے آگے لٹا دیا گیا
مگر اس وقت شاعری محبت کو ایجاد کر چکی تھی
محبت نے دل ایجاد کیا
دل نے خیمہ اور کشتیاں بنائیں
اور دور دراز کے مقامات طے کیے
خواجہ سرا نے مچھلی پکڑنے کا کانٹا ایجاد کیا
اور سوئے ہوئے دل میں چبھو کر بھاگ گیا
دل میں چبھے ہوئے کانٹے کی ڈور تھامنے کے لیے
نیلامی ایجاد ہوئی
اور جبر نے آخری بولی ایجاد کی
میں نے ساری شاعری بیچ کر آگ خریدی
اور جبر کا ہاتھ جلا دیا

اس وقت اپنے اس اعترافی بیان کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے، بار بار بس ایک ہی خیال ذہن میں آتا ہے کہ کتاب میری اپنی آگ کا اصل سادھن بھی تو ہے۔ پھر اس کے بغیر جینے کا مطلب کیا ہوگا؟؟؟ ابھی میری تلاش ختم تو نہیں ہوئی!

بدقسمتی سے اس کم نصیب زمانے نے، ادب اور آرٹ کے مستقبل پر، اور ان کی بقا پر، کئی طرح کے سوالیہ نشان قائم کر دیئے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے، ہندوستان کے وزیر خزانہ (چدمبرم) نے یہ ہولناک بات کہی تھی کہ آنے والے دنوں میں، ہمارے تعلیمی نصابات کا رخ اور مزاج صنعتی اور تجارتی گھرانے مرتب کریں گے۔ گویا کہ وہ دن دور نہیں جب ادب اور آرٹ کی بساط بھی مال تجارت یا ایک پروڈکٹ (Product) سے زیادہ یا مختلف نہیں ہوگی۔ ابھی تک تو ہم یہی سنتے آئے تھے کہ ادب فن کی وہ ہیئت ہے جس پر بیرونی اختیارات کا زور اور بس کم سے کم چلتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کی تخلیق، بہر حال، ایک قسم کی نجی اور شخصی سرگرمی کے تابع ہوتی ہے۔

یا فوکو کے لفظوں میں کہا جائے تو یوں کہ "Literature is the most low-technology of the art forms" یعنی کہ فن کی تمام شکلوں کے مقابلے میں سب سے کم میکانکی، سب سے کم تصنع آمیز۔ اسی لیے گئے زمانوں میں ادب کی تخلیق اور ادبی کلچر کی تعمیر کا شغل وہ بے چین اور اداس روحیں اختیار کرتی تھیں جو دنیا کے معاملات میں اکثر کچّی اور بے اثر ہوتی تھیں۔ لیکن اب صورت حال تیزی سے بدلتی جارہی ہے اور سیاسی اقتدار کے اپنے اغراض و مقاصد اور بازار بھاؤ یا صارفیت کے دباؤ نے، ادب اور ادیب دونوں کا رخ انسان اور انسانی ثقافت کے باطن سے ہٹا کر انعام و اکرام کی طلب اور ظواہر کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہمارا معاشرہ سوشلسٹ قدروں کی بنیاد پر استوار ہو یا سرمایہ دارانہ قدروں کی بنیاد پر، دونوں انفرادی سرگرمی پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ ادب کی شکل اور ہیئت کا تعین دراصل لکھنے والے کے انفرادی شعور کی سطح پر ہوتا ہے۔ ادب آپ اپنا جواز ہے اور ہر کھرے اور سچے ادبی تجربے کا ظہور کسی لکھنے والے اور اس کے گرد وپیش کی دنیا میں حد فاصل قائم کرنے والی سرحد کے آس پاس ہوتا ہے۔ تخلیق کا عمل اس سرحد کو بے لوچ اور مستقل اور سخت اور سنگین نہیں رہنے دیتا۔ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق اس کو اِدھر اُدھر کرتا رہتا ہے، اس میں گنجائشیں پیدا کرلیتا ہے۔ محدود وفاداریوں، چھوٹے چھوٹے فائدوں، جاہ طلبی اور دنیوی ترقی میں شرکت کی دوڑ کے باعث ادب کے اختیارات میں بتدریج کمی ہوتی جارہی ہے۔ انسان خسارے میں ہے۔ سو ادب بھی خسارے میں ہے۔ سیموئل بیکیٹ نے یہ بات پتہ نہیں کس سیاق میں کہی تھی کہ ہر فنی اور تخلیقی سرگرمی کا اختتام، بہر حال ایک طرح کی ناکامی اور نامرادی پر ہوتا ہے۔ لیکن، اس وقت، میں تو بس اس ایک معروضے پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ ۔

جس کو ہو دین ودل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں!

یہ گلی سب کے لیے نہیں ہے، اس کا دروازہ مشکل سے کھلتا ہے اور سب کے لیے نہیں کھلتا۔

●

پروفیسر سعید الظفر چغتائی

ادب کیا ہے؟ اس موضوع پر ژاں پال سارتر نے ۱۹۴۸ء میں اپنی کتاب چھاپی تھی اور میرے قیام فرانس کے دوران سوربون کے استاد ادبیات ونقد ادب اِتیامبل Etiamble نے ایک درس شروع کرتے وقت کسی حوالہ کے بغیر کہا تھا 'آج پونے چارسو صفحے کی کتاب لکھے بغیر میں تمھیں ایک گھنٹہ میں بتاؤں گا کہ ادب کیا ہے۔ سارتر نے اپنی کتاب کی تمہید میں اس سوال کا جواب دیا تھا '' لکھنے کے فن لطیف کا غیر متعصبانہ جائزہ لے کے بتانا، کیا لکھیں، ہم کس کے لیے لکھتے ہیں، کیوں لکھتے ہیں'' پھر کتاب کے نصف آخر کے بقدر بحث کی کہ '' ۱۹۴۷ء میں لکھنے والے کی صورت حال کیا تھی'' اور تنبیہ کی کہ '' لوگ جلدی میں پڑھتے ہیں، بری طرح پڑھتے ہیں اور سمجھ میں آنے سے پہلے رائے قائم کر لیتے ہیں''۔ ہم ہوے، تم ہوے کہ میر ہوے، ان خطاؤں کا مرتکب کون نہیں ہوا ہے؟ آج مجھے اپنے ذہن کا جائزہ لینا ہے کہ کیوں پڑھتا ہوں، کیا پڑھتا ہوں، کیسے پڑھتا ہوں، کیا پڑھنا چاہتا ہوں اور کہاں تک اس تلاش میں کامیاب ہوا ہوں۔

ادب کیا ہے، کا بڑا مختصر جواب ہے، کوئی مربوط تحریر کسی موضوع پر، کسی مانوس زبان میں، جو خود کو پڑھوا لے، یعنی ایک بار شروع کروں تو ختم کیے بغیر چھوڑ نہ سکوں۔ غور کرتا ہوں اس خوبی کی تحریر کے عناصر کیا ہوتے ہیں تو جواب ملتا ہے: 'تازہ مواد اور حسن بیان' پرانا مواد نئی طرح سے پیش کر کے بھی حسن بیان یہ کام خاصی حد تک کر

دیتا ہے۔ ہاں تحریر کوئی ہو، کسی موضوع پر ہو، اس سے فائدہ اور پھر لطف اٹھانے کے لیے پڑھنے والے میں ضروری استعداد درکار ہے اور ذوق وشوق۔ سننے میں آتا ہے کہ سائنس اور ریاضی خشک مضامین ہیں، مگر مجھے کبھی ایسا نہ لگا۔ اگر سمجھ میں آتا ہو تو ہر مضمون دلچسپ ہوتا ہے۔ ریاضی میں تو عین موسیقی کا سرگم گونجتا ہے۔ بدذوق و ناشناس کے لیے موسیقی بھی بکواس ہے۔ اضافیت اور 'مکانیکیات قدری' بیسویں صدی کی فزکس کے اہم اور مشکل موضوعات ہیں۔ لیکن مجھے وہ زمانے یاد ہیں جب آئنسٹائن کا نیم ریاضیاتی کتابچہ ''اضافیت کے معنی'' (Meaning of Relativity) اور ڈراک کی درسی کتاب Quantum Mechanics پڑھنے میں غیر معمولی لطف آیا اور معنی بین السطور بھی نظر آئے۔ مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوا۔ اس تجربہ سے مجھ پر 'لی مع اللہ وقت' کا مفہوم کھلا اور باور ہوا کہ نزول کتاب کیا ہے اور واقعی ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔

میں طبیعیات کی بات کرنے لگا، مگر کیسے نہ کرتا۔ زندگی بھر اس کی روٹی کھائی ہے، اکل حلال بہ طیب خاطر۔ لکھنؤ میں میرے ایک استاد اے سی بنرجی Helmholz کی کتاب Sensation of Tone ''سُر کا حس'' کو والہانہ انداز سے یاد کرتے تھے ع اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا! میں نے 'کتاب الاغانی' نہیں پڑھی۔ مگر زندگی بھر ہوس رہی کہ کوئی پڑھ سناتا اور بیان کرتا۔ اور ایک یہی کیا۔ ان سبھی زبانوں میں جن کی مجھے شدبُد ہے ہزاروں کتابیں ہوں گی جن کی حسرت دل میں ہے مگر کتاب اور فرصت مطالعہ جفت نہ ہوسکی۔ جتنی نگارشات ادب کی خبر مجھ تک پہنچی ہے وہ سب پڑھنا چاہوں تو ستر سال کی ایک اور عمر درکار ہوگی۔

لسانی ادبیات کے عالم اور طالب علم کہہ رہے ہوں گے، یہ کیا ستم ہے۔ سائنس پڑھنا پڑھانا تو ہمارے ہاں بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔ ادب تو وہ ہے جس کی تحریر میں عبارت میں، اشارت میں، مضمون میں، ادا میں شگفتگی ہو، لگاؤ ہو، رعنائی ہو۔ اس سے جنسی جذبات بھڑکیں تو نہیں کہ یہ فحاشی ہوتی ہے مگر ان سے چھیڑ چھاڑ ضرور ہو، جو فرائڈ کے نظریۂ کافوریت Sublimation میں آتی ہے اور جس کے بغیر مقدس

نوشتوں سے لے کر تجرباتی اور ریاضیاتی علوم تک کہیں تخلیق کاری ممکن نہیں۔ ایسی مرتب اور مرصع عبارتوں کو سویڈش میں 'ادب جمیل' (Schönaliteraturen) اور فرانسوی میں Les Belles Letters کا نام دیتے ہیں جہاں 'لٹر' صرف مکتوب نہیں، ہر تحریر ہے، کہہ لیجیے جو بھی جریدۂ عالم پر ثبت ہو۔ ادب عالیہ وجود میں آتا ہے مشاہداتی علوم کے طول وعرض پر لکھنے والے کی قوت متخیلہ، احساس کی گہرائی اور زورِ قلم کے اطلاق سے! اندازِ گل افشانئ گفتار، قال کو حال میں بدل دیتا ہے اور حال میں دم اسی دم آتا ہے جب مضمون ومفہوم قاری کے دل نشین ہو جائے ورنہ کھوکھلے برتن کی آواز نکلتے ہی پہچان لی جاتی ہے۔ مضمونِ دل نشین جتنا پُر مغز ہوا تنی ہی اس میں کشش زیادہ ہوتی ہے۔ دریافت وایجاد کی کہانی اس اصول سے مستثنا کیسے ہوسکتی ہے۔ سیاحت کے بیانات مساحت الارض یا جغرافیہ کی سمجھ کے بغیر سر سے گزر جاتے ہیں اور علم تواریخ سے مطابقت نہ ہوتو کہانی مصنوعی ہی نہیں بچکانی ہو جاتی ہے، چاہے وہ ماضی قریب سے متعلق ہو یا ماضی بعید سے۔ حقیقت پسندی انسانی ذہن کی جبلّت ہے اور یہ علوم ہی سے آتی ہے۔ وہی قصص عمر پاتے ہیں جو نقش برآب نہ ہوں۔ تاریخی ناولوں کو چھوڑیے، طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ کے توتا مینا بھی تواریخ وجغرافیہ کے دشت و جبل میں ہی اڑتے ہیں۔ ہمیں زبانیں چاہے جتنی اور جیسی اچھی کیوں نہ آتی ہوں، لکھنے کا مواد علوم ہی سے ملتا ہے۔ وہ نہیں تو سب بیکار ہے۔ میں ادب اسی مواد کے لیے پڑھتا ہوں، براہ راست یا بالواسطہ۔

اچھے ادب کی پہچان اس کا دامنِ دل کھینچ لینا ہے۔ بیان میں چاہے وہ کسی علم کا ہو یا محض ذہنی اختراع پر مبنی ہو، یہ خوبی اس وقت آتی ہے جب قصہ گو اپنے موضوع سے خوب واقف ہو، ترسیل پر عبور رکھتا ہو، اور اس پر اپنا وقتِ خوش ضرورت بھر صرف کرے۔ سائنس کی عدم مقبولیت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ زیادہ تر تحقیق کار اپنا مضمون صرف تکنیکی حد تک سمجھتے ہیں۔ جو کرنے کے لائق ملتا ہے کر ڈالتے ہیں اور انھیں اس سے بڑھ کر خود اپنے کام کی روح تک پہنچنے کا موقع نہیں ملتا۔ جب پہلی منزل کا یہ حال

ہوتو حسن بیان کی دہلیز تک رسائی کیسے ممکن ہے۔ عوام کا ذکر کیا، خود ہم جیسے سائنس کے طالب علم، اپنے میدان سے ذرا ہٹ کے ہونے والے کاموں کو اس لیے بڑی مشکل سے سمجھ پاتے ہیں کہ زیادہ تر جائزے (Reviews) لکھنے والوں کے پاس نہ وضاحت کا وقت ہوتا ہے اور نہ خواہش۔ ان کا مقصد ابلاغ سے کہیں بڑھ کے اظہار ہوتا ہے۔ طبیعیاتی باریکیوں کو ریاضی کی زبان میں بیان کرنے کی مجبوری ہے۔ اس کے بغیر متغیریوں (variables) کی حرکی صفات طے نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اعجوبہ بیانی مضمون کے زوال کو بھی آواز دیتی ہے، ع مزا کہنے کا جب ہے آپ کہے اور دوسرا سمجھے۔ ماضی کے بہت سے علوم ہم تک نہیں پہنچے اور اپنی موت مر گئے کیوں کہ وہ عام قاری سے مخفی رہے۔ مجھ سے یہ باتیں سن لیجیے کہ بہت لوگ اس کا شوق نہ کریں گے۔

بعد میرے پھر کسی کو حوصلہ ہو یا نہ ہو
آ، ادھر آ اے وفا، میں آپ دامن گیر ہوں!

استاد کی حیثیت سے بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں بہت سے ایسے مضامین پڑھانے پڑے جن کا ہماری طالب علمی کے دور میں وجود ہی نہ تھا۔ ہم نے انھیں کیسے سیکھا اور کیسے طلبا تک پہنچایا یہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ ہمیں چند بار ہی سہی، یہ تجربہ بھی ہوا کہ کسی مقرر کو سنا تو دل کے گوشے جگمگا اٹھے یا پڑھایا تو سننے والوں کے چہرے فرط آگہی سے دہکتے دیکھے۔ اس طرح کے میرے تجربے میں اپنا اور دوسروں کا پڑھنا اور پڑھانا دونوں شامل ہیں۔

اب اس بات کو ذرا عام کریں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ سائنس ہو، سماجی سائنس ہو، افسانہ ہو یا کوئی اور بیان، جتنا دلپذیر اور بامحاورہ ہوگا کہ ترسیل اس کے بغیر ممکن نہیں، اتنا ہی ادب کہلانے کا مستحق ہوگا۔ پڑھنے والا اپنی جستجو میں نہ جانے کیا کیا پڑھنا چاہتا ہے، مگر پڑھتا وہی ہے جس سے اسے مسرت بھی حاصل ہو اور بصیرت بھی۔ میں نے علوم وفنون سے ہٹ کر عام ادب بھی اچھا خاصا پڑھا ہے۔ کیوں؟ وقت گزاری کے لیے اور اس تجسس کی تسکین کے لیے بھی کہ کس نے کیا لکھا ہے اور وہ کیسے ضبط تحریر میں

آیا ہے۔ جو میسر آیا، اس میں اردو کے نئے اور پرانے دونوں طرح کے لکھنے والوں کی تحریریں ہیں۔ مگر جی انھیں میں لگا جن میں تصنع کم اور فطری خیالات کا بہاؤ زیادہ پایا، جن سے نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ انسانی ذہن اعمال، رویے سمجھ میں آئے اور باور ہوا کہ ع میرے ہی لیے گردش ایام نہیں ہے۔ مگر مسرت پانے والی بات غالب رہی۔ راشد الخیری بجا طور پر مصور درد کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے سماج کے حقیقی گھناؤنے پہلو پیش کیے ہیں۔ ہماری گھریلو زندگی کی گھٹن، خاص طور پر ہماری بہن، بیٹیوں، بیویوں، بہوؤں کی مظلومیت کی سچی تصویریں کھینچی ہیں۔ اس لحاظ سے میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کی بڑی تعریف کرتا ہوں مگر یہ دل اندوز بیانات میں مسلسل نہیں پڑھ سکا اور 'مشتے از خروارے بس است' کہہ کے ادھر سے منہ موڑ آیا۔ یہی حال ہندوستان کی آزادی سے پہلے اور بعد کے فسادات کا ہے۔ لوگ کہتے ہیں، اس بربریت پر بہت کم لکھا گیا ہے، لیکن میں اس پر قلم اٹھانے کو کبھی تیار نہیں ہوا، اور نہ اس کا چرچا نثر یا نظم میں دیر تک سن یا پڑھ سکتا ہوں۔ ذہن اور منطق کو زیادہ دخل دیے بغیر، میرا شعور چاہتا ہے کہ برائی کا بیان بس اتنا ہو کہ برائی اجاگر ہو جائے اسے روکا جا سکے اور انسان اس سے نفرت کرنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ انسان ظلم جان بوجھ کر کرتا ہے، لاعلمی میں نہیں۔ ظلم کا بیان کتنا ہونا چاہیے شاید اس بات پر اتفاق نہ ہو سکے۔ مگر میں اپنی فطری کمزوری سے مجبور ہوں۔

کچھ ہی دن پہلے صہیب الیاسی۔ جس غریب کو جلد ہی سماجی بیداری پیدا کرنے کے صلہ سے کہیں زیادہ فاش گوئی کی سزا ملی۔ ہمارے ٹی وی پر ہندوستان کے نامی مجرموں پر ایک ایک کر کے تفصیلی پروگرام دیتے تھے، اور سنا کہ اس کی بدولت بہت سے مجرم گرفتار ہوئے، جو بہت اچھی بات ہے، مگر ان دل دہلا دینے والے مناظر کا صدمہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پردۂ سیمیں پر مظالم کا بیان مظلوم سے ہمدردی پیدا کرتا ہے اور ظلم سے نفرت۔ مگر میرے نزدیک یہ احتیاط طلب ہے۔ ایک دوبار ظلم کا مظاہرہ دیکھنے سننے سے صدمہ پہنچتا اور اس سے جذباتی نفرت ہوتی ہے لیکن

بار بار ایسا ہوتا رہے تو عادت پڑ جاتی ہے اور پھر ہمارے سامنے بھی ایسا واقعہ پیش آ جائے تو معمول ٹھہرے گا۔ اس لیے میں تشدد کی تفصیلات نہیں پڑھتا اور انھیں ادب میں داخل نہ کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ آج کا ادب نیند کی گولیاں نہیں کھلا سکتا اور نہ پرستانی کہانیاں سنائے گا۔ مگر میں ادب سے یہی توقع رکھتا ہوں کہ وہ اخلاق حسنہ جگائے اور پڑھنے والوں کو بہتر انسان بنائے۔ اگر برائی کے بیان کے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا تو اسے ذہن پر طاری کر کے morbidity بنا کے بھی نہیں ہوسکتا۔ حالات متلی لے آئیں تو مجبوری ہے مگر میں اس کے لیے حلق میں انگلی ڈالنے کے خلاف ہوں۔

جذباتی تناؤ ادب میں کشش پیدا کرتا ہے، مگر اسے بھی حد کے اندر رہنا چاہئے، نہ اتنا کہ ذہن کا توازن بگاڑ کے قاری کو اکنگا کر دے۔ جذبات کا کام سچائی کو سوز عطا کر کے خشک اور تلخ نہ ہونے دینا ہے۔

ادب ہو یا کچھ اور، میں کسی کی رائے آنکھ بند کر کے نہیں مان لیتا۔ جہاں تک ہو سکے جانچ پڑتال کرتا ہوں کہ ع گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش۔ اور تعلیم یافتہ صاحب ذہن کا فرض بھی ہے کہ دوسروں سے سن کے نہیں، خود پڑھ کے رائے قائم کرے۔ اوائل عمری میں کسی بڑے کے منھ سے کسی تحریر یا شخص کی مذمت سنتا تو سوچتا اس میں کچھ ہوگا ضرور، ورنہ ایسا معتبر شخص اس کا ذکر کیوں کرتا۔ میرے ایک محترم نے، جن کے جوش ملیح آبادی سے خاصے تعلقات تھے، ان پر اور ان کی شاعری پر تنقید کی۔ لکھنؤ واپس پہنچتے ہی مجھے دانش محل میں 'جنون وحکمت' نظر آئی۔ خرید لایا، پڑھی، پسند کی اور اس کی بعض رباعیاں اب تک یاد ہیں۔ فرائڈ اور آسکر وائلڈ کا تعارف بھی انھیں بزرگوار کی زبانی ہوا۔ اور تعریف میں نہیں۔ میں نے پہلی فرصت میں یونیورسل بک ڈپو، حضرت گنج لکھنؤ سے دونوں کے مکمل کارنامے خرید لیے اور جستہ جستہ پڑھے۔ فرائڈ سے سیکھا کہ خواب کی تعبیر کیسے دی جا سکتی ہے اور صحت مند زندگی کے لیے ذہنی گھٹن قاتل زہر ہے۔ آسکر وائلڈ کا ناولٹ 'ڈورین گرے کی تصویر' ڈوب کے پڑھی اور ختم کر کے ہی چھوڑی۔ پہلے ہی پیراگراف نے بتادیا تھا کہ ایک جاں گداز المیہ

شروع ہورہا ہے۔ ختم ہوا تو میں اس سے کہیں بہتر انسان اور طالب علم تھا جس نے اسے شروع کیا تھا۔ بہت سے ادب شناس وائلڈ کے اسلوب کو مصنوعی اور بھاری بتاتے ہیں، مگر مجھے اچھا لگا اور اب بھی برا نہیں لگتا گو کہ گلستان سعدی جیسا مثالی نہیں۔ ایک سال کے اندر میں گورکھپور میں لکچرر ہوگیا اور کسی نجی گفتگو میں اس تاثر کا اظہار کیا تو ایک سینئر مورخ نے میرا ہاتھ پکڑا اور گول گھر لے جا کے انگریزی ترجمے میں ''کراموزوف بھائیوں'' پر دو جلدیں خریدوا دیں۔ ''چغتائی! اسے پڑھو تو تم کو معلوم ہوگا، ادب عالیہ کیا ہوتا ہے'' میں دوستوئیفسکی سے بالکل واقف نہ تھا اور نہ برسوں ان جلدوں کو کھول ہی سکا۔ یہاں تک کہ فرانس سے اس شہرۂ آفاق ناول کا فرانسیسی ترجمہ اسی طرح سربہ مہر لے کے علی گڑھ آ گیا، اور یہاں دس پندرہ برس گزار کے اتنی فرصت پائی کہ دونوں ترجمے سامنے رکھ کے پڑھنے کا حوصلہ کروں۔ معلوم ہوا دونوں میں بہت فرق ہے۔ شاید مطابق اصل کوئی نہ ہو۔ تمام کیا تو اس میں بھی 'بارسے لونا' میں نزول عیسیٰ کے اہم تخیل سے جیسے تیسے ہی گزر گیا۔ کتاب پر کوئی فاضلانہ بات نہیں کہہ سکتا۔ صرف اتنا تاثر قائم ہے کہ روس کا وہ معاشرہ اب سے بیس تیس سال پہلے تک یورپ کے معاملے میں ہندوستانی معاشرے سے زیادہ ملتا جلتا تھا۔ اس وقت اس کے متوسط طبقہ کی سماجی حالت اتنی زبوں ہوسکتی تھی کہ ایک دو نہیں، ہر مزاج کے بھی بیٹے اپنے بدافعال باپ کی موت کی تمنا کرتے اور اس کے قتل کی سازش میں شریک ہوسکتے۔

میں ایڈیئیٹ (احمق) اس سے پہلے پڑھ چکا تھا، جسے عام ناقدین، کراموزوف بھائیوں' کے بعد گنتے ہیں۔ میرے نزدیک کہانی کی ہم آہنگی اور نشتریت کے لحاظ سے ایڈیئیٹ بہت بہتر ہے، جب کہ سماجی، فکری پہلو کے اعتبار سے ناقدین کہتے ہیں کہ کراموزوف کا کینوس وسیع تر ہے۔ مجھ پر پرنس مشکن کے کردار کا یہ اثر ہوا کہ ہمارا معاشرہ اسے احمق گردانتا ہے جو متوازن ہو، معاملہ فہم ہو، صلح کل کا مزاج رکھتا ہو اور دوسرے انسان کا دکھ درد بھی محسوس کرتا ہو۔ میں نے ٹالسٹائی کے تین ناول ضرور پڑھے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ روسی عصبیت کے باوجود ''جنگ اور امن'' پڑھ کے ہم

اس عہد کے یورپ اور نپولین کی بربادی کے اسباب تاریخی کتابوں سے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ انا کیرے نینا کے کردار کی پیچیدگی سمجھنے کا کما حقہ، موقع مجھے نہیں ملا۔ میں ''حیات نو'' (Resurrection) کو تالستائی کا اس سے زیادہ اہم ناول مانتا ہوں۔ اس میں ایک گری پڑی عورت کی بحالی کی ہی داستان نہیں ہے۔ اس کی انا، سماجی، نفسیاتی سوجھ بوجھ اور معاشرہ کا وہ بیان ہے جو اتنا پختہ کار قلم ہی کر سکتا تھا۔

ناول کے سلسلہ میں ''ہوا کا جھونکا ساتھ لے گیا'' Gone with the wind کے شاعرانہ عنوان سے مارگریٹ مچل کے امریکی ناول کا ذکر کرتا چلوں، جسے اس پر بنی اتنی مقبول فلم نے پامال کر ڈالا۔ پردۂ سیمیں پر ہم جو دیکھتے ہیں اور کتاب کے صفحوں پر جو پڑھتے ہیں، دونوں یکساں نہیں ہوتے۔ ناول امریکی خانہ جنگی کے بھرپور ماحول میں ابھرتی ہے، پروان چڑھتی ہے۔ پھر شمال وجنوب کی مقاومت کی چڑھتی ندی اتر جاتی ہے اور ناول کے انسانی رشتے چلتے رہتے ہیں۔ پرانے خاندانوں اور نو دولتیوں کا تصور یورپ، امریکہ یا ایشیا کے لیے مخصوص نہیں۔ یہ آج کے ہندوستان میں بھی ڈھونڈ لینا مشکل نہیں۔ جھوٹی انا کا معاملہ تو بہت جگہ مل جاتا ہے، شاید اس سے فاش تر، چالاک تر یا زیادہ نفرت آگیں یا کم، مادام بواری میں، وینٹی فیر میں، انا کیرے نینا میں۔ مگر یہ کہ ''ہر آج کے بعد کل ہوتا ہے'' اور جوانی ہار نہیں مانتی چاہے حالات جتنے خراب ہوں اور چاہے امید کی کوئی کرن دور دور نظر نہ آتی ہو۔ کہیں اور بمشکل ڈھونڈا جا سکے گا اور وہ بھی ایسا نہیں۔ اس لحاظ سے میں اس ناول کو عالمی انتخاب میں خاصا بلند درجہ دوں گا۔ اچھی اور بری، یہ ایک پوری گم گشتہ تہذیب کی دستاویز ہے، اپنوں اور غیروں کے ساتھ ہمدردی اور حقیقت پسندی کے مدھم سروں میں۔

وقت ہمارا ساتھ نہ دے پائے گا کہ فرانسوی، فارسی اور انگریزی کی مزید تصانیف کا ذکر کروں جو اور پہلے میں نے پڑھی ہیں۔ چلتے چلتے صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اردو کی طرف لوٹ آؤں، اور عرض کروں کہ مجھے اس کی مشہور عام داستانیں نہیں بھائیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہ زندگی کی وہ تصویر پیش نہیں کرتیں جس کی میں

چاہوں گا کہ نوجوان آرزو کریں۔ ان میں مجھے خودستائی کھٹکتی ہے اور محض تخیل پر مرکوز اکہرا پن بھی پسند نہیں آتا۔ دوسری بات یہ کہ قرۃ العین نے اپنا اچھا خاصا وقت شجرہ نویسی میں گنوا دیا۔ اس سے ہٹ کر جو اعلا افسانوی ادب انھوں نے جنم دیا ہے، عالمی ادب میں کسی سے کم نہیں۔ ان کا انسانی معاشرہ کا تصور اور بیانات کا کینوس ان کی ذہنی وسعتوں کا سراغ دیتا ہے۔ جھٹ پٹ فروگزاشتوں کو نظر انداز کر دیجیے تو ''آگ کا دریا'' آج بھی زندگی کی ازلی و ادبی جولانیاں جلو میں لیے بہہ رہا ہے۔ 'گردشِ رنگ چمن' خاتمہ کے بغیر ختم ہو کے زندگی کی لچکتی، سرکتی بے یقین ڈگر جھلکا رہی ہے۔ دوسری کہانیاں اور ناولٹ ہندوستان کے مسلمان و غیر مسلم سماج کے اندر اور باہر عالمی انسانی رشتوں کے کرب کی روشن اور دھندلی تصویریں کھینچتی ہیں، جن میں ان کی اور ان کے مقامات کی انفرادیت ہے مگر جنھیں روئے زمین پر کوئی بھی انسان اپنی کہانی سمجھ سکتا ہے۔ قرۃ العین کے نام پر اب بھی اردو اور ہندوستان میں ادب کا ایک اور نوبل انعام آ سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی اکادمی اس طرف فوری توجہ کرے۔

جی ہاں، میں نے ادب پڑھا ہے، اب بھی پڑھتا ہوں۔ جلدی جلدی میں، وقت گزارنے کے لیے، منہ کا مزا بدلنے کے لیے، سرخوش ہونے کے لیے جو اہلِ قلم چاہتے ہوں کہ مجھ جیسے ان کا لکھا زیادہ توجہ سے پڑھیں، ان سے درخواست ہے کہ آسان لکھیں اور اپنے اسلوب کی بنیاد راست بیانی اور فصاحت گفتاری پر ڈالیں۔ میں نہیں مانتا کہ زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ ہم زندگی کو اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق مقصد دیتے ہیں تاکہ اس کی تلخیاں کچھ کم محسوس ہوں اور ایک عالم سرشاری میں زندگی کر سکیں۔ شہد نہ سہی، تلخابہ گوارہ تو ہو ہی جائے۔ ادب پڑھنا بھی اس مشغلہ، اس کوشش، اس خود فراموشی یا خود آگاہی کا ایک بڑا اور مبارک وسیلہ ہے۔

ان انکھڑیوں کی یاد مجھے آ گئی سودا\
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

●

پروفیسر نقی حسین جعفری

''شاعری کا مستقبل بے پناہ ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، انسانیت کو شاعری میں لابدی پناہ حاصل ہوگی۔ کون سا عقیدہ ہے جو متزلزل نہ ہوا ہو، کون سا ایسا کلیہ ہے جس کے مفروضات پر سوالات نہ قائم کئے گئے ہوں، اور کون سی ایسی روایت ہے جو زوال آمادہ نہ ہو۔

مذہب نے ایک ''بے روح جامد شے'' Fact کی شکل اختیار کرلی ہے، مفروضہ حقائق۔ اس نے اپنے عمل، حقائق و انجذاب کو نہیں، مفروضہ حقائق کے تابع کردیا ہے، اور اب وہی 'مفروضہ حقائق' ہماری شکست وریخت کا اعلامیہ ہیں۔ لیکن شاعری میں خیال ہی سب کچھ ہے۔ باقی سب واہمہ۔ آپ چاہیں تو اسے مقدس واہمہ کہہ لیں۔ شاعری جذبے کو خیال سے جوڑتی ہے۔ یہاں خیال ہی سب کچھ ہے۔ ہمارے مذہب کی مضبوط ترین اساس اس کے لاشعور کی شاعری ہے۔''

میتھیو آرنلڈ کے مذکورہ اقتباس کو میں نے اپنی تحریر کا عنوان بنایا ہے۔ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ یا ادب میں ایسا کیا کچھ ہے جو ہماری توجہات کو اپنی جانب مبذول کرتا ہے، ان سطروں کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ روایتی طور پر شاعری، یعنی ادب کے مقابلے میں فلسفہ کے مطالعہ کو اہمیت حاصل تھی۔ ادب کے دفاع میں زمانۂ قدیم سے مضامین لکھنے کی روایت بھی یوں بنی کہ اس کی افادیت پر ہمیشہ سوالات اُٹھائے گئے۔ کبھی شعروادب میں مبالغہ آرائی کو ہدف بنایا گیا اور کبھی بادی النظر میں

غیر حقیقی واقعات کو کذب وافترا کا نام دیا گیا۔ مدح اور ہجو کی غیر فطری تقسیم بھی ادب شناسی میں مانع سمجھی گئی۔ لیکن ہماری دلچسپی شعر اور قصے میں بدستور باقی رہی۔ اس دلچسپی کے جواز اور اس کی تعبیریں بدلتی رہیں۔

موجودہ دور یعنی ہمارے عہد میں 'ادب کا مطالعہ ایک نئی بصیرت کا متقاضی ہے۔ فلسفہ اور دیگر سماجی علوم کسی مخصوص فکر کی تعبیر وتشریح میں انسانی معاشرے کی درجہ بندی کبھی کبھی اس اصرار اور شدومد سے کرتے ہیں کہ یہ باور ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا نقطۂ نظر قابلِ قبول نہیں ہے۔ ان افکار کی بنیاد بعض مفروضوں پر ہوتی ہے۔ یہ مفروضے اطلاعات اور آزمودہ حقائق پر مبنی ہوتے ہیں، جہاں انفرادی جذبے اور خیال کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قاری کو اپنے خیال و احساس کی دنیا کو پیچھے چھوڑ کر ایک اجتماعی شعور کا حصہ بننا پڑتا ہے، لیکن یہی قاری جب اس دور میں لکھا گیا کوئی اچھا ناول پڑھتا ہے یا کوئی نظم پڑھتا ہے تو اس کے ذہن و دل کی دنیا زیادہ منور ہوتی ہے۔ ایک یا دو مثالوں سے اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کی دو بڑی جنگوں کے اسباب و نتائج پر تاریخ اور سیاسیات کے حوالوں سے ہزاروں صفحے لکھے جا چکے ہیں۔ اتحادیوں کا نقطۂ نظر، ان کی حکمت عملی اور عالمی منظر نامہ، لیکن اُن انسانیت سوز سلسلۂ واقعات پر جو کچھ ادب میں لکھا گیا ہے، اس کی بصیرت بالکل الگ ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ، ڈبلیو بی ایٹس، آڈن اور ولفرڈ اوون، جورج اورویل اور...

دوسری مثال ہندوستان کی تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے نتیجے میں ملک کے بٹوارے پر لکھے گئے ہزاروں صفحات کے پس منظر میں چند ادبی تخلیقات سے لی جا سکتی ہے۔ یہ برطانوی سرکاری دستاویزات کا نقطۂ نظر اور بعض آزاد مورخوں کی تحقیق و جائزے کے مدّ مقابل یا متوازی، آگ کا دریا، اُداس نسلیں، بستی، آنگن، خدا کی بستی، لہو کے پھول، میرے بھی صنم خانے، Ice Candy Man، سعادت حسن منٹو کے سیاہ حاشیے، فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اُجالا' اور آڈن کی نظم 'Partition'۔ جب ہم بٹوارے پر لکھا گیا ادب پڑھتے ہیں تو ہمیں انسانی صورت حال

Human condition کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں جو کچھ سیاسی دستاویزوں میں درج ہے وہ یا تو جھوٹ ہے یا دلیل و جواز کا پشتارہ۔ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ Radcliff Award کی منطق پر شاید سب سے بھرپور تبصرہ ہے۔ فلسفے اور تاریخ کی طرح ادب کا منصب بھی زندگی کی تعبیر تلاش کرتا ہے۔ لیکن اس کا دائرہ تعبیر کی تلاش سے فزوں تر ہے۔ ادب کا مقصد انسان کو ڈھارس دلانا اور اس کو قائم رکھنا (Sustain) بھی ہے۔ فلسفہ اور تاریخ یہاں عاجز نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں یورپ میں استعماریت کی کش مکش کے خونیں ڈرامے کی سب سے معتبر دستاویز اُس دور کا ادب ہے جو فکشن، شاعری اور ڈرامے کے حوالے ہمیں ملتا ہے۔ ریاستی جبر اور فرد کے بے اعتبار ہونے کی سچائی ہمیں جورج اورویل کی تمثیل Animal Farm میں نظر آتی ہے اور تنہائی، فرد کی بے وقعتی اور لایعنی Academic Rhetoric کی کہانی Waiting for Godot میں۔ جنگ اور ریاستی تشدد کے خلاف لکھنے والوں میں تخلیقی فن کار سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ برنارڈ شا، برشٹ اور ابسن Ibseu کے ڈرامے ہمیں ایک نئی حسیت کا پتا دیتے ہیں۔ دیگر لکھنے والوں کے مقابلے میں تخلیق کار شاید اس طرح منفرد ہے کہ وہ اپنے ضمیر سے یا فن کے تقاضوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتا، جب کہ مورخ اور فلسفی کو اکثر و بیشتر کسی مفروضے Thesis کو بنیاد بنا کر اپنا مقدمہ تیار کرنا ہوتا ہے، یہ مقدمہ استخراجی ہو سکتا ہے اور استقرائی بھی، لیکن تخلیق کار کے سامنے انسانی صورت حال Human Condition اور فن کی پرکھ کے علاوہ کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔

یہاں اس بات کا ذکر شاید بے محل نہ ہو کہ تاریخ نویسی کی نئی شعریات میں اُس دور کے ادب کو بتدریج اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ گذشتہ برسوں میں لکھی گئی تاریخ کی کتابوں میں Partition lit کو بھی ایک نقطۂ نظر کے طور پر اعتبار حاصل ہوا ہے۔ پہلے معاصر ادب کے حوالوں کو صرف حاشیوں میں جگہ ملتی تھی۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور خونیں واقعات پر تاریخ کی کتابیں اور حوالے ہماری بصیرت میں کوئی

اضافہ نہیں کرتے، ہاں غالب کے خطوط اور علامہ فضلِ حق خیر آبادی کی یادداشتوں سے روشنی ضرور ملتی ہے۔ ۱۸۵۷ء پر ہمارا قومی نقطۂ نظر عرصہ تک انگریز بہادر کی تاویل اور تعبیر پر مبنی رہا۔ اس نقطۂ نظر کے حامل کارل مارکس، سر سیّد، مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور گاندھی سب ہی نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء پر اُردو میں کوئی بڑا ناول نہیں لکھا گیا۔ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین اور حیات اللہ انصاری کے لہو کے پھول میں ۱۸۵۷ء پر ذیلی اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ولیم ڈیلرمپل کا ناول The Last Mughal ایک تاریخی ناول کے طور پر اُس موضوع پر ایک قابل لحاظ اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا پہلا ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں، انیسویں صدی کی تہذیبی زندگی پر تاریخ اور ادب کے حوالے سے ایک مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ ہم یہ جانتے ضرور تھے کہ انیسویں صد کے وسط میں انگریزوں کی سیاسی بالا دستی کے باوجود مغل تہذیب و تمدّن ایک ہمہ گیر اعلیٰ درجے کی ثقافت تھی جس میں انسان دوستی، رواداری اور انصاف پروری کی مضبوط روایات موجود تھیں اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ مغل اشرافیہ کے افراد اپنے کو کسی بھی اعتبار سے برطانوی فوجی افسروں اور سول حکام سے کم تر نہیں سمجھتے تھے، لیکن فاروقی کے ناول کے مطالعے سے شمالی ہندوستان کے بڑے تہذیبی مراکز کی زندگی زیادہ اچھی طرح کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہاں ادب کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے اگر Popular Culture کے حوالوں میں فلم کو بھی لے لیا جائے تو ۱۸۵۶ء کے اودھ کے مبینہ (Accession) کے حوالے سے ایک بات کہتا چلوں۔ اس موضوع پر پریم چند کی کہانی شطرنج کے کھلاڑی ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ اس کہانی کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں اودھ کے انضمام کے سلسلے میں انگریز بہادر کے تیار کیے ہوئے محضر کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ ۱۹۱۲ء کے آس پاس لکھی گئی اُس کہانی میں ہمیں مرزا اور میر کی شطرنج کے علاوہ معاصر واقعات پر کوئی بصیرت نہیں ملتی، اور جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ انضمام کا جواز اور نوابی عہد کا تعیش اور حکام کی نااہلی۔ پریم چند نے جس دور میں یہ کہانی لکھی وہ دور انتہا درجے کی

مرعوبیت کا زمانہ تھا۔ اُس وقت ہمیں مغل ہندوستان اور اس کی دیسی ریاستوں کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی، اور انگریز بہادر کا جادو ہر طرف سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ساٹھ سال کے بعد، ۱۹۷۷ء کے آس پاس جب ستیہ جیت رے نے اس کہانی کو فلم کا رُوپ دیا تو انھیں پریم چند کی ذہنی مرعوبیت سے آزاد ہو کر کہانی کو دوبارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ستیہ جیت رے نے لاجواب فلم بنائی جس میں ڈلہوزی کی Doctrine of Lapse سے لے کر انگریزوں کی سیاسی چالوں اور مکر و فریب کا بڑے فن کارانہ طور پر اظہار ہوا۔ ۱۸۰۶ء اور ۱۸۰۷ء پر جب بھی بات ہوگی، سرکاری دستاویزات اور C.R.Sleeman کی یادداشتوں کے علاوہ پریم چند کی کہانی کے ساتھ ستیہ جیت رے کی فلم کا ذکر لازمی طور پر آئے گا کہ اودھ کے انضمام کے المیہ پر یہ پہلی فن کارانہ کوشش تھی جس نے ہمارے افق روشن کئے۔ یہاں ستیہ جیت رے کی فلم Tests of Popular Culture کے طور پر ہماری ادبی حسیت میں اضافہ کرتی ہے۔

عہد حاضر کی ادبی حسیت کے چند حوالوں کے بعد، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کے تناظر میں اُس ادبی ورثہ کا کچھ ذکر ہو جائے جس نے اہل یوروپ کو عہد ظلمت سے نکالا۔ تراجم 'مہم جوئی'، سائنس کے فروغ اور ہیومانزم کے آغاز کے ساتھ بعض ایسی ادبی کاوشیں اور تحریکات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے یوروپ کی کایا پلٹ دی۔ صلیبی جنگوں کے شرمناک انجام ۱۲۵۸ء کے بعد دانتے نے اپنی طربیۂ خداوندی کے وسیلے سے عیسائی دنیا کو روحانیت اور ایک بہتر تمدن کی طرف متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُسی طرح Petrorch نے یوروپ میں شاعری کی روایت کو ایک نئے رمز سے آشنا کیا جو دو سو سال کے بعد سانٹ کی مضبوط شعری روایت کے طور پر نمودار ہوئی۔ یہ یوروپ میں عشقیہ شاعری کے فروغ کا زمانہ تھا جس کی ابتدا گیارہویں صدی کے آخر میں اچانک پروونسال شاعری سے ہوتی ہے۔ سی. ایس. لیوس (C.S. Lewis) کے الفاظ میں یوروپ کی آٹھ سو سال کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا موڑ ہے جس کے سامنے نشاۃ ثانیہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ شیکسپیئر

پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے طویل خون خرابے اور انگلستان کی طویل تر خانہ جنگی کے بعد نسبتاً پُر امن دور میں پیدا ہوا۔ اُس نے عہدِ وسطیٰ کے عہدِ ظلمت اور غارت گری کے دور کے خاتمے پر اپنے ڈرامے کے وسیلے سے زندگی کی تمام نیرنگیوں اور المناکیوں اور انسان نے انسان کی ساتھ کیا، کے موضوع کو خلاقانہ بصیرت سے دیکھا۔ شیکسپیئر نے اپنے تاریخی ڈراموں میں Nature and the power of the State کو بھی موضوعِ بحث بنایا اور What has been کے بجائے What might have been کے امکانات کو خوب اچھی طرح ٹٹولا۔ سولہویں صدی کی ابتدا میں اطالوی زبان میں لکھا گیا Orlando Furioso کو Ariosto کے شاہکار کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ اس رومانی رزمیے کا ترجمہ یوروپ کی ہر زبان میں ہوا اور اس کی اشاعت کے دوسو برس کے اندر اس کے دوسو اڈیشن شائع ہوئے۔ اٹھارہویں صدی تک یہ شعری داستان یوروپ میں ہر پڑھے لکھے گھر کی زینت تھی۔ اس کا موضوع چارلس مارٹل کے ہاتھوں ویانا میں عربوں کی شکست اور فرانسیسی اور اطالوی مہم جوؤں کی شجاعت کی داستان ہے۔

مشرقی دنیا میں، گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں دو سمتیں اسلامی تمدن کے دائرے میں ایسی نظر آتی ہیں جن کے دوررس نتائج سامنے آئے۔ اوّل تصوف کا باقاعدہ و باضابطہ عروج اور خانقاہ نشینوں کا ریاست State سے دوری پر اصرار اور دوم فارسی شاعری کے وسیلے سے مذہبی رسوم پر اصرار سے اجتناب کا شعری اظہار۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں رجحانات ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی ایک دوسرے کی تائید بھی کرتے ہیں، جیسے مولانا جلال الدین رومی اور عطار جو بیک وقت صوفی ہیں اور شاعر بھی۔ رومی کے زمانے سے آج تک فارسی/ اُردو شاعری میں جس طرح شیخ و محتسب، منبر و محراب، قشقہ و زنار اور سجادہ و تسبیح کے علائم کے وسیلوں سے ''ظاہری اعمال'' ریاکاری اور فقہی بالادستی کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے، اس کی مثال اُردو شاعری کے علاوہ اس تواتر سے کہیں نہیں ملتی۔ اُردو شعری روایت نے راست طور

پر فارسی شعری روایت سے اکتساب کیا، چنانچہ وہی علائم یہاں بھی اُسی تسلسل سے پائے جاتے ہیں۔ Secular theories یعنی غیر مذہبی موضوعات پر ایسی قومی شعری روایت جیسی کہ فارسی اور اُردو غزل میں ہے، شاید کہیں اور نہیں ملتی۔

رومی اور حافظ، فارسی میں اور امیر خسرو اور کبیر ہندوی میں Signpost کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کی تاریخ میں ایسے اہم موڑ پر نظر آتے ہیں جہاں ان کی شخصیت اور شاعری انجذاب اور اتصال کا غیر معمولی تجربہ فراہم کرتی ہے۔ ایک مخصوص تصورِ کائنات کے بغیر ایسی شاعری وجود میں نہیں آتی۔ دوسرا اہم نام کبیر کا ہے۔ یہاں بھی کائنات اور اللہ کے تصوّر کو ازسرِنو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبیر کے یہاں عشق بھگتی میں مندمل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جس قوت سے ریا کاری اور مذہبی رسوم کی پابندی پر اصرار کو اپنی شاعری میں ہدف بنایا ہے، وہ حافظ کی یاد دلاتا ہے۔ کبیر بھی ہندوستانی تاریخ کے ایسے موڑ پر نظر آتے ہیں جہاں انسان اپنی شناخت کے لیے ازسرِنو بھٹکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہم رومی، حافظ اور کبیر کے متذکرہ بالا سروکار کو مذہب کے جامد ہو جانے کے ردِعمل سے پہچان سکتے ہیں، اور جب آرنلڈ کے الفاظ میں مذہب ایک بے روح جامد شے میں تبدیل ہو جائے تو مذہب کی پناہ گاہ اس کے لاشعور کی شاعری میں تلاش کی جاتی ہے۔ جلال الدین رومی، عراقی، سنائی اور حافظ کے کلام کو ہم اس تناظر میں اسلام کے لاشعور کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں اس کی ایک وجہ ادب کی حُزنیہ لے بھی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ Suffering is common to Philosophy & litrature لیکن فلسفے میں اُس غم کا ذکر ایک کلیہ اور Pattern کے طور پر ہوتا ہے جب کہ ادب میں یہ انفرادی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ٹالسٹائی کے ناول Anna karenina کا پہلا جملہ خاصا بصیرت افروز ہے: All happy families mesembone another, every unhappy family is unhappy in its own way." آپ اُردو شعرا کے دیوان کھول کر بیٹھ جائیں، ہر شاعر اپنے غم والم

میں الگ اور مختلف ہے۔ کبھی کبھی تو یہاں تک دیکھنے کو ملتا ہے کہ ہر شعر دوسرے شعر سے الگ ہے۔ جب ہم کسی تذکرے یا سوانح عمری میں یہ پڑھتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے ساتھ سفر و حضر میں مثنوی مولانا روم، یا دیوانِ شمس تبریز یا دیوانِ حافظ، یا دیوانِ غالب رکھتا تھا، تو ہمیں اُس سے یہی سمجھنا چاہیے کہ ان شعرا کے یہاں یا ان کے کلام میں انسانی صورت حال Human condition پر ہر قسم کا شعری اظہار دستیاب ہے۔

ہماری ترجیحات میں ادب کو اوّلیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ ڈبلو. بی. یے ٹس کے الفاظ میں:

> When we quarrel with others, We create rhetoric; when we quarrel with ourselves, poetry."

یعنی جب ہم دوسروں سے دست وگریباں ہوتے ہیں تو Rhetoric وجود میں آتا ہے اور جب اپنے آپ سے لڑتے ہیں تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ لیجیے یے ٹس نے ادب کو بھی تقسیم کر دیا۔ Rhetoric شاعری یا ادب نہیں ہے۔ اپنے نفس اور ذات کی گہرائی میں اُتر کر اپنے آپ سے نبرد آزما ہونے کے نتیجے میں اچھی شاعری تخلیق ہوتی ہے۔

کائنات کی ترتیبِ نو Re-ordering & Universe بھی اچھے ادب کی شناخت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے مابعد الطبیعی مسائل کا شعری اظہار کہہ سکتے ہیں۔ یہ سروکار نئے انداز میں داخل نہیں کیے جاتے بلکہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں، شاعر انھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور اُسے اپنے الفاظ میں ازسرِ نو بیان کرتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کی تشریح کی جا سکتی ہے:

خوش باشی و تنزیہہ و تقدس سے مرے ساتھ
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں
میر

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
غالب

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتوِ سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
غالب

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
اقبال

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا　　　واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

نمود عالم اسباب کیا ہے! لفظ بے معنی، کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے۔ رچرڈس کے الفاظ میں Readjustment of inpulses یعنی انسانی جذبات اور احساسات کی باز مفاہمت بھی ادب کا سروکار ہے۔ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ بعض بنیادی جبلتوں Basic instincts اور اُس سے وابستہ جذبات اور احساسات کی کہانی ہے۔ شاعر بس اس پر قادر ہوتا ہے کہ وہ ان کے تخلیقی اظہار کو اپنے شعری تجربے کا حصہ بنائے، اُردو غزل نے اس سروکار کو پیش پیش رکھا ہے:

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی　　　وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے
حاصل اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو　　　دل بہ دل پیوستہ گویا یک لب افسوس تھا
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　　تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

چند سال پہلے مشہور تنقید نگار اور عالم، سر لڈ بلوم نے شیکسپیئر پر اپنی کتاب Invention of the Human میں ایک بالکل نئے نقطۂ نظر سے ہمیں روشناس کرایا۔ اُن کا کہنا ہے کہ سولہویں صدی یا اس سے پہلے کے انگلستان میں انسانی جذبات اور احساسات کی وہ دنیا تھی ہی نہیں جس سے ہم شیکسپیئر کے ڈراموں کے وسیلے سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ سب کا سب شیکسپیئر کا اپنا کارنامہ اور اس کی اختراع ہے۔ یعنی حافظ، میر و غالب کے اشعار میں ہم جس انسانی معاشرے سے دوچار ہوتے ہیں، اس کے حقیقی وجود پر تو قیاس کیا جاسکتا ہے، لیکن شیکسپیئر کے کرداروں کے وسیلے جو معاشرہ ترتیب پاتا ہے، اس کی بنیاد عہد الزابیتھ میں سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ انسان دوستی، محبت، ایثار اور عظمت آدم کے وہ سب انسانی پیکر جن سے شیکسپیئر کے ڈراموں کی دنیا آباد ہے، تمام تر شیکسپیئر کی قوت متخیلہ کا کارنامہ ہے۔ یہ صرف ایک Thesis ہے جسے کلیتہً ماننا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو ادب میں شیکسپیئر کے کارنامے کو جس قدر بھی خراج عقیدت دیا جائے کم ہے۔

صیغۂ واحد متکلم سے کلیتہً اجتناب نہ کرتے ہوئے ادب فہمی کے بارے میں بس اتنا عرض کرنا چاہوں گا جو کچھ سیکھا وہ چھپے ہوئے حروف پر آنکھیں گاڑ کر دیکھنے کے عمل سے سیکھا۔ (Fixing the gaze on the printed page) اس ضمن میں بیسویں صدی کی ابتدا میں امریکا میں Neo criticism کے Practioner کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کو ملا۔ فارسی میں شرح، اور شرح کی شرح لکھنے کا رواج قدیم ہے۔ اُردو میں دیوانِ غالب کی شرحیں لکھیں گئیں۔ لیکن مفرد اشعار کی غزل کے تجزیے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ اُردو میں غزل کے تجزیہ کی روایت استاذی اسلوب احمد انصاری نے اپنے مجلّے نقد و نظر کے صفحات سے شروع کی۔ غزل تنقید جس میں ولی سے عرفان صدیقی تک سو سے زیادہ غزلوں کا تجزیہ شامل ہے، پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور ان کے رفقاء کا مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ نظم تنقید میں میرا جی یہ کارنامہ بہت پہلے انجام دے چکے تھے۔

''بٹوارہ''

وہ اس وقت تک یقیناً غیر جانب دار تھا جب وہ اپنے مشن پر وہاں پہنچا، اُس نے اُس سرزمین پر کبھی قدم نہ رکھے تھے جس کے بٹوارے کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ انسانوں کے دو گروہ جو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے، جن کے کھانے الگ تھے اور جن کے خدا بھی ایک دوسرے سے بیزار وقت، اُس سے لندن میں کہا گیا تھا، کم ہے، بہت کم، اور۔

باہمی مفاہمت یا منطقی استدلال کے لیے اب کوئی موقع نہیں ہے۔

بٹوارے کے علاوہ مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے

وائس رائے کا خیال ہے، جیسا کہ اس کے خط سے ظاہر ہے،

کہ تم اُس سے جتنا کم ملو گے اتنا ہی اچھا ہے،

لہٰذا ہم نے تمہارے لیے علیحدہ رہائش کا انتظام کیا ہے

ہم نے تمہاری مدد کے لیے چار ججوں کا تقرر کیا ہے، دو مسلم اور دو ہندو

جن سے تم مشورہ کر سکتے ہو، لیکن آخری فیصلہ تمہارا ہو گا۔

ایک اکیلے بنگلے میں بند، جہاں رات دن پولس کا پہرہ ہو گا

اور چمن کی گشت بھی تا کہ کوئی سر پھرا قاتل اُدھر بھٹکنے نہ پائے

اس ماحول میں وہ اپنے کام پر جُٹ گیا تا کہ کروڑوں کی

تقدیر کا فیصلہ کرے،

نقشے جو اس کے سامنے رکھے گئے پُرانے تھے،

اور مردم شماری کے آنکڑے یقینی طور پر مشکوک،

لیکن ان کی توثیق کی کوئی صورت نہ تھی، نہ ہی معائنے کا وقت تھا،

اُن آبادیوں کا جو نزاعی تھیں،

سخت اور گرم موسم

اور پیچش کے باعث دو ٹانگوں پر سوار دو ٹانگوں پر سوار تھا

رہنے کے باوجود سات ہفتوں میں سب کچھ ہو گیا
سرحدیں طے کر دی گئیں۔
ایک برّ اعظم کا بٹوارہ ہو گیا، اچھا یا بُرا
اگلے دن وہ انگلستان کے لیے روانہ ہو گیا،
جہاں وہ جلد ہی سب کچھ بھول گیا،
جیسے ایک اچھا وکیل فیصل ہوئے مقدمے کو بھول جاتا ہے
وہ کبھی واپس نہیں آئے گا
اس خوف سے، جیسا کہ اس نے اپنے کلب میں بتایا،

Partition

Unbiased at least he was when he arrived on his mission,
Having never set eyes on this land he was called to partition
Between two peoples fanatically at odds,
With their different diets and incompatible gods.
"Time," they had briefed him in London, "is short. It's too late
For mutual reconciliation of rational debate:
The only solution now lies in separation.
The Viceroy thinks, as you will see from his letter,
That the less you are seen in his company the better,
So we've arranged to provide you with other accommodation.

We can give you for Judges, two Muslem and two Hindu,
To consult with, but the final decision must rest with you."

Shut up in a lonely mansion, with police night and day
Patrolling the gardens to keep assassins away,
He got down to work, to the task of settling the fate
Of millions. The maps at his disposal were out of date
And the Census Returns almost certainly incorrect,
But there was no time to chek them, no time to inspect
Contested areas. The weather was frightfully hot,
And a bout of dysentery kept him constantly on the trot,
But in seven weeks it was done, the frontiers decided,
A continent for better or wrose divided.

The next day he sailed for England, where he quickly forgot
The case, as a good lawyer must. Return he would not,
Afraid, as he told his Club, that he might get shot.

City without Walls - 1967

●

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

ادبی متن کے پڑھنے کا عمل دوسروں کے حوالے سے اپنے آپ کو دریافت کرنے کا، یا بسا اوقات خود اپنی شخصیت کی بازیافت کا عمل ہوتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی ایک نظم ''ذاتیات'' میں کچھ اسی نوع کے تجربے سے روبرو ہونے کی کوشش کی ہے... میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں — داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں ۔ جہاں جہاں سرگزشت میری ہے — ایسی سطروں کو، میں مٹاتا ہوں — روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں — مجھ کو لگتا ہے، لوگ ان کو اگر پڑھیں گے — تو راہ چلتے میں ٹوک کر، مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے .....

میں روز بہ روز اس بات کا قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ فی نفسہ ادب لکھنا اصل میں اپنی آپ بیتی لکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہم شاعری کریں، فکشن لکھیں، حتیٰ کہ تنقیدی تحریریں لکھیں، کبھی کھلے عام اور کبھی چور دروازے سے لکھنے والا کسی نہ کسی روپ میں اپنی تحریر کی اوٹ سے جھانکتا ہوا دکھائی ضرور دیتا ہے۔ عین اسی طرح ادب کو پڑھنا اکثر، دل و دماغ کی تسکین کا ذریعہ، اپنی شناخت کا زینہ، اور اپنے بکھراؤ کو سمیٹنے کا وسیلہ بن جایا کرتا ہے۔ ہمارے ادبی معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو کبھی کوئی تحریر نہ مخلّع بالطبع ہو کر پڑھ پاتے ہیں اور لکھ تو بالکل ہی نہیں پاتے۔ ایسے ویسوں کا تو ذکر ہی کیا، ایسے نمائندہ ترین ادبی اشخاص جو بقول غالب ,اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو، آگہی گر

مصنف کا عنوان: بدمذاقی کا شعور، اور ذوق سلیم کا لمبا سفر

نہیں، غفلت ہی سہی، کے دعوے دار ہوتے ہیں، ایسے لوگوں تک کی، اپنے آپ سے ملاقات شاذ و نادر ہی ہو پاتی ہے۔ جہاں تک ''آگہی'' کے مقابلے میں ''غفلت'' کی بات ہے تو ایسی غفلت تو بڑے نصیبے کی بات ہے۔ اس لیے کہ اسی غفلت کی بدولت ایک شخص تمام مروّجہ تصورات اور نظریاتی فیشن سے بلند اور ماورا ہونے کا دعوے دار ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ہمیں اوروں سے کیا لینا دینا، جب اپنے آپ کو ٹٹولنے اور خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کے سفر پر نکلا ہوں تو بقول انتظار حسین، دوسروں کے ذکر سے اپنا راستہ کھوٹا کیوں کروں؟۔ ایسے لوگ تو کہیں کسی بھی مرحلے پر میرا راستہ بھی نہیں روکتے۔ ہاں، ایسے لوگ میرا راستہ ضرور روکتے ہیں جو اپنے ذوق پر کلیتاً انحصار کرتے ہیں اور اپنے ذوق کو سنوارنے اور نکھارنے کی عملی تدبیریں بھی کیا کرتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی ان کو بھی بعض ایسے تنقیدی تصورات کا سہارا لینا پڑتا ہے جو ادب کی تحسین تو تحسین، تفہیم تک کے لیے ناگزیر سے بن کر رہ گئے ہیں۔ مگر اس عالم میں معدودے چند باذوق افراد ایسے بھی ہیں جو تنقیدی نظریات اور تصورات کی مدد سے اپنے ذوق کی توثیق یا تردید کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اور مسلسل اپنے آپ کو جانچنے اور پرکھنے کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔

شعر و ادب سے میرے رشتے کی نوعیت شروع سے ہی کچھ عجیب اور عام تجربے سے مختلف رہی۔ میں نے اس زمانے میں اُردو ادب میں دل چسپی لینا شروع کر دی تھی جب ع کہ مجنوں لاف الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر۔ یعنی جب میرے ہم سبق اور ہم نشیں، محض اپنی درسی کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے تھے۔ میں تب بھی ادب کا گرویدہ تھا، جب میں حدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، مجھے اس زمانے میں ہی ادب کا چسکا لگ چکا تھا جب مدرسے کی مخصوص مذہبی اور اخلاقی کتابیں میرے زیرِ مطالعہ رہا کرتی تھیں۔ ابتداء میں فارسی اور عربی ادبیات کے شہ پارے، بیان کی لذت اور ترسیل کی کثیر الجہتی کی بدولت میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا کرتے تھے۔ مقامات حریری، میں ابو زید سروجی کا کردار ہو، نفحۃ الیمن کی حکایتوں میں

شعری بلاغت کے لمحات ہوں، سعدی شیرازی کے بیان کردہ خود ساختہ قصوں میں عربی یا فارسی کے بلیغ اشعار کا استعمال ہو، یا جلال الدین رومی کی مثنوی کا بین السطور ہو۔ میں نے شاید ہر ادبی متن میں متن سے کہیں زیادہ ماورائے متن کچھ ڈھونڈھنے کی کوشش کی اور عرفِ عام میں سطور سے زیادہ بین السطور پر نگاہیں جمائے رکھی ہیں — ادب کے مطالعے کے سارے محرکات ہر زمانے اور ہر صورت حال میں محض ادبی نہیں ہوا کرتے۔ چنانچہ رومی کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت کچھ اس قسم کی رہی ہے۔ اوّل اوّل تو مثنوی کی دلچسپ حکایتوں سے مجھے دلچسپی محسوس ہوئی۔ مثنوی معنوی میں ممکن ہے بعض واقعات سچّے اور حقیقی ہوں مگر بیش تر مقامات پر خود ساختہ قصوں کی بنیاد پر اخلاقی تعلیم اور موعظت کے اسلوب کو زیادہ سے زیادہ پُر لطف اور پُر کشش بنایا گیا ہے۔ اس مثنوی میں بعض واقعات بہت اخلاقی نوعیت کے ہیں اور بسا اوقات بادی النظر میں ناگفتہ بہہ، اور عام معنوں میں نیم فحش واقعات کا بھی، رومی سہارا لیتے ہیں۔ مگر واقعات اور اپنے حکائی اسلوب کو وہ محض وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، مگر ان سے وہ جو نتائج اخذ کرتے ہیں، ان سے حواس ظاہرہ کے ساتھ ساتھ ذہن اور روح تک کی سرشاری کا سامان بہم پہنچا دیتے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک ایسا سبق تھا جو ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ امتداد وقت کے ساتھ رومی کی مثنوی کی معنویت روز بہ روز زیادہ روشن اور دور رس نتائج کی حامل نظر آنے لگی۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہو کہ مثنوی معنوی صرف ایک بار پڑھ لینے کی چیز نہیں، مسلسل پڑھے جانے اور اپنے ساتھ زندگی گزارنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ رومی کے ساتھ میرا معاملہ ہر مرحلے پر کچھ ایسا ہی رہا ہے۔

اُردو شعر و ادب سے میرے معاملے کی نوعیت اس پس منظر کے بغیر واضح نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ میری دلچسپی اُردو شاعری سے زیادہ، اور نثر سے قدرے کم، بہت ابتداء میں قائم ہو گئی تھی۔ جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی اور مجاز لکھنوی کی شاعری سے میری شناسائی لڑکپن میں ہو چکی تھی۔ ان میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے کلام کا معتد بہ حصّہ مجھے از بر یاد نہ رہا ہو۔ اپنے ہم

نشینوں کو اس نوع کی غزلیں اور لمبی لمبی نظمیں سُناتے رہنے اور اپنے تاثر میں شریک کرتے رہنے کے عمل میں اس یادداشت میں پختگی آتی رہی۔ پھر چند برسوں بعد ایسے دن بھی آئے جب ان شاعروں کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور بلند آہنگی مجھے بے اطمینانی کے تجربے سے دوچار کرنے لگی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ذوق کی تبدیلی کے اس عمل میں شاعری کے بہت سے اسالیب سے بخوبی آشنا ہو گیا اور شعر کے فوری تاثر اور دیرپا اثر کے مابین تفریق قائم کرنے کا شعور بھی سر اُٹھانے لگا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ ایک طویل عرصہ اُردو ادب کی رفاقت میں گزرنے کے بعد میرا ادبی مذاق کچھ نکھرا بھی یا نہیں؟ مگر یہ ضرور ہوا کہ میرے ادبی ذوق نے قابلِ اعتبار تنقید نگاروں کے حوالے میں آئے ہوئے اشعار تک پر شک کرنا سیکھ لیا۔ یہ وہ ذہنی اور ذوقی سفر ہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اپنے ذوقِ سلیم پر سوالیہ نشان قائم کرنے اور اپنے مزعومات پر نظرِ ثانی کا سلسلہ خاصا پہلے شروع ہو گیا تھا۔ میں نے جامعہ ملیہ کے اسکول میں اور علی گڑھ میں بی۔اے کی طالب علمی کے زمانے میں درسی طور پر اُردو ادب برائے نام ہی پڑھا تھا۔ گریجویشن میں فلسفہ، سیاسیات اور عربی جیسے سبجکٹ پڑھے تھے۔ چوں کہ بی۔اے کی طالب علمی کے زمانے میں مجھے بڑا وقت ملتا تھا، اس لیے میں نے اس وافر وقت کو رائیگاں کرنے کے بجائے بیش تر وقت مولانا آزاد لائبریری کے اُردو سیکشن میں گزار دیا۔ وہاں میں نے نمائندہ ادبی رسائل کی فائلوں تک رسائی حاصل کر لی اور نگار، نیرنگِ خیال، نیا دور، اور نقوش کے اکثر پُرانے شمارے پڑھ ڈالے اور اپنی دانست میں ماضی قریب کے ادبی مباحث سے خاصی واقفیت حاصل کر لی۔ منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر سے لے کر سریندر پرکاش تک کا فکشن، میں نے اسی زمانے میں پڑھا اور اس لیے بڑے انہماک سے پڑھا کہ میں اس وقت تک محض خطِ مستقیم پر چلنے والے حکائی انداز سے واقف تھا جس سے میری ملاقات پریم چند، عبدالحلیم شرر اور ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں کی بدولت قدرے پہلے سے رہ چکی تھی۔ نیا فکشن میرے لیے خاصا مختلف تھا اور اس میں بیانِ واقعہ سے کہیں زیادہ اندازِ بیان کا تنوع نظر آتا تھا۔ میں اگر اپنی یادداشت کو

کھنگالوں تو کہہ سکتا ہوں کہ شاید اس زمانے میں افسانوں کے دو مجموعے، سریندر پرکاش کا ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' اور اقبال مجید کا ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' چھپ کر آئے تھے۔ میں نے جب یہ دونوں کتابیں پڑھیں تو ان میں شامل کئی کہانیاں میرے سر کے اُوپر سے گزر گئیں مگر ان کا سحر اور بیانیہ کی قوت نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار سا کرلیا۔ اس لیے اس نوع کی ناقابلِ فہم کہانیاں بھی بار بار پڑھتا اور ہر اگلی قرأت، مجھ پر کہانی کے کچھ نئے گوشے روشن کردیا کرتی۔ شاعری سے میری ذہنی مناسبت اس وقت سے ہی ہوگئی تھی جب میں نے موزونیت کے معنی سمجھنے شروع کردیے تھے۔ شعری آہنگ صرف مطالعہ کے دوران ہی نہیں، بعد میں بھی، جب بہ ظاہر خالی الذہن ہوا کرتا، میرے ذہن میں گونج پیدا کرتا رہتا۔ بہت سی غزلیں اور نظمیں، مجھے پوری طرح یاد بھی نہیں ہوتیں، جب بھی ان کا آہنگ دیر تک میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے رہتا۔

اپنے لڑکپن کا ایک ناکام تجربہ اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اپنے ماموں کی کتابوں کی دوکان پر میں نے پہلی بار 'دیوانِ غالب' دیکھا تو مارے شوق کے ان سے ادھار مانگ لایا۔ اس وقت میری عمر مشکل سے بارہ یا تیرہ برس رہی ہوگی۔ میں نے چوں کہ غالب کا نام بہت سُن رکھا تھا، پورا دیوان ایک نشست میں پڑھ گیا۔ اس میں میرے لیے کشش کا سامان کچھ نہ کچھ ضرور تھا، لیکن اس کا بڑا حصّہ میری گرفت سے باہر تھا۔ تاہم میرا پہلا تاثر حیرانی کا تھا۔ سوچتا کہ کیا یہ وہی شاعر ہے جس کا نام میں نے بہت سُن رکھا تھا اور جو بہت بڑا شاعر تصور کیا جاتا تھا۔ مگر یہ احساس بھی ہوا کہ میں نے جلد بازی میں یہ شاعری پڑھ لی ہے۔ اس دیوان میں کچھ نہ کچھ جادوگری کا عنصر بھی شامل تھا جو بغیر سمجھے ہوئے بھی اپنی طرف کھینچتا تھا۔ دو چار روز بعد میں نے دیوانِ غالب خرید لیا اور اس کی رفاقت میں ایک نئے تجربے سے دوچار ہونے لگا۔ چند سال بعد جب میں دیوبند میں زیرِ تعلیم تھا، تو اس وقت کے اعلیٰ ادبی مذاق رکھنے والے استاذِ ادب اور آج کے شیخ الحدیث، مولانا انظر شاہ کاشمیری سے میں نے اپنی اس مشکل کا ذکر

کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے مجھے 'تزکِ جہانگیری' پڑھنے کا مشورہ دیا تھا اور میں نے بمشکل تمام اس تزک کو پڑھ ڈالا تھا اور ایک مغل شہنشاہ کی نظر سے دُنیا کو دیکھنے کا تجربہ کر چکا تھا۔ انھوں نے ازراہِ عنایت خود پیش کش کی کہ ''میں تمھیں مرزا غالب کی دس بیس غزلیں سمجھاؤں گا۔ اگر تم نے ان غزلوں کو ٹھیک سے سمجھ لیا تو اُردو کا ہر شاعر تمہارے لیے قابلِ فہم بن جائے گا۔'' چنانچہ میں نے ان سے غالب کی متعدد غزلیں پڑھ ڈالیں تو گویا ایسا لگا کہ شاعری میں اسالیب اظہار کے اَن گنت انداز اور معمولی سے معمولی بات کو شاعری کی سطحِ مرتفع تک پہنچانے کی بہت سی ترکیبیں مجھ پر روشن ہوگئیں۔ انھوں نے غالب کو عہدِ غالب کے مروّجہ علوم بالخصوص منطق و فلسفہ اور تصوّف کے حوالے سے پڑھوایا تھا اور اس طرح ایک نئے غالب سے میرا تعارف کرایا تھا۔ بہت بعد میں جب میں نے جیلانی کامران کا کتابچہ ''غالب کا تہذیبی پس منظر'' پڑھا تو اس پس منظر اور حوالے کی معنویت مجھ پر کچھ اور آشکار ہوئی — پھر ایسا ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ شعری اظہار کے سارے تکلیفی انداز اور پلپلی جذباتیت کے نقائص مجھ پر واضح ہونے لگے۔ میں شعر و ادب سے اپنے شغف اور ذہنی سفر کی اس روداد کو آج تو کسی حد تک الفاظ کا پیرایہ دے بھی سکتا ہوں، اس زمانے میں ذوق کی اس تبدیلی کو محسوس تو ضرور کرتا تھا مگر نہ بیان کر سکتا تھا اور نہ لکھ سکتا تھا۔ علی گڑھ میں ایم.اے کی تعلیم کے دوران، میں باقاعدہ ادب کا طالب علم بن چکا تھا۔ ضابطے کی تکمیل کے طور پر میں نے ایم.اے کے نصاب میں شامل ہر دلچسپ اور غیر دلچسپ تحریر کو کسی حد تک اساتذہ سے اور بڑی حد تک اپنے آپ پڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ نصابات کی تشکیل میں محض خانہ پُری کے لیے بھی جو اصناف شامل کر لی جاتی ہیں وہ بھی کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ ادبی ذوق کی نشو و نما اور ادب کے استاذ کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر طرح کی قرأت کسی نہ کسی مرحلے پر کارآمد ضرور بن جاتی ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے بعد میں اس موازنے سے بھی ہوا کہ میرے بعض ایسے رفقا، جن کو ہماری طرح کسی بڑی یونیورسٹی کے جامع نصابِ تعلیم سے سابقہ نہیں پڑا تھا،

ان کو دیکھتا کہ ان کی ادبی تفہیم کے کتنے گوشے خالی رہ گئے ہیں۔ وہ تدریس کے فرائض سے کماحقہ عہدہ برآ ہونا تو کیا، نصابی کمیٹیوں اور ایک مکمل نصابِ تعلیم کی تشکیل میں کیسے کیسے غچے کھاتے رہتے ہیں۔

ادب پڑھنے کے مختلف مراحل میں، میں ایک ایسے مرحلے سے بھی گزرا ہوں، جہاں اچھے اور بُرے اور اعلیٰ اور ادنیٰ، ہر طرح کے ادب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میں مختلف اوقات میں ایک سے زیادہ ادبی رسائل کی ادارت سے وابستہ رہ چکا ہوں، اس لیے میں نے ایسی تحریریں بھی کثرت سے پڑھی ہیں جن کو ایک اچھے اور معیاری رسالے میں شائع کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے لینے پڑتے ہیں۔ میں نے اپنے رسالوں میں بہت سی غیر معیاری تحریریں بھی یقیناً شائع کی ہوں گی، لیکن میں نے اس مرحلے میں متعدد ہونہار نوجوان شاعروں اور افسانہ نگاروں کو دریافت بھی کیا، اور جب بعد کے برسوں میں ایسے نوجوانوں کو دیکھتے ہی دیکھتے سربرآوردہ ادیبوں میں شامل ہوتے دیکھا تو میری چھوٹی سی انا کو بھی تسکین پہنچی اور اپنی بدمذاقی پر سے میرا اعتماد بھی کم ہوتا گیا۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ گذشتہ دس پندرہ برسوں میں میری ادبی قرأت کے انداز میں پُرانی سیمابیت کے بجائے ایک قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے، تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

اس صورت حال میں، میں نے بہت جغادری نقادوں اور ادیبوں کے ادبی ذوق پر بھی شک کرنا سیکھ لیا ہے۔ کسی بھی نقاد کی بنائی ہوئی کوئی فہرست خواہ وہ شاعروں کی ہو، افسانہ نگاروں کی یا نقادوں کی، ان کو چھان پھٹک کر، دیکھنا اور مشکل سے قبول کرنا، میرے رویّوں میں شامل ہو گیا۔ ایک لمبے عرصے تک ادب سے سچی وابستگی اور مشرق و مغرب کے ادبی تصورات نے اچھے اور بہت اچھے ادب کے درمیان مجھے فرق کرنا سکھایا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ اندازہ بھی ہوا کہ ادب، خلا میں اپنا وجود نہیں رکھتا۔ اس علمی اختصاص کے دور میں شاید ادب ہی وہ ڈسپلن ہے جس میں کبھی لکھنے والے کی ذات کا مطالعہ اہم ہو جاتا ہے، کبھی ادب میں اس ثقافت کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے

جس ثقافت کا نچوڑ ادب میں آجاتا ہے، کبھی سماج، کبھی جنس، کبھی محض قاری کا جمالیاتی حظ اور کبھی کبھی قاری پر مرتب ہونے والے تاثرات، ادبی تفہیم وتنقید کا حوالہ بن جاتے ہیں۔ شاید ان ہی بنیادوں پر ادبی اور تنقیدی نظریات کے ڈانڈے کبھی نفسیات سے، کبھی سماجیات سے، کبھی عمرانیات سے، کبھی ثقافت سے اور کبھی جمالیات سے جا ملتے ہیں۔ نظریاتی شیرازہ بندی کے دوران اسی باعث ہم کسی خاص طرح کے ادبی اظہار کو تنقیدی دبستانوں میں تقسیم کر کے دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن معاملہ خواہ تنقیدی دبستان کا ہو یا نظریے کے حوالے سے ادب کے مطالعے کا، شعر و ادب کے خالص اور بے لوث مطالعے میں طرح طرح کی رُکاوٹیں بھی پیدا کرتا ہے۔ ادبی تفہیم، تنقید کی سطح پر آ کر تو یقیناً بعض خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے مگر قرأت کا خلوص اور متن کی لذت اپنا بدل آپ ہوتی ہے۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ میں نے یقیناً ادب پارے کے مطالعے میں نظریاتی ترجیحات کو بھی اہمیت دی ہوگی، مگر مطالعہ کی حد تک میں نے دانستہ طور پر اس اندازِ مطالعہ سے اکثر دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ میں لکھنے کے معاملے میں بھی اس طریقے پر کاربند رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں کہ اگر مخصوص ادب اپنے غالب رجحان کی بناء پر کسی خاص نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے تو اسی طریق کار کو استعمال کر کے اس ادب کے افہام و تفہیم کو ترجیح دی جائے۔ مختلف تنقیدی نظریات، میرے مطالعے کا خاص موضوع اور میری دلچسپی کا محور رہے ہیں۔ میں نے مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات کو اپنی بساط بھر خاصے ارتکاز اور توجہ سے پڑھا اور سمجھا ضرور ہے، مگر کسی بھی نظریے کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کا رویہ کبھی نہیں اپنایا۔ ادب کو ادب کی سطح پر پڑھنے کے دوران کسی نظریے کی بالادستی نے مجھے اپنے تابع نہیں رکھا۔ کوئی بھی ادب پارہ اسی وقت میری ترجیحات میں شامل ہو پاتا ہے جب وہ بحیثیت مجموعی نظریاتی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر اپنی قدر و قیمت منوانے کے قابل ہوتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُردو میں ترقی پسندی سے جدیدیت اور جدیدیت سے مابعد جدیدیت

تک کے رجحانات اپنی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے سبب ادبی فیشن بنتے اور مسترد ہوتے رہے۔ کسی خاص وقت میں کسی مخصوص رجحان نے اتنی مقبولیت حاصل کرلی کہ اس کی نمائندگی کے بغیر ادب پارے کا اعتبار قائم ہونا مشکل نظر آنے لگا۔ میں نے بعض تصورات کی بالادستی اور بعض تنقیدی ترجیحات کے فیشن بن جانے کے زمانے میں بھی، کسی مخصوص ادبی میلان کو من و عن تسلیم کیا ہے اور آنکھ نہ بند کر کے کسی مخصوص طریق مطالعہ کو واحد تفہیمی یا تنقیدی طریق کار کا درجہ دیا ہے۔ میں ہر طرح کے زاویۂ نظر سے باخبر ضرور رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ کسی نئے تصورِ ادب سے آنکھیں چُرانا اور اپنے زاویۂ نظر پر اصرار کرنا، جہل اور عدم واقفیت پر مستقل مزاجی سے اصرار کرنے سے مختلف نہیں۔ ادبی متن کی تفہیم میں اگر کوئی نقطۂ نظر اور ادبی تصور، تفہیم کے کسی نئے زاویے کا اضافہ کر دیتا ہے تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس لیے نظریاتی یلغار کے عہد میں اگر اپنے ادب کی روایت اور اس روایت کے رد و قبول پر مبنی تسلسل کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ کسی بھی زبان کا ادب تقابل اور آفاقیت کے عہد میں ایک الگ جزیرہ بن کر کوئی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا۔ جہاں تک ادبی فکر کے ارتقا کا سوال ہے تو مختلف فکری دھارے اپنے آپ ہر زبان کے ادب میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور باہمی لین دین کے نتیجے میں اسالیب اظہار میں اس طرح تبدیلی ہوتی رہتی ہے کہ آپ کو اندازہ بھی نہیں ہوتا اور عالمی سطح کے اسالیب آپ کے شعر و ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یعنی آپ کا ادب اندر اور باہر سے ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے، مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کی روح، اس کی روایت اور اس کی بنیادیں کبھی تبدیل نہیں ہوتیں۔ جس طرح نئے ادب کو پُرانے زاویۂ نظر سے پڑھنے اور پرکھنے کا سلسلہ برسوں سے قائم ہے عین اسی طرح پُرانا ادب نئے سے نئے زاویۂ نظر سے دیکھا اور پڑھا بھی جا سکتا ہے اور پرکھا بھی۔

ایک تنقید نگار، کس حد تک خالص قاری کے فرائض انجام دے سکتا ہے؟ بہت حتمی انداز میں اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ نظریاتی بیساکھیوں کی بات کو

بالائے طاق رکھ کر بھی بات کی جائے جب بھی ادبی ذوق کے ارتقاء میں نظریات اور تصورات سے بھی مدد ملتی ہے اور ان کے وسیلے سے ذوق وشعور کی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک تربیت یافتہ قاری کے صرف شعور کیا تحت الشعور تک میں فنی اور ادبی تدابیر سے پیدا کی جانے والی حسن کاری اور جمالیاتی وسائل کے شامل ہوتے رہنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس لیے کسی خاص تنقیدی نقطۂ نظر کو متن کی قرأت میں حائل نہ ہونے دینے کے باوجود تخلیق کار کی ہنرمندیاں، اس کا رچاؤ اور کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہہ دینے کا انداز، متن کے بالغ نظر قاری کے لطف و انبساط میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا دائرہ کار متن کی عام قرأت سے آگے بڑھ کر فنی اور فکری مضمرات تک جا پہنچتا ہے اور بالآخر ایک تربیت یافتہ قاری، فنی تدبیر کاری کو اپنے غور وخوض کا محور بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ترسیل معنی کے سارے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔

عادت میں تبدیل ہو جانے کے باوجود آج بھی شعروادب کا مطالعہ میرے لیے ذہنی ارتکاز اور ادبی خشوع وخضوع کا حصہ ہے۔ مجھے اگر دعوئ برائے دعوئ کرنا ہو تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نظریاتی یا تنقیدی بیساکھیوں کے بغیر ادب پڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ مگر شاید یہ پوری صداقت نہ ہو۔ میرے ذوق اور زاویۂ نظر میں متعدد ادبی تصورات اور فنی محاسن کے عناصر آہستہ آہستہ شامل ہو چکے ہیں۔ ادب کو ادب بنانے والی اور ادبی حسن میں اضافہ کرنے والی فنی تدبیروں پر میری نگاہ چاہے نہ چاہے بھی مرکوز ہو جایا کرتی ہے۔ اس لیے قاری محض کا کردار اور متن کے مطالعے کی وہ لذتِ حسن سے ایک عام، مگر تربیت یافتہ قاری (اگر نقاد نہیں ہے تو) دوچار ہو سکتا ہے، میرے نصیب میں صرف ازخود رفتگی کے عالم میں ہی آپاتی ہے۔ اُردو ادب پڑھنے اور لکھنے والوں کے روز افزوں سمٹتے ہوئے ماحول میں قاری اور تنقید نگار کے مابین بال برابر فرق رہ گیا ہے۔ ایک عام قاری، اچھا اور باذوق قاری بنا نہیں کہ وہ نقاد کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر مجھے ترجیحی طور پر اپنے رول کا تعین کرنا پڑے تو بلا تکلف ایک اچھے اور

تربیت یافتہ قاری کے زمرے میں خود کو شامل کرنا پسند کروں گا۔ رہی تنقید لکھنے کی بات، تو میری ساری تنقیدی نگارشات کو تنقید کے بجائے ایک باذوق قاری کے ردعمل کا نام بھی دے دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس لیے کہ متن کی قرأت آج بھی مجھے جس انبساط اور بہت کچھ پا لینے کے تجربے سے دوچار کرتی ہے اس تجربے سے نہ تو تنقیدی نظریات دوچار کرتے ہیں اور نہ معمولات میں شامل کوئی اور سرگرمی۔ Ethics کے عالموں کے درمیان مغربی فلسفے میں عرصے تک Samambonam یا Highest Pleasure کی بحث جاری رہی۔ اگر یہی سوال مجھ سے دریافت کیا جائے تو میں اس کے علاوہ کوئی اور جواب مشکل سے دے سکتا ہوں کہ میری سب سے بڑی سرشاری (Highest Pleasure) اعلیٰ درجے کی ادبی تحریروں کے مطالعہ کے علاوہ کچھ اور نہیں، اور اتفاق سے یہی میری سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ بھی ہے۔

●

نفسیات کا علم بڑی حد تک تخفیفی (Reductionist) اور قیاسی (Speculative) لگتا ہے۔ تخفیفی اس لئے کہ انسانوں کے درمیان بے مثال تنوع کو نظر انداز کر کے، نفسیات کا علم ان کے متعلق وہ آفاقی اصول قائم کرتا ہے، جس کی جتنے افراد کے حوالے سے تصدیق ہوتی ہے، اس سے زیادہ لوگوں کے حوالے سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اربوں لوگوں کی اس دنیا میں کوئی دو لوگ بھی ایک دوسرے جیسے نہیں ہوتے نہ ان کے چہرے نہ ان کی طبیعتیں نہ ان کا ذہن۔ اس لئے انسانوں کے متعلق جو بھی اصول بنائے جائیں گے وہ لازماً تخفیفی ہوں گے۔ قیاسی (Speculative) اس لئے کہ ایک ادیب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے نفسیات کے استاد سے پوچھ لیا تھا کہ دماغ کے کس حصہ میں ''لاشعور'' واقع ہے تو بیچارے استاد طالب علم کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ لاشعور ابھی تازہ تازہ چلن میں آیا تھا۔ فرائڈ کی شہرت اس وقت آسمان چھو رہی تھی جب Joyce کی Ulysis کے ابواب شائع ہو رہے تھے۔ اور Joyce کی بچی شدید Depression میں مبتلا تھی۔ Joyce نے اپنی بچی کو علاج کے لئے فرائڈ کے پاس بھیجا۔ بیٹی ٹھیک نہیں ہو سکی۔ شاید لاشعور کے موجد فرائڈ کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ لاشعور کہاں واقع ہے؟

اس لئے کسی رجحان کو Theorize کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے۔ اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی جائے کو نویں درجہ میں اختیاری مضمون

سائنس لینے اور اردو نہ جاننے کے باوجود ایک طالب علم آخر کیسے اردو شاعری کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ کیوں بارہویں تک پہنچتے پہنچتے اسکول میں ادب اور سماجی علوم کے اساتذہ کی توجہ اور شفقت سائنس کے اس طالب علم پر بڑھتی چلی گئی، جس نے ابھی ابھی چھوٹے چھوٹے بازاری ناولوں سے اردو پڑھنا سیکھا تھا۔

ان فضول سے ناولوں میں بہت معمولی واقعات اور بیان سادہ ہوتا مگر خدا معلوم ان میں کیا بات تھی کہ ذہن میں ان قصوں کے کردار بالکل صاف شکلیں اختیار کر لیتے۔ اب تک یاد ہے کہ ایک مختصر سا ناول کسی غازی صلاح الدین کا بارہویں کلاس میں پڑھا، غالباً عمر کا یا کم فہمی کا نتیجہ تھا کہ وہ ناول جیسے ذہن پر نقش ہو گیا، اور اس کا ایک فقرہ تو اب بھی آپ کو سنا سکتا ہوں۔ اس کا شاہ کردار اپنی محبوبہ کو خط میں لکھتا ہے۔

> ''میں ٹکڑوں میں مر رہا ہوں جب میں کسی کو خدا حافظ کہتا ہوں تو میری ذات کے ایک حصہ کی موت ہو جاتی ہے' لو میں تم کو خدا حافظ کہتا ہوں''۔

گرویدگی کا وہ عالم کہ الہ آباد میں جس کے بال لمبے دیکھے یا کرتا اور جھولا دیکھا، خیال آتا کہ کہیں یہ غازی صلاح الدین نہ ہوں۔ یہ واقعہ ۱۹۶۴ء کا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں چالیس سال بعد غازی صلاح الدین سے اسلام آباد (پاکستان) میں ملاقات ہوئی۔ وہ نوجوان قاری کے خیال میں محفوظ ناول نگار سے بہت مختلف نکلے۔ پاکستان کے بہت مشہور صحافی ہیں۔ اب ان کی عمر ستر سال کے قریب ہے۔ ان کے سفرناموں کا ایک مجموعہ ''میرے دریا، میرے ساحل'' پچھلے دنوں شائع ہوا ہے۔ جب ان کے سامنے مذکورہ جملہ دہرایا تو وہ خوشی اور حیرت سے دیکھتے رہ گئے، اور پھر بہت سادگی سے فرمایا یہ جملہ میرا نہیں' میں نے اس زمانے میں کسی فرانسیسی ناول سے لے کر اس میں لکھ دیا تھا۔

پھر ذہن نے ناولوں سے ایک رشتہ استوار کر لیا۔ کوئی ناول پڑھتا تو پورا ناول فلم کی طرح ذہن کے پردے پر دکھائی دینے لگتا۔ ہادی رسوا کی امراؤ جان اور

Sommerset Maughm کے The Razar's Edge کی Suzanne منٹو کی جانکی، قرۃ العین حیدر کی قمرن، بابر مرزا کا گلاب دین چھٹی رساں اور نہ جانے کتنے کردار اپنے ناک نقشے، لباس اور رہن سہن کے خاص طریقوں کے ساتھ اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔

اب خیال آتا ہے کہ شاید، سائنس کے حفظ کئے جانے والے فارمولوں اور Equation کے مقابلے میں ادب تخیل کو تحریک دینے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہے، لیکن یہ .B.Sc کے ایک نوجوان طالب علم کا تاثر ہے جسے اب اعتماد قدرے بڑھ جانے کے سبب دعوے کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔

تو اس زمانے میں تخیل کو متحرک کرنے کی صلاحیت کے سبب ادب ہمارے لئے کشش کا باعث ہوا۔ پھر شاید ان ناولوں کی رفاقت میں ذہن نے آزاد پھرنے کی عادت بنالی۔ خیال ہی خیال میں کسی سفر پر نکل پڑے۔ جس شہر کے بارے میں پڑھا، اسے تخیل کی آنکھ سے دیکھنے لگے۔ اپنے دوست یا کسی عزیز کے بارے میں سوچنے لگے تو وہ مجسم سامنے آکر بات کرنے لگا۔ کئی مرتبہ راستے میں کسی بزرگ نے ٹوکا ''میاں کس سے باتیں کرتے ہوئے جا رہے ہو''۔ ذہن ایسا آزاد ہوا کہ Chemistry کی Equations یاد کرنا مشکل ہو گئیں بڑی مشکل سے .B.Sc کر سکے۔ مگر جو ذہن کو آوارگی کی لت پڑی، وہ اب جا کر کمزور پڑنا شروع ہوئی ہے۔

ایک فرق اور ہوا۔ پہلے ادب خود ہمارے ذہن کو نئی دنیاؤں کی سیر پر لے جاتا تھا۔ اب ہم ادیب/ شاعر کے تخیل کی پرواز دیکھ کر حیرت زدہ ہوتے ہیں۔ کیسی دنیائیں تشکیل دیتے ہیں یہ تخلیق کار۔ ایک قاری کی حیثیت سے ہمیں ادب میں صداقت/ حقیقت یا زندگی کے عکس و آئینہ وغیرہ سے نہ اس وقت دلچسپی تھی نہ اب ہے۔ اب بھی حیرت ہوتی ہے تو اس پر کہ یہ ناول نگار کیسے ایک بالکل جیتی جاگتی دنیا تشکیل دینے پر قادر ہیں۔ مجھے حقیقت کے مقابلے میں حقیقت کا (illusion) التباس/ واہمہ پر کشش اور زیادہ معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ اس واہمہ کی پشت سے جھانکتی دنیا بھی،

جسے ہمارے سماجی کارکن حقیقت نگاری کی نئی شکل کہتے ہیں، اتنی ہی خیالی معلوم ہوتی ہے جتنی ناول میں تعمیر کیا گیا واہمہ۔ جب اپنے کسی بزرگ اور انتہائی محترم نقاد کے یہاں تخیل کی بے راہ روی وغیرہ کا بیان پڑھتا ہوں تو عجیب لگتا ہے کہ یہ انسان کے کتنے بڑے شرف سے انکار کر رہے ہیں۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ ادب کی حقیقت بھی اسی تخیل کا کارنامہ ہے۔ کسی بھی حقیقت پسند ناول کی پہلی حقیقت' اُس کی تشکیل کا وہ فن ہے جو خود حقیقت یا واقعہ میں نہیں اس کے بیان میں ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا میں ایک ہی نام کے کرداروں کے حوالے سے جو ہندوستان کے تین دور قائم کئے گئے ہیں صرف ان زمانوں کے Description کے ذریعہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے گئے ہیں اس ناول کو پڑھتے ہوئے Susan-Sontag کا قول یاد آتا ہے کہ جب ادب کی زبان بدلتی ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ دنیا بدل گئی ہے۔ ہم نے بنگال کو جیسا آخرِ شب کے ہم سفر میں پڑھ کر دیکھا، ویسا تو وہاں جا کر بھی نہیں دیکھ سکا۔ اور پھر اس ناول میں بنگال کے موسم، اس کی فضا اور اس کے باشندوں کی جذباتی دنیا کا حال پڑھ کر معلوم ہوا کہ سلمان رشدی کی Mid-night's children کا بنگال، کاغذ پر کھینچا گیا ایک بے جان نقشہ ہے، جس کے مصنف کو ہماری عینی آپا کی روئداد نگاری (Description) پر قدرت کا ایک حصہ بھی نہیں ملا۔

تو اب یہی دو خصوصیات ہیں یعنی ادب میں تخیل کی تشکیلی قوت اور بیان کی وہ طاقت جو واہمہ کی سچائی پر پڑھنے والے کے اعتماد کو پختہ کرے، ہمیں سحر زدہ (Fascinate) کرتی ہے۔ ناول اور افسانے میں بھی ناموں اور جگہوں کی خارجی شناخت کے ذریعہ سماجی کارکنوں نے ادب میں حقیقت نگاری وغیرہ کا اتناذ کر کیا کہ بیان کی غیر معمولی قوت اور متن کی تشکیل کا تخلیقی ہنر نظروں سے اوجھل ہو گیا، اور اب صورت یہ ہے کہ ہمارا کوئی نوجوان ناول نگار، خود اپنی دنیا تشکیل دینے پر قادر نظر نہیں آتا۔

کتابوں میں پڑھا ہے کہ کسی عرب شاعر کے بیٹے نے اپنے باپ سے سوال کیا کہ سمندر کیا ہوتا ہے؟ تو باپ نے ایک قصیدہ ایسا کہا جس میں سمندر لہریں لیتا

دکھائی دینے لگا۔ پھر اس واقعہ پر کامیو کی Plague پڑھ کر یقین آیا۔ ناول پڑھئے اور بھول جائیے کہ یہ کسی تصور کی تمثیل ہے پھر دیکھئے کہ وبا کے ظاہر ہونے، پھیلنے اور پھر رفتہ رفتہ اس کا زور کم ہونے کا کیسا نادر آہنگ ہے، جو اس ناول کو اپنے زمانے کے دوسرے ناولوں میں ممتاز کرتا ہے۔

لیکن شاعری کا کیا ہوتا، وہ تو قائم ہی ہوتی ہے متخیلہ کی پرواز پر۔ اقبال نے غالب کی عظمت کے متعلق جو پہلی بات کہی وہ یہی تھی۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

خود غالب بھی اپنے تخیل کی غیر معمولی قوت سے واقف ہیں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

مرزا کے یہاں ایک تو خود خیال نازک، اور پھر کوئی نئی تشبیہ' کوئی غیر معمولی استعارہ، جسے بقول حالی کوئی کوئی شاعر ابداع کرتا ہے' آپ کو گرویدہ کرنے کے لئے کافی ہے!

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

یہ استعارہ کی شکل میں تخیل کی وہ کائنات ہے جس نے ایک متحیر قاری کے گرد حصار کھینچ دیا ہے کہ اب اس سے نکلنا شاید ساری زندگی ممکن نہ ہو۔ غالب کی خیال بندی اور اس کے استعاروں کی ندرت سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تخیل کی یہ پرواز صرف غالب سے مخصوص ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تخیل کی یہی بے مثال قوت ہر شاعر کی تخلیقی سرگرمی کی بنیادی محرک ہے۔ فرق ہے تو اتنا کہ یہ تخیل کسی شاعر کو کھلے آسمانوں کی پرواز

پر لے جاتا ہے اور کسی کو اس کے دل کی دنیا میں اتار دیتا ہے۔ اس لئے غالب کے تحرک کے مقابلے میں میر صاحب کی تخلیقی کائنات میں بے خودی اور آزادی کی وہ کیفیت ہے، کہ اگر آپ کوئلے کی تجارت میں پوری طرح ملوث نہیں ہوئے ہیں تو میر کا کلام جادو کی چھڑی کا اثر رکھتا ہے۔ نہیں معلوم کہ ان اشعار کا آپ پر کیا اثر ہوتا ہے!

ملنے والو پھر ملے گا وہ ہے عالم دیگر میں
میر فقیر کے سکر ہے یعنی، مستی کا عالم ہے اب
کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبت شراب سے آگے سفر کیا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا
میں بھی عاشق ہوں، اپنے مشرب کا
میر کے ہوش کے ہیں ہم قائل
فصل گل جب تلک تھی مست رہا

کیا جذب و بے خودی ہے کہ دانائی اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔ میر کا یہ عاشق ہمیں بہت پرکشش لگتا ہے۔ خستہ، شکستہ مگر حد درجہ پر اعتماد۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ اتنی دربدری اور شکستگی کے باوجود اتنا پر اعتماد عاشق اردو کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں پیدا کیا۔ ہم اپنے اردگرد کی دنیا میں میر کا یہی مرد تلاش کرتے ہیں، اور جہاں اس کا عکس بھی مل جاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ ہم ان سے کہیں پہلے بھی مل چکے ہیں۔ ہمیں ہمارے انسان کا تصور میر کی شاعری نے دیا۔ ہم میر کے عاشق کی طرح دیوانگی کے مرتبہ تک آزاد اور شکستہ مگر پر اعتماد نہیں، لیکن ہم ویسے ہونا چاہتے ہیں۔

تخیل کے علاوہ، قدرت نے انسان کو زبان جیسی دوسری بڑی نعمت سے نوازا، تو ہم نے اسے ایسا پامال کیا کہ اب یہ حساب کی گنتیوں کی طرح بے لچک اور سخت ہوگئی ہے۔ رلکے نے ایک خط میں، انسانوں کے کاروباری رویئے سے سخت نفرت کا اظہار کیا ہے۔ لوگ جب تک ہر شے کی کوئی مادی ضرورت نہ ایجاد کرلیں، انھیں سکون نہیں ملتا۔ یہی ہم

سب نے زبان کے ساتھ کیا۔ یہ ہمارے اپنی روزانہ کی ضرورتیں پوری کرنے کا ذریعہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ ادب میں ابھی چند سال پہلے ترسیل کی ناکامی وغیرہ کی جو بحث چلی، اس میں زبان' ماورائے لسان تجربے کی ترسیل کا ذریعہ ہی تصور کی گئی۔

اب زبان کے طرز وجود پر جو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو زبان کی تخلیقی/تشکیلی قوت پر Common-sense کے پڑے ہوئے پردے اٹھنے لگے ہیں۔ زبان خالق ہے اپنے فاعل (Subject) کی اپنے مفہوم کی اور ارتباط کے ان نامعلوم رشتوں کی' جو کائنات کو اس کی شکل دیتے ہیں۔ ادب کا تو ذکر ہی کیا، اب تو تاریخ بھی اپنی اصل میں افسانے سے قریب تر ہوگئی ہے کہ دونوں کے کردار و واقعات بیان کی گرفت میں آئے بغیر کوئی ''معنی'' نہیں رکھتے۔ ہم کسی طرح شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں رکھتے' لیکن اب پڑھتے اس طرح ہیں کہ اپنی عام زندگی میں ہر طرح ایک عام آدمی' اپنے کلام میں زبان کے نایافت علاقوں کو روشن کرنے کی ایسی غیر معمولی صلاحیت کہاں سے لاتا ہے۔ قاری' شعر کی کائنات میں ایسا گم ہوتا ہے کہ بیچارے مصنف کے ہاتھ سے اس کی انگلی چھوٹ جاتی ہے۔ متن پڑھنا، دریافت کے ایک انتہائی خوش گوار تجربے سے گذرنا ہے۔ قرأت (Reading) شاعر کے تجربے کی تصدیق کا عمل نہیں۔ ایک نئے تجربے کی تشکیل کا عمل ہے۔ ہم ہر نئے یا پرانے متن کی قرأت کے دوران اسی خوش گوار تجربے سے گذرتے ہیں۔ کبھی شعوری طور پر اور کبھی بالکل غیر شعوری طور پر!

یہ تو تخلیقی متون کا معاملہ ہوا۔ ہمیں تو وہ متون بھی، جنھیں تنقید یا فلسفہ کہا جاتا ہے' صرف اپنے اعجاز بیان کے سبب پر کشش معلوم ہوتے ہیں۔ داریدا کو انگریزی ترجمے میں پڑھتا ہوں' کچھ سمجھ میں آتا ہے، زیادہ تر نہیں آتا۔ لیکن ایک مضمون پر پچاس صفحے میں دو جملے بھی ایسے نہیں ملتے جہاں داریدا کا سانس ٹوٹتا ہوا معلوم ہو۔ دلائل اور تجزیئے کی قوت کے علاوہ الفاظ کو ان کی آخری جزئیات تک کھول دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہمیں بہت متاثر کرتی ہے۔ ہمارے نقاد اپنے قاری کی کتنی خوشامد کرتے ہیں۔ پہلے تمہید باندھیں گے' پھر چیٹ پٹے جملے لکھیں گے' پھر مقدمات وہ قائم

کریں گے کہ آپ گویا ان کے لئے پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔ پھر پوری گفتگو کا حاصل یہ نکلے گا کہ دیکھئے ہم وہی کہہ رہے ہیں جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ ایک داریدا ہے کہ وہ اپنی شرطوں پر آپ سے بات کرتا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا Common-sense آپ کے زمانے اور جگہ کا پابند ہے اور کسی بڑے مفکر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اصول کی حد تک متعین عقل عامہ کی آفاقیت سے انکار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو داریدا کو پڑھنا' رومان کی حد تک پہنچی ہوئی استدلال کی غیر معمولی قوت کا مشاہدہ کرنا ہے۔ داریدا کی تقریباً تمام باتیں خود اپنے ذہن کی بے لچک تختی کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے، لیکن اس کی قوت اظہار پر فریفتہ ہیں۔ سنتے ہیں ایک صیہونی سازش کے تحت یہ شخص ہم پر مسلط کیا گیا تو واقعی ہمارے دشمنوں نے ایک طاقت ور آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں اس کے اعتراف میں کوئی تکلف نہ ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ ہم نے یہ سبق یاد نہ کرلیا ہو کہ ہم دانہ نہ چگیں گے، زمیں پر نہیں اتریں گے اور ہم بہلیے کے جال میں نہیں پھنسیں گے۔

تو تنقید اور تخلیق میں زبان ایک ہی طرح عمل نہیں کرتی' دونوں جگہ اس کی کارکردگی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے مگر ہر متن میں کسی نہ کسی طور پر موجود اثر انداز ہونے کی صلاحیت اپنا کام ضرور کر رہی ہوتی ہے۔

بس بحیثیت قاری ہم ادب کی تخیلی کائنات میں داخل ہوتے ہیں تو انسانی فضیلت کے ایک بڑے امتیاز کی حیرت انگیز جلوہ سامانیاں' ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور الفاظ کے ارتباط کا لطیف نظام واپسی کے تمام امکانات ساقط کر دیتا ہے۔ یا اظہار کی وہ ذہنی قوت' جس میں پلک جھپکے بغیر استدلال کو اس کی پوری شدت کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ ہے' اس کی وجاہت ہمیں واپس نہیں آنے دیتی۔

دونوں صورت میں ادب کا مطالعہ ریشم کا وہ بند خول Cocoon ہے جسے ہم اور متن مل کر بنتے ہیں اور پھر اس کی گرم آسائش میں بند ایک محفوظ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

●

جناب شموئل احمد

یہ سوال مشکل ہے کہ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ لیکن یہ سوال زیادہ مشکل ہے کہ ہم ادب کیوں نہیں پڑھتے ؟ جب کہ ادب ذوقِ جمال کی تسکین، تجربے کی تجدید اور فرحت و انبساط سے عبارت ہے۔

اگر جمالیاتی تسکین کے لیے ہم ادب کی طرف مائل ہوتے ہیں تو یہ تسکین گھاس چھیلنے میں بھی ہے۔ ایک شخص اگر اس ترتیب سے گھاس کی کٹائی کرتا ہے کہ خوب صورت روش تیار ہوتی ہے تو اس میں بھی اس کے جمالیات کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ گھاس کا مخملی لمس بھی فرحت بخشتا ہے۔

میں نے بہت ڈھونڈا کہ ادب پڑھنے کے میرے ذاتی اسباب کیا ہیں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں پیشے سے انجینئر ہوں۔ جمالیات کی تسکین مجھے اس وقت بھی ملتی ہے جب کوئی اسٹرکچر یا پائپ نٹ ورک ڈیزائن کرتا ہوں۔ علم نجوم کا مطالعہ بھی مجھے سرور بخشتا ہے۔ دشتِ نجوم کی سیاحی میں جب برج کواکب سے گزرتا ہوں اور ستاروں سے ہم کلام ہوتا ہوں تو کائنات کے اسرار و رموز پر حیرت ہوتی ہے۔ گرچہ یہ اسرار مجھ پر نہیں کھلتے لیکن مجھے مسرّت سے ہم کنار ضرور کرتے ہیں۔ شاید حصول مسرّت کے لیے میں ادب کی طرف رجوع نہیں ہوا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ پیشے کی یکسانیت سے گھبرا کر میں نے ادب میں پناہ لی۔ یکسانیت کا مسئلہ میرے لیے پریشان کن نہیں رہا کہ مختلف علوم انسانیہ میں میری دلچسپی رہی ہے۔ پھر کیا ہے کہ میں ادب پڑھنے پر مجبور ہوا......؟

بہ طور انجینئر میں اپنی داخلیت میں پل پل مرتا رہا ہوں۔ ٹھیکے داروں کا ناجائز مطالبہ، مزدور یونین کی کھچ کھچ بیوروکریٹس کی ناانصافی اور منسٹر کی من مانی نے میری داخلیت میں کئی زخم لگائے۔ میری اخلاقی قدروں کا چہرہ مسخ ہوا اور میں عدم تحفظ کے احساس سے گھر گیا۔ داخلیت کو بچانا ضروری تھا۔ مجھے ادب میں پناہ ملی کہ ادب داخلیت کی بازیافت ہے۔

اصل میں آدمی دو زندگی جیتا ہے۔ ایک وہ جو جینے پر مجبور ہے اور دوسری وہ جو جی نہیں سکا تو داخلیت میں جیتا ہے۔ داخلیت کی دنیا بہت وسیع ہے... بہت عجیب... بہت خوب صورت... یہاں خواب اُگتے ہیں جو خارجی دنیا میں چوری ہو جاتے ہیں۔ خواب آدمی کی سرشت میں ہے اور ان کا چوری ہونا آدمی کے مقدر میں ہے۔ خواب جب چوری ہوتے ہیں تو دل کے مقام میں ننھا سا سوراخ ہو جاتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا ہے۔ میں ادب اس لیے پڑھتا ہوں کہ ان سوراخوں کو بھر سکوں۔ ادب میرے لیے چارہ گر ہے۔

تخلیق کا جذبہ انسان کی سائکی میں ہے لیکن اس کے محرکات کیا ہیں؟ خدا کے محرکات کیا تھے کہ اس نے کائنات کی تعمیر کی۔ شاید اس نے خود کو آشکارا کرنا چاہا۔ یا خود اس کو اپنے وجود کے امکانات کائنات کے مظہر میں نظر آئے۔ ادیب بھی اپنی دنیا کا خالق ہے۔ وہ بھی خلق کرتا ہے۔ اس کے بھی اپنے محرکات ہیں۔ لیکن انسان اپنی ہی تحریر کا اسیر ہوا۔ موت جبر نہیں ہے۔ موت برحق ہے۔ جبر ہے انسان کا تحریری نظام جس کے شکنجے میں فرد بھی ہے اور خدا بھی اور نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ نجات اگر لمحہ موجود میں ہے تو گرفت میں نہیں آتا۔ لمحہ موجود ایک چھلاوہ ہے جو سانس کے زیر و بم کے درمیانی وقفے میں کسی حسن بے پناہ کی طرح پھیلتا ہے اور نگاہوں سے اوجھل

ہو جاتا ہے۔ مجھے نجات چاہیے۔ میں اس لیے بھی ادب پڑھتا ہوں کہ نجات کا راستہ ادب کے آنگن سے گزرتا ہے۔

انسان نے پھول کم کھلائے اور ہتھیار زیادہ بنائے، تہذیبی ارتقا کا راستہ میدان جنگ سے ہو کر گزرا۔ نسلی امتیاز، سیاسی استحصال، فسادات، دہشت گردی اور سماجی بدعنوانیاں دنیا سے کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ ایسے حالات میں انسانی وجود کے امکانات کیا ہیں؟ ایسے امکانات کی بازیافت میرا تجسّس ہے اور یہی میرا کرب ہے جو ادب پڑھنے پر مجبور کرتا ہے اور کسی حد تک لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

بہ طور انجینئر سائنس فکشن سے میری دلچسپی کم رہی۔ لیکن میرے پیشے کا میری تحریر پر اثر ہوا۔ انجینئرنگ ڈیزائن میں اشیا کی کفایت پہلی شرط ہوتی ہے۔ افسانے کے کرافٹ میں میں نے الفاظ کی کفایت شعاری پر زور دیا۔ ادب سے میری دلچسپی بڑھی تو نفسیات نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ انسانی رشتے پیچیدہ ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھنا آسان نہیں ہے۔ نفسیاتی ادب پڑھنے کی میں نے تھوڑی بہت کوشش کی۔ فرائڈ یونگ ہیولاک اور ایس اڈلر وغیرہ کے نظریات سے خود کو واقف کرانے کی جسارت کی۔ روسو کے Confession میں اس کی مسوچیت پسندی کے باب نے مجھے پریشان کیا۔ لیکن کرافٹ ایبنگ نے سائیکو پیتھیا سکسولس میں روسو کی مسوچیت پسندی کا تجزیہ کیا تو مجھے حیرت ہوئی اور نفسیاتی ادب کی افادیت کا احساس ہوا۔ جنس کی نفسیات سے میری دلچسپی بڑھی۔ جنس میرے لیے Taboo نہیں ہے۔ ادب میں مجھے جنس کی جمالیات کی تلاش رہی ہے۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی اندو میں مجھے ایک مکمل عورت نظر آئی، منٹو کی جانکی میں میں نے یونانی متھ کی افروڈیٹ کو دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں ادب کی اپنی اخلاقیات ہے۔ مذہب کی اخلاقیات شاید ادب کی اخلاقیات نہیں ہے۔

میں ادب اس لیے نہیں پڑھتا ہوں کہ خود ادیب ہوں۔ اصل میں میں نے بہت کم پڑھا ہے، اور بہت کم لکھا ہے کہانی لکھنے کے لیے کتابوں سے زیادہ آدمی کو

پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی کا چہرہ ایک کاغذ ہے جس پر اس کی زندگی کی کہانی لکھی ہوتی ہے۔ ادیب اپنی دوررس نگاہوں سے اسے پڑھتا ہے اور صفحہ قرطاس پر پھیلاتا ہے۔ لیکن ہر ادیب کی زندگی میں ایک کہانی ایسی ہوتی ہے جو انولکھی ہے اور ان چھوئی رہتی ہے اور لاشعور کے نہاں خانوں میں چھپی کسی محبوب کی طرح اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ وہاں تک رسائی کے لیے Vision چاہیے۔ ادب کا مطالعہ بصیرت پیدا کرتا ہے۔

میں ادب اس لیے بھی پڑھتا ہوں کہ میں اس ان چھوئی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ سکوں۔

ادب انسانی قدروں کا حامل ہے۔ روئے زمین پر جب کہیں خون بہتا ہے تو وہ آنکھ جس سے آنسو کا پہلا قطرہ ٹپکتا ہے فن کار کی ہوتی ہے بابری مسجد ٹوٹی تو ونود داس نے ایک نظم لکھی۔ شاعر یقین دلانا چاہتا ہے کہ اجودھیا میں کچھ نہیں بگڑا۔ وہاں اب بھی سرجو بہتی ہے اور بندر اسی طرح لنگورے پر اُچھلتے ہیں۔ عورتیں پڑوس سے آٹا مانگ لیتی ہیں اور لوگ راستے میں رک کر بچوں کے امتحان کا نتیجہ پوچھتے ہیں۔ نظم کے آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اجودھیا کے سینے میں ایک زخم بن گیا ہے۔ وہ ڈاکٹر نہیں ہے لیکن اس کے پاس محبت کا پھاہا ہے جو رِستے زخم پر رکھنا چاہتا ہے۔ یہ انسان دوستی کی بہترین نظم ہے۔ سیاست جہاں آدمی کو توڑتی ہے وہاں شاعری آدمی کو جوڑتی ہے۔ نظم احساس دلاتی ہے کہ انسان ابھی مرا نہیں ہے۔ میں ادب اس لیے بھی پڑھتا ہوں کہ اس احساس کو زندہ رکھ سکوں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ انسان ابھی مرا نہیں ہے۔ اس یقین کو مستحکم کرنے کے لیے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

●

جناب پیغام آفاقی

جناب صدر۔ بزرگو اور دوستو!

میں نے اس فیکلٹی لاؤنج میں اس سے پہلے بہت سے سمیناروں میں شرکت کی ہے، لیکن میرے خیال میں آپ کا یہ سمپوزیم ان سب میں جن میں، میں شریک ہوا، سب سے زیادہ اہم ہے۔اس کے بے حد دوررس نتائج مرتب ہوں گے۔ آپ نے ایک نیا موضوع چنا ہے، اس کے لیے میں آپ کو اور قاضی افضال حسین صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میری خود بھی خواہش تھی کہ ہم اس طرح کے سوالات قائم کریں۔

میں ادب کیوں پڑھتا ہوں؟ اس کا بہت واضح جواب یہ ہے کہ میں ادب اپنے ایمان کی آبیاری کے لیے پڑھتا ہوں۔ میں اپنے ایمان کو روشن تر کرنے کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔ ایمان کیا چیز ہے اس کی پہچان کے لیے میں ادب پڑھتا ہوں۔ یہاں میں ایمان کو وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔

جس ادب سے مجھے یہ لگتا ہے کہ وہ کسی غرض سے لکھا گیا ہے، اسے میں نہیں پڑھتا۔ کوئی ایسی تحریر جس میں بے ایمانی جھلکتی ہے، یا بادشاہِ وقت کی خوشامد، بزدلی یا احساس برتری ظاہر ہوتی ہے، اسے میں نہیں پڑھ پاتا۔ رواروی میں لکھی گئی تحریر بھی میں نہیں پڑھتا۔ میں صرف وہی چیزیں پڑھتا ہوں جو میرے ایمان کو مضبوط کرتی ہیں۔

ایمان کا حوالہ میں نے اس لیے دیا کہ میں تفریح کے لیے ادب نہیں پڑھتا۔ میں ''ستیم، شوم، سندرم'' کو حاصل کرنے کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔

شروع میں قاضی افضال حسین صاحب نے ایک بات کہی تھی کہ ''یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ آج لوگ فائدے کے لیے ادب کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ عجب تقاضا ہے کہ جو کام کرو، فائدے کے لیے کرو۔''

میرا کہنا یہ ہے کہ فائدہ اپنے آپ میں غلط نہیں ہے۔ اگر کوئی فائدے کا کام ہو رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ اس کے لیے بہت سے شعبے ہیں۔ لیکن ادب کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔

قدرت کس طرح کام کر رہی ہے، زندگی میں نئی نئی چیزیں کس طرح آ رہی ہیں، یا کیوں آتی ہیں، انسان مختلف سچویشن میں کس طرح گھر جاتا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے، ان باتوں کو سمجھنے کے لیے میں ادب پڑھتا ہوں۔ ناول خاص طور سے اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرے علوم پوری انسانی زندگی کو اس طرح پیش نہیں کرتے، جس طرح ادب کرتا ہے۔ علم نفسیات، طبیعیات، کیمیا —— یہ سب زندگی کے ایک پہلو کو پیش کرتے ہیں، ادب پوری زندگی کے راز سربستہ تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ میں ایسی ہی کتاب پڑھتا ہوں جو کائنات کو سمجھنے میں، خدا کو سمجھنے میں، اپنے آپ کو سمجھنے میں میری مدد کرتی ہے، میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نہیں پڑھتا۔ کتاب پڑھتے وقت اگر مجھے لگتا ہے کہ اس سے میرے ایمان کو کچھ نہیں مل رہا ہے تو میں اسے نہیں پڑھتا۔ میں اوریجنل باتیں ہی پڑھتا ہوں۔ اور اوریجنل باتیں اسی وقت سامنے آتی ہیں جب ادیب نے اسے تجربے کے ذریعے حاصل کیا ہو۔ دوسرے انسانوں کے تجربات، احساسات کو ہم صرف ادب کے ذریعے ہی جان سکتے ہیں۔ اگر ہم ادب نہ پڑھیں تو دوسرے انسانوں کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتے۔ جو ترقیاں ہو رہی ہیں، انھیں اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے کہ کون سی چیز انسانی نقطۂ نظر سے اہم ہے اور کون سی باتیں انسانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کر رہی ہیں۔ تو ادب کو پڑھنا اس لیے

ضروری ہے کہ آسٹریلیا کا آدمی لیبیا کے آدمی سے گفتگو کر سکے۔ عراق کا آدمی امریکہ کے آدمی سے بات کر سکے۔

آج سماج کو ادب کی ضرورت ہے۔ امن اور سکون کے لیے ادب کی ضرورت ہے، خوشی کے لیے ادب کی ضرورت ہے۔ میں اس سے زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، یہیں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ شکریہ!

●

جناب فرحت احساس

یہ مہیب اور بے کراں غیاب، جو میں ہوں، مجھ سے ہر لمحہ حاضریوں سے آباد کیے جانے کا طالب رہتا ہے۔ خلائے نفس اور خلائے آفاق، کہ دونوں کسی اور کی نادیدگی کا مسکن ہیں، کے درمیانی وجود کا یہ خلائے برزخ، جو میں ہوں یا جو میرے ہونے کی جائے امکان ہے، ہر گھڑی لفظوں کے مصنوعی سیاروں کی آمد و رفت سے دریافت کیے جانے پر مصر رہتا ہے۔ یہ ازلی بے صورتی، جو میں ہوں، ازل کی ہی خاکِ تخلیق میں سے اپنے ممکنہ اور مقدر خط و خال برآمد کرنے کو سرگرداں رہتی ہے۔ یہ مستقل ہونے اور نہ ہونے کی کشاکش کا زخم ہر لمحہ کسی 'طبیب جملہ علت ہائے ما' کے شاید ابھی تک ناپید مرہم کا انتظار کھینچتا رہتا ہے۔ یہی اندرونی مطالبے، یہی اصرار اور انتظار مجھے وقت کے چاک پر رکھی لفظوں کی کچی مٹی کو دونوں ہتھیلیوں سے سادھنے اور ڈھالنے پر آمادہ رکھتے ہیں اور یہی سلسلے مجھے لفظوں کی ان دور دراز آبادیوں یا خود مختار جمہوریتوں تک سیاحی کراتے ہیں جو لغویت کے اس بے پناہ سمندر میں کہ دنیا ہے شاید ہمارے بامعنی ہونے کی واحد امکانی صورتیں ہیں۔

اپنے چاروں طرف اُگے ہوئے وقت کے گھنے جنگل کے اُس پار دیکھتا ہوں تو اپنی نوخیز اور نا قابلِ فہم موجودگی کے دور تک کھلے ہوئے میدانوں میں چار پانچ سال کا ایک بچہ نظر آتا ہے جسے پڑھنے کے لیے اسکول بھیجا گیا مگر جو پہلے ہی روز مکتب کے

مصنف کا عنوان: "مکتب سے بھاگا ہوا بچہ اور متنِ عشق کا دستِ شفقت"

دروازے سے ایک استاد کے ہاتھوں ایک بچّے کو پٹتا ہوا دیکھ کر خوف سے آپ اپنی طرف پلٹ گیا اور پھر دن بھر شہر کے گلی کوچوں اور پھر مضافات کے کھیتوں اور میدانوں میں پھرتا رہا کہ گھر واپس نہیں جا سکتا تھا اور پھر یہ خوف اس کے دل میں ایسا بیٹھا کہ اگلے کئی ماہ تک ہر روز گھر سے نکلتا اور یوں ہی نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرتا اور شام کو گھر آجاتا جیسے مکتب یاب ہو کر آیا ہے۔

اب سوچتا ہوں کہ کٹھن چکّر کی سرگردانیوں کا یہ سلسلہ خود آگہی کا پہلا سبق تھا جو مجھے پڑھایا گیا۔ یہ اب خود اپنے ہاتھوں دوبارہ اپنی نال کاٹنے کا عمل بھی تھا۔ اپنے گھر یا دنیا کے ہر دیے ہوئے سے کٹنے کی یہ مشق جو اس اوّلین آوارگی نے فراہم کی دراصل اجنبیائے جانے کی مشق تھی جو ہر ادبی و تخلیقی عمل کی جائے پیدائش ہوتی ہے۔ اسی آوارگی کے میدانوں میں مجھے ایک کمہار کے دروازے پر پہلی بار وہ چاک نظر آیا جسے میں نے کئی ماہ تک کئی کئی گھنٹے دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے اپنے اندر اُتار لیا۔ اس آوارگی نے مجھ میں اور مجھ پر وہ عنصری مکتب بھی کھولا جہاں اپنے اندر اور باہر کے متن کو پڑھنے کی رغبت ہوئی۔ یہی ادب کے ساتھ میرے طویل معاملۂ عشق کی ابتدا تھی۔

پھر یوں ہوا کہ جیسے جیسے مجھے اور مجھ میں لفظ آتے گئے ویسے ویسے میں لفظوں کے پر لگا کر اپنے اور دوسروں کے آسمانوں میں اُڑنے لگا۔ ساری پریوں کی کہانیاں آنکھوں میں واقعہ بن کر آباد ہونے لگیں۔ بہت جلد گھر میں موجود تمام پڑھی جا سکنے والی کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں امراؤ جان، شریف زادہ اور توبتہ النصوح، شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے کچھ ڈرامے، پرل بک کے دو ایک ناول اور موپساں کی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ یہ سارا قصہ بارہ تیرہ سال کی عمر تک کا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ یہ جان کر نہیں ہو رہا تھا کہ میں ادب پڑھ رہا ہوں۔ اس سے مجھے شعوری سطح پر کچھ خاص حاصل بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بس یوں تھا کہ میری آنکھوں یا ان کے حوالے سے مجھ میں کہیں اور کچھ تھا جو مجھے اس طرح کی کتابوں کے درمیان لیے پھرتا تھا اور ان کتابوں میں بھی کچھ تھا جو میرے اندر کے کسی ناقابل فہم مطالبے پر لبیک کہہ رہا تھا، اور اس کے علاوہ اور

اس کے اطراف اور میرے شعور کے مضافات میں بھی ایسا بہت کچھ ہو رہا تھا جو بولے یا لکھے ہوئے لفظ سے الگ لمس اور رنگ اور ذائقے کی نئی دنیائیں آباد کر رہا تھا۔ پھر انہی دنوں کسی انسانی حسن نے پہلی بار مجھے دہشت اور وحشت زدہ کیا اور مجھ میں، اس کے اندر، اپنے کسی کھوئے ہوئے حصے کی تلاش کی حس بیدار کی۔ اپنے غیر خود مکتفی اور ناکافی ہونے کا یہ احساس اور اپنے اس چھوٹے اور ٹوٹے ہوئے حصے کو، جو کسی اور میں میری تکمیل کے وسیلے کے طور پر نہ جانے کب رکھ دیا گیا ہوگا، دریافت کر کے اور پھر شعوری طور پر اپنے آپ سے جدا کر کے اُسے کسی اور کے سپرد کرنے کی یہ جدوجہد ہی عشق کی ابتدا تھی۔

یہاں شاید یہ گمان گزر سکتا ہے کہ میں اپنے موضوع سے ہٹ کر ذاتیات کے فضول جنگلوں میں بھٹک گیا ہوں۔ لیکن یہاں میں اپنی ذاتیات کے ساتھ تھوڑی Overindulgence کا مرتکب اس لیے ہو رہا ہوں کہ اپنے اندر کے اس وجودی مرکز کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں جو ادب کے وسیع تر متن کے ساتھ میری وابستگی کی بنیاد ہے۔ اور یہ مرکز میرے اندر کی گہری سے بھی بہت زیادہ خاموشی، ایک بہت ہی پیچ در پیچ اندھیرا، اور بہت گہری بیچارگی، یتیمی اور بیوگی یا کسی بہت گھمسان کی جنگ کے بعد ہاری ہوئی فوج کی جانب دھیرے دھیرے بیٹھتے جانے والے اور زرد ہوتے جاتے سرخ غبار کی سوگوار پس منظری دھن، سمندر میں کہیں لنگر انداز نہ ہو سکنے کی بے بسی، اچانک بے پناہ اور روشن کر دیے جانے کے لمحۂ نوازش کے مکرر نہ ہو سکنے کی بدنصیبی اور ازل کے آنسوؤں سے گندھی ہوئی مٹی کی مستقل جلاوطنی، ایسے ہی نہ جانے کتنے منظروں سے عبارت ہے۔

میں نے ابھی وسیع تر متن ادبی، ثقافتی کی بات کی تھی جو ادب کے معروف اور طے شدہ مظاہر یعنی لفظوں سے کی جانے والی شاعری، تعلقات اور افسانہ سازی کے سوا آوازوں، شکلوں، حرکتوں اور تمام تر حسی مدرکات اور تفصیلات میں سے ہوتا ہوا بسیط و عریض جمالیاتی اور اس سے بھی آگے جمال، روحانیاتی زمینوں اور آفاقوں کی

آبادکاری کرتا ہے۔ اس حوالے سے کہوں تو یہ بات بعض باوضو لوگوں کے لیے سڑک چھاپ لچّوں لفنگوں کی سنگ کا نتیجہ معلوم ہوگی، مگر یہ سچ ہے کہ ۱۹۶۰ کی دہائی کے ایک بڑے حصّے کے دوران میرے محسوسات و مدرکات کی جمالیاتی آبیاری میں محمد رفیع کی آواز اور او. پی نیر، مدن موہن اور روی وغیرہ کی موسیقی میں مرتّب کیے گئے مجروح اور شیلندر وغیرہ کے فلمی گیتوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ گیت میرے لاشعور میں گونج اور میری رگوں میں خون بن کر رواں ہیں اور میری حسیات کی ذاتی تاریخ میں ان کی ویسی ہی روایت قائم ہو چکی ہے جیسی ہماری محترم ادبی روایت۔ ان میں نوخیز آزاد ہندوستان کی ناآسودہ جمہوری آرزومندیوں کا وہ سارا جلال و جمال اور ہیجان یکجا ہے جو میری ذات کے ارتقا کا ایک لازمی محرک رہا ہے۔ ان گیتوں کے سُروں سے اُڑنے والے غبارِ جمال میں لاکھوں محبوبوں کے کھلتے ہوئے مہرباں آغوش، چراغوں کی طرح ایک کے بعد ایک روشن ہوتے چلے جانے والے افق در افق، تر و تازہ خون سے سینچے گئے لاکھوں دلوں کے گلاب، لاکھوں مہتابوں کی چاندنی میں گھلے ہوئے شہد آثار ذائقے لرزاں ہیں۔ اور وہ آنسو بھی جو دلاسے اور ڈھارس سے کسی بھی طور روکے نہیں رُکتے۔

۱۹۶۰ میں علی گڑھ آنے کے بعد میرا یہ وجودی مرکز پھر کتابوں پر مائل ہوا اور ایسا ہوا کہ میں نے شدید جنون کے عالم میں پہلے سائنس فیکلٹی اور پھر آرٹس فیکلٹی کی تمام تر کلاس رومی تدریسی حراستوں کو روندتے ہوئے مولانا آزاد لائبریری کے آغوش میں پناہ لی اور کئی سال فلسفہ، فلسفۂ سائنس، سماجی علوم اور ادب کے گھنے جنگلوں میں آگہی اور ورائے آگہی کے وٹ ورکش کی چھاؤں کے لیے سرگرداں رہا۔ کچھ یوں کہ اکثر ان کتابوں کے اوراق اور الفاظ میرے جہل کی خلاؤں میں پر پھڑپھڑاتے، ڈراتے گزرتے رہتے اور لفظوں کے چند پرندے آگہی کی منڈیروں پر بیٹھ بھی جاتے، اسی منڈیر کا حصّہ بن جانے کے لیے۔ یہ مکتب سے بھاگا ہوا وہی بچّہ تھا جو اب خود اپنے شعور و لاشعور کی سرحد پر کھلنے والی درس گاہ کا طالب علم بنا ہوا تھا۔

پھر اسی دوران عشق کا بلاوا آیا اور میں ایک بار پھر کتاب کو طاق پر دھر، اس چشم غزال کے پیچھے ہولیا۔ یہ ایک نیا مکتب تھا جس نے میرے آنسوؤں اور خون کے قطروں کو لفظ بننے کی سعادت بخشی اور ان لفظوں کو خود آگہی کے چراغوں کا نور عطا کیا۔ کھیل کا میدان اب جنگ کا میدان بن رہا تھا اور گم شدگیوں کے افق سے شاعری طلوع ہو رہی تھی، اور پھر شاعری میرے ہونے کا نعم البدل بن گئی۔ یہ عشق اپنی روح کا سارا نور و نار میرے سپرد کر کے اپنا سا جسم لے کر واپس ہوا تو میں نے اپنے آپ کو دہلی کے بے پناہ بنجر میں پڑا ہوا پایا۔ مکتب سے بھاگا ہوا بچہ اب اپنے وجود کے میدانوں میں ایسی دھوپ میں جس کی کوئی شام نہیں کہ گھر جا سکے۔ اب پھر وہی گھنا تاریک وسیع تر ادبی ثقافتی متن تھا جو اپنے آپ کو مجھ سے پڑھوا رہا تھا۔ اب مجھے اس متن کی تعبیریں کرنی تھیں کہ شاعری کرنی تھی اور شاعری کرنی تھی کہ زندہ رہنا تھا، کہیں اور سے کہ خالص جسمانی طور پر زندہ رہنے کی ضرورت تو کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی۔

تو صورت حال یوں ہے کہ میری تعبیر طبیعی علوم میں کچھ ہے، نفسیات اور سماجی علوم میں کچھ ہے اور ساری تعبیریں پارہ پارہ اور باہم متصادم۔ سو ادب مجھے اپنے آپ کو سالم دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ اس آئینے کا ٹھیہا ہے جہاں تمام نکھرے ہوئے عکسوں کے پرندوں کو وجدان کی صدا دے کر واپس یکجا کیا جا سکتا ہے۔

میں ہر لمحہ اپنے آپ کو عناصر میں توڑے اور بکھیرے ہوئے پڑا رہتا ہوں اور سہما رہتا ہوں کہ باہر سے کوئی پکار لے تو اپنے آپ کو کہاں سے اُٹھاؤں اور کن لباسوں میں باہر جاؤں۔ ادب اکثر مجھے سلک ترتیب دیتا ہے۔

میرے وجدانات، حسیات اور تعقلات کی حشر گاہ مجھے آپ اپنا منکر رکھتی ہے، آگہی اور ردِّ آگہی اور حق آگاہی و باطل آگاہی کی کشاکش تشکیک وہ خار دار ہے جس میں اپنے باہر موجود یکساں مالوں سے گزرنے والے اپنے ہم نفسوں کی شہادتیں درکار رہتی ہیں کہ اپنے سچ کی توثیق کر سکوں۔ ادب میری توثیق کا ذریعہ ہے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ میں اپنے ہی دشت میں اپنا شکار کرتے کرتے اپنے خیمے سے دور کہاں تک آ گیا ہوں اور یہ کون سا دیار ہے جہاں سے اب میرا گزر ہے، مجھے اپنے ہی جیسے وجود کے شکاریوں کی تلاش رہی ہے اور ادب انہی شکاریوں کا شکارنامہ ہے۔

میرے اندر چلنے والی دھول بھری آندھیاں میرے بہت سے منظروں کو دبا دیتی ہیں، بہت سی آوازوں کو گنگ اور بہت سی موسیقیوں کو بے سُر کر دیتی ہیں۔ ادب ان منظروں اور موسیقیوں کو واگزار کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔

کسی کا بھی زندہ شعر، اور زندہ فکشن میرے حواس کو تازہ آبِ احساسات سے دھوڈالتا ہے، دل کو غسل خوں دیتا ہے اور عقل کی چشم کور کو سرمۂ نور لگاتا ہے۔

دنیا میں میرا ناکارہ فضول، فالتو اور بے مصرف ہونا ثابت ہے۔ ہر زندہ ادب پارہ باہر میرے نہ ہونے کی تردید کر کے میرے ہونے کو تسلیم کرتا ہے اور مجھے اپنے اندر آباد کر کے ایک کام دیتا ہے اور اس کی اُجرت بھی۔

میرے لیے زندہ ادب دراصل متنِ عشق ہے جو دنیا کے حملوں کو انگیز کرنے اور دہر کے میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنے کے لیے اسلحہ فراہم کرتا ہے کہ کوئی بھی کتاب نتیجۂ عشق نہیں تو مظہرِ کفر ہے اور اس لیے دوزخ کا کندہ ہے۔

سو مکتب سے بھاگا ہوا بچہ آج بھی شہر کے کوچہ و بازار میں رسوا ہو رہا ہے کہ اس کا ہم زاد قیس صحرا میں جا بسا ہے۔ قیس جب بھی کبھی شہر کو پلٹتا ہے تو اس بچّے کی عید ہو جاتی ہے کہ یہی اس کے لیے آغوشِ عشق ہے ورنہ خالص عقل کی کتاب کو وہ جانے کب کا طاق پر دھر کر بھول چکا ہے۔

●

پروفیسر سیّد محمد ہاشم

فنونِ لطیفہ میں مصوری، موسیقی، سنگ تراشی اور فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونوں سے انسان خوب محظوظ ہوتا ہے اور مسرّت و شادمانی پاتا ہے اور بعض چیزوں کا نقش تو اس کے ذہن ودماغ پر بہت دن تک قائم رہتا ہے۔ لیکن ان میں سے ہرایک فن صرف ایک طرح کا حظ دیتا ہے، جب کہ ادب بھی فنونِ لطیفہ کا ایک رکن ہے، اس کا دائرہ کار بہت وسیع، اور اثر دیرپا ہوتا ہے۔ یہ انسانی جذبات واحساسات اور لطیف ترین تخیلی تجربات کا ملفوظی اظہار ہے۔ اس کی تشکیل وتخلیق کا سب سے طاقت ور وسیلہ 'لفظ' اور زبان ہے۔ یہ زبان اپنے بیان کرنے والے کی علمی وفکری اور لسانی وادبی سطح کی عکاس ہوتی ہے۔ اس کی تین سطحیں ہوتی ہیں، سادہ، علمی اور تخلیقی۔ پہلی سطح سادہ زبان کی ہے، یہ بالکل عوامی نوعیت کی تجارتی، اطلاعاتی، عام گفتگو کی اور خط وکتابت وغیرہ کی زبان ہوتی ہے جو اکہرے معنیٰ رکھتی ہے۔ دوسری سطح علمی نثر کی ہے، یہ سائنسی، انسانی اور سماجی علوم کی تشریح کی زبان ہوتی ہے، تحقیق، صحافت اور سوانح وتفسیر وغیرہ علوم بھی اسی کے دائرے میں آتے ہیں۔ تیسری سطح تخلیقی زبان کی ہے، جس میں نثر وشاعری دونوں کے ادبی فن پارے وجود میں آتے ہیں، اس میں فن کار زبان واسلوب کی تمام خوبیوں، نزاکتوں اور لطافتوں سے حسب موقع سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ علم ودانش اور فکروفن سے مزیّن حضرات کے تخلیق کردہ فن پاروں کی زبان کا معیار بلند اور معنوی

تہ داری سے معمور ہوتا ہے، ان کے الفاظ کثیر جہتی، تراکیب چست ولطیف اور بیان بلیغ و موثر اور تخلیقی تکمیلیت (صفتِ ابلاغ) کا حامل ہوتا ہے۔ اس ''بیان'' سے متعلق آتش کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ فن کار مرصع ساز کی طرح ہیرے اور نگینے جڑنے کا نازک ترین کام کرتا ہے اور بقول میر:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

''لفظ'' زبان کی اکائی ہے، یہ اقبالؔ کی ''خودی'' اور علم طبعیات کے پرزم (Prism) کے مترادف ہے، جو بظاہر ایک لفظ یا ایک مخصوص ڈیزائن کا شیشے کا ٹکڑا ہوتا ہے، لیکن جس طرح روشنی پڑنے کے بعد پرزم قوس قزح کے کثیر اور حسین رنگوں کا عکس دیتا ہے، یا اقبالؔ کی ''خودی'' ہمہ رنگ اور ہمہ جہت ہوتی ہے، اسی طرح ''لفظ'' میں بھی وہ تخلیقی قوت ہوتی ہے جو اعلیٰ فن کار کے ہاتھوں، متن کے افق پر معنوی قوس قزح کا لطف و اثر دیتی ہے۔ فن کار کے تجربہ کے اس مؤثر ابلاغ کے نتیجہ میں قاری روحانی تازگی و مسرت، (delightness & Pleasure)، صوتیاتی و معنیاتی حظ اور فکری و جمالیاتی انبساط (Recreation) کے بنیادی حال و مقام سے گذر کر (Revelation) ''انکشاف'' والہام کی دہلیز تک جا پہنچتا ہے، چنانچہ ان سطور کے راقم نے شاہنامۂ فردوسی، پیراڈائز لاسٹ، آگ کا دریا، مثنویٔ معنوی، جاوید نامہ، سحر البیان، گلزارِ نسیم، طربیۂ خداوندی، ساقی نامہ اور مسجدِ قرطبہ جیسی درجنوں تخلیقات سے اپنے اندر غیر معمولی سرشاری محسوس کی اور ہر بار کے مطالعہ سے تحیّر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اپنے تخلیقی عمل کے دوران ان سبھی فن کاروں نے تخیّل کی بلندی، وجدان کی لطافت اور بیان کی طاقت کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا ہے، گویا علامہ اقبالؔ کے ''تصورِ عشق'' اور ''خونِ جگر'' کی آمیزش سے یہ شہ پارے تیار کیے گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں اور ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی ان کی دمک اور ادبی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ادب عالیہ کے مطالعہ نے میری رہنمائی اس طرف بھی کی ہے کہ ادب پارہ کا مطالعہ زمینی حقیقتوں سے ہم کنار کراتے ہوئے تطہیر نفس کے عمل سے بھی گذارتا ہے اور عرفانِ ذات کا موجب بھی بنتا ہے۔ اعلیٰ فن پارہ قاری کی قوتِ متخیلہ کو مہمیز کر کے اسے فکری بالیدگی، ذہنی واخلاقی بلندی اور روحانی ترفع عطا کرتا ہے اور اس طرح اس کی شخصیت کی تعمیرِ نو بھی ہوتی ہے۔ نمونے کے لیے صرف چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں، حافظؔ کے تخلیقی تجربات اور ان کی جلالی و جمالی کیفیات، گلستانِ سعدی کے کم سے کم چھ ابواب میں عرفانیات کے کامیاب فنی تجربے، پیراڈائز لاسٹ کے بارہ میں سے کم سے کم سات حصّوں میں نظریاتی اختلاف کے باوجود بلا رکاوٹ حیرت انگیز تاثر پذیری، ''آگ کا دریا'' میں زمانے کے وسیع کینوس پر ہندوستان کے لینڈ اسکیپ میں ایک ہی نام کی اختراعی، ارتقائی اور بوقلموں شخصیت کے ذریعہ فن کی سحر انگیزی کا مظاہرہ، ''خوشبوں کا باغ'' کا منفرد میکانزم، اور اس میں استعمال کردہ فنی و اسلوبی آلات کی کامیاب اثر اندازی، ''آخر شب کے ہم سفر'' میں بنگال کی انقلابی شورشوں سے سندر بن تک کی حسین مرقع کشی، عبداللہ حسین کے یہاں پنجاب کے کسانوں کی صورت حال کی پیش کش اور قاری کا دردمندانہ اور انسان دوست ردِّ عمل، ''آخری آدمی'' میں علامتوں کے توسط سے ہجرت کے تصور کی انوکھی پیش کش اور اپنے وطن کی یاد میں استغراق، ''نیا قانون'' میں منٹو کی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیوں پر غیر معمولی فن کارانہ گرفت، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی موت کا مقام اور اس کی معنویت، ''کفن'' میں ''بدھیا'' کی موت کے نتیجہ میں ارتعاش انگیز صورت حال، راجندر سنگھ بیدی کی ''اندو'' کے آئینے میں ہزاروں مظلوم اور استحصال شدہ عورتوں کی عکاسی، ''کنگ لیر'' میں ''لیر'' کی شخصیت کے دوسرے رُخ کی پیش کش، ''شاہ ایڈی پس'' کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات پر قاری کی منقلب شخصیت میں جذبات کا وفور اور اہتزاز کی کیفیت اسی فنی کرشمہ سازی کا نمونہ ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے منتخب مرثیے اور اسی طرح کی سیکڑوں چھوٹی بڑی نگارشات ذہن و فکر پر اثر انداز ہوئی ہیں، جو

تاریخی، سیاسی، سماجی، روحانی اورادبی علوم و معارف کی ترسیل کا ذریعہ بنی ہیں اسی کے ساتھ عرفانِ ذات کی قیمتی دولت کے حصول اور انسان دوست رویّہ میں اضافہ کا سبب بھی بنی ہیں۔ کیا ادب کی اس عطا سے سرشار، ذی شعور قاری ایسے مطالعہ کے حصار سے کسی بھی وقت باہر نکل سکتا ہے؟

اس پر مستزاد یہ کہ متذکرہ بالا ہمہ رنگ اور متنوع کیفیت والی تخلیقات اور ان کے مصنفین کی دیگر دستیاب تخلیقات میں زبان و اسلوب کی جو حیرت انگیز کرشمہ سازیاں ہیں، ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے اپنی تحریروں میں اس کا غیر شعوری اثر محسوس کیا ہے۔ ان میں کچھ وہ بھی ہیں جن کا قبل ازیں حوالہ نہیں دیا گیا ہے، مثلاً سیّد سلیمان ندوی پر تحقیقی کام کے سلسلے میں سرسیّد، علامہ شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالسلام ندوی وغیرہ کا مطالعہ کیا تو زورِ بیان کے شوق میں استدلال کی قوت پیدا کرنے کے لیے مترادفات کے استعمال کی عادت ہوگئی۔ Superlatives کا استعمال بھی بکثرت تھا، لیکن تحقیق سے رغبت کے بعد اس میں کافی کمی آگئی۔ رشید احمد صدیقی کے طنز اور مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خاں کے لطیف مزاح کی اثر پذیری نے فکاہیہ تحریروں میں جان ڈالی ہے۔ اسی طرح حالؔی، شبلؔی اور سلیمان ندوی کی سوانح عمریوں اور عبدالحق، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کے خاکوں نے میرے تقریباً بیس مطبوعہ سوانحی خاکوں میں کم سے کم دس پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ ریسرچ کے بالکل ابتدائی زمانے سے ہی اعلیٰ تحقیقی نمونوں کے مطالعے کا شوق ہوا۔ نصیر الدین ہاشمی، حامد حسن قادری اور رام بابو سکسینہ کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ''دکن میں اُردو'' اور شمس اللہ قادری کے مقالات ''اُردوئے قدیم'' سے دکن میں موجود اُردو کے قدیم تحقیقی سرمایے اور مخطوطات سے متعلق ایسے حیرت انگیز انکشافات ہوئے جنھوں نے تحقیق و تدوین کی رغبت کو، شوق میں بدل دیا اور ذہن میں یہ بات پختہ ہونے لگی کہ اپنے اس قدر قیمتی قدیم ادبی سرمایہ کو دریافت کیا جائے اور اس کی تدوین کی جائے اور دوسرے ذی استعداد نوجوانوں کو بھی اس طرف راغب کیا جائے۔ اس شوق نے عبدالحق، محمود شیرانی،

قاضی عبدالودود، عرشی صاحب، مالک رام، مسعود حسن رضوی، رشید حسن خاں، نذیر احمد وغیرہ کی تحقیقی وتدوینی کاوشوں سے واقف کرایا اوران کی عظمت دل میں بٹھائی جس کے نتیجہ میں راقم الحروف کے چند تحقیقی مضامین مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوئے اس کے علاوہ تحقیق کے بعض مشاہیر کے مضامین کا ایک مجموعہ ۱۹۷۸ء میں ''تحقیق وتدوین'' کے نام سے مرتب کیا اوراس میں اصول تحقیق وتدوین سے متعلق تفصیلی مقدمہ لکھا۔ اسی زمانے میں پروفیسر حسام الدین راشدی ڈائرکٹر سندھ اکاڈمی کراچی اور پروفیسر ریاض الاسلام کراچی یونیورسٹی کے ذریعہ اور پروفیسر مختارالدین احمد اور پروفیسر نورالحسن نقوی (علی گڑھ)، کے توسط سے ''نصرت نامۂ ترخان'' کا ایک انتہائی بدخط نسخہ، ''نسخۂ علی گڑھ'' سے مقابلہ کے لیے اس خاکسار کو بھیجا گیا۔ اس کتاب کا دنیا میں یہ واحد نسخہ ہے چنانچہ بہت توجہ اور احتیاط سے تمام تحقیقی اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ اور مقابلہ کرکے صحیح ترین متن مع تفصیلی حواشی اور نوٹس کے تیار کیا اور سندھ اکاڈمی کراچی کو واپس بھیج دیا۔ جو تقریباً بیس سال کے بعد اب ۲۰۰۲ء میں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے جس کے مرتب و مدوّن ڈاکٹر انصار زاہد خاں ہیں۔ موصوف نے ازراہ عنایت دو پیراگراف میں اس خاکسار کی کاوش کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مطالعۂ ادب کا ایک سبب اور فیضان جسے انگریزی میں Regeneration کے تحت لاتے ہیں، ادب پارہ کی وہ قوت اور عطا ہے جو قاری میں مسرّت وانبساط کے ساتھ ساتھ تازہ فکر، توانا حوصلہ اور انقلاب انگیزی کی صفات پیدا کرتی ہے۔ عرفانِ ذات اور حقیقت عظمیٰ کے انکشاف کے ساتھ ہی ساتھ فن پارہ قاری کی ذہن سازی کا بھی کام کرتا ہے چنانچہ یہ برٹنڈرسل ہی تھا جو اپنی تخلیقات کے حیرت انگیز اثر کے سبب جرمن انقلاب اور اس کے غیر معمولی اثرات کا بانی اور روح رواں ثابت ہوا۔ یورپ کی متعدد مثالوں کے علاوہ دوسری جگہ بھی اس کے نمونے موجود ہیں اسی لیے شیلے نے شاعری (ادب) کے غیر معمولی اثرات اور ذہن سازی کی صفت پر

اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مقنن صرف قانون بناتے ہیں اور ادیب ذہن ساز ہوتے ہیں۔

"Poets are the unacknowledged legislatures of mankind."

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اُردو ادب میں خاص طور سے فکشن اور نظم نے ذہن سازی کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ ہمارے مشاہیر کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی چھوٹی بڑی سینکڑوں پُر جوش نظمیں لکھیں اور عوامی ادب نے بھی سیاسی رہنماؤں کے کام کو بہت آسان کر دیا۔ تحریکِ آزادی سے متعلق تخلیقات کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے ہوئے ادب نے بھی ذہن سازی میں مؤثر کردار ادا کیا، چنانچہ مزدوروں اور اچھوتوں وغیرہ کے حقوق کے سلسلے میں لاکھوں لوگ ان کے ہمنوا بن گئے۔ ہمارے ملک میں اس کے سیاسی نتائج آج سب کے سامنے ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب وغیرہ کا ریزرویشن اور آج اس کی بنیاد پر صوبائی و مرکزی حکومتوں میں انقلابات آتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ صدر جمہوریہ کی اُمیدواری میں بھی وقتاً فوقتاً اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایک دوسرے شہ پارہ ''شاہنامہ فردوسی'' میں اس کے عظیم الشان مصنف نے حب الوطنی اور ایران کے دو ہزار سالہ شاندار ماضی کی پیش کش سے اہلِ ایران کے دل میں اپنے ماضی پر فخر کرنے کا حقیقی اور پُر جوش جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مثنویٔ معنوی اپنی غیر معمولی قوت متخیلہ، فکر بلیغ، طاقت ور زبان اور سحر آفریں بیان سے قوموں اور نسلوں کی ذہن سازی کا ذریعہ بنی ہے۔ کلام اقبال کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

ادب جہاں فکری سطح پر ذہن سازی کا کام کرتا ہے، وہیں انسان کے فنی احساس کو بھی نئی توانائی عطا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں کثرت سے مطالعہ کرنے والے بالغ نظر اور تربیت یافتہ قاری، ادب کی کسی نہ کسی صنف میں طبع آزمائی کرنے لگتے ہیں اور وہ باقاعدہ تخلیق کار یا فن کار بھی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ اُردو کے بعض نقاد اپنی عمر کے آخری دور میں فن کار بن گئے۔

بعض حضرات نے ادبی تخلیقات میں سنجیدہ طبع آزمائی کرنے کے بجائے پیروڈیز لکھنا پسند کیا اور اس طرح متعدد پیروڈیز وجود میں آئیں، اگر صرف ایک مثال پیش کریں تو اس کا نمونہ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے جس کے جواب میں اب تک پانچ مجالس شوریٰ لکھی جا چکی ہیں۔

ادب کے مطالعہ کے دوران نئے نئے قسم کے حوالے اور اشارے ملتے ہیں، جن سے وژن میں، بصیرت میں اور عرفان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے اپنے تحقیقی مضامین میں اکثر ایرانی عالم سعید نفیسی کا تذکرہ کیا تھا اس پر کبھی کوئی توجہ نہیں کی لیکن ایک مرتبہ ضرورتاً ان کے بارے میں واقفیت کی کوشش کی اور مطالعہ شروع کر دیا، اس مطالعہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف سعید نفیسی ہی کی شخصیت نہیں بلکہ ایران کی تحقیق و تدوین کی پوری صورت حال سامنے آ گئی۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر اسلم پرویز کی تحقیق کے حوالے سے غالب کے مشہور شعر:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کو سرقہ قرار دیا تھا۔ غالب کے بارے میں ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ان کا ایک ایک شعر، اپنے عہد کے جید علماء و ناقدین کی تصدیق کے بعد دیوان میں شامل ہوا ہے، لہٰذا ادب کا طالب علم حقیقت جاننے کی کوشش میں مزید مطالعہ پر مجبور ہے اور تب کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔

ذوق کا قصیدہ ع ''شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت'' پڑھتے وقت اس میں استعمال کردہ اصطلاحات سے واقفیت کے لیے کتنی ہی فرہنگیں، کتابیں اور انسائیکلو پیڈیا دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہی نہیں بلکہ خاقانی ہند کے خطاب کی اصلیت جاننے کے لیے اصل خاقانی کا مطالعہ کیا تو علوم و معانی کے ایک دریا کی غواصی کر لی، اور پھر ذوق ہی نہیں سودا کے بھی بہت سے منابع دریافت ہو گئے۔ سودا کی ہجویں پڑھیں تو لامحالہ انوری کی طرف رجوع ہونا پڑا اور ان کے توسط سے اموی دور کی عربی

شاعری کے ہجو یہ قصائد کے مطالعہ تک بات پہنچ گئی۔ اس مطالعہ سے عربی، فارسی اور اُردو ہجو گوئی کی پوری روایت سامنے آگئی۔ صرف ذوق کے قصیدہ کی تحریک پر کئی مہینوں کے مطالعہ کا یہ سامان فراہم ہو گیا۔ اس طرح صرف ایک اشارے پر اتنے زیادہ علوم و معارف سے واقفیت کی سرشاری کا اندازہ قاری کے علاوہ دوسرا کون کر سکتا ہے؟ ایک قصیدہ ہی نہیں دوسری تمام اصناف اور پورے ادب کا یہی حال ہے۔ ادب تو موجیں مارتا ہوا سمندر ہے، تاریخ ادب یا تحقیق کے طالب علم کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ ادب کا مسلسل اور متواتر مطالعہ کرتا رہے۔ البتہ قاری کو دوسرے لوگ مجبور نہیں کر سکتے کہ صرف ان کی سطحی پسند کی چیزوں کا مطالعہ کیا جائے اور باجماعت اپنی دانشوری کا ڈھول پیٹا جائے، یہ قاری کا اپنا ذوق، معیار اور اپنا فیصلہ ہے۔

غالب نے جدت پسندی اور ندرت پسندی میں کتنی مشکل زمینیں، کتنے مشکل الفاظ و تراکیب اور کتنی دقیق اصطلاحات استعمال کی ہیں، ان کے ابتدائی پچیس سال کا کلام اس کا شاہد ہے اس کے لیے بجا طور پر مختلف لغات، فرہنگوں اور ان کے خطوط و شروح کی طرف بھی بار بار رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اقبال نے اپنے فکری نظام میں جن اصطلاحات و اشارات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے، ان کی حقیقت تک رسائی جوئے شیر لانے کا عمل ہے۔ عام طالب علم ہی نہیں مستند علماء و اساتذہ کے لیے بھی ان سب کا بے ساختہ سمجھانا آسان نہیں۔ اقبال سے شغف رکھنے والا قاری اقبال کی تفہیم کی خاطر سب کچھ کر گذرنے کے لیے تیار رہتا ہے، اہلِ نظر اس کی تفصیلات سے واقف ہیں، یہ الگ بات ہے کہ سیّد عابد علی عابد، اکبر حسین قریشی اور نسیم امروہوی نے ان اصطلاحات و اشارات اور تلمیحات کی شرحیں لکھ کر اس کام میں بہت سہولت پیدا کر دی ہے۔ غرض ادب کے مطالعہ کے دوران جو دقیق مسائل سامنے آتے ہیں ان کے حل کے لیے لغت، فرہنگ، انسائیکلو پیڈیا، تاریخ ادب اور اشاریوں وغیرہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اس سے اپنے علم میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے؛ چنانچہ یہ مطالعہ میرے لیے ہمیشہ مسرّت و شادمانی کے ساتھ ساتھ غیر معمولی بصیرت کا سبب بھی بنا ہے۔

شعر و ادب کے مطالعہ سے جہاں لطف اندوزی، تازگی، انبساط، ذہنی سرشاری delightness حاصل ہوتی ہیں وہیں بیان و بدیع کی نیرنگیوں، ادبی حسن و جمال کی خوبیوں، زبان کے خلاّقانہ استعمال اور پیش کش کی نئی نئی اداؤں اور طریقوں سے ایسا حظ حاصل ہوتا ہے جو خود قاری کو بہت پاکیزہ و شائستہ بنا دیتا ہے، اور وہ اس کی فکری، ذہنی اور ادبی تربیت کا سبب بھی بنتا ہے۔ اچھے اسالیب کے مطالعہ کا اثر اس کی شخصیت پر پڑتا ہے اور وہ اپنے افکار میں، اطوار میں، رویّوں میں، گفتگو و بحث کے انداز میں بہتری اور عمدگی لاتا ہے، اس سے اس کے اندر منکسر المزاجی، خوش لہجگی اور نرم گفتاری بلکہ شیریں گفتاری آتی ہے — یہ سب اس راقم الحروف کے محسوسات اور مطالعہ کے نتائج ہیں اور اس وقت صرف یہ مختصر اشارے کئے گئے ہیں ورنہ ابھی شاعری کے رموز، کلاسیکی، علامتی اور جدید شاعری کی لطافتوں کے اظہار اور بعض دیگر اہم مسائل پر گفتگو کی بھرپور گنجائش موجود ہے۔ جو اس خاکسار کے مطالعہ کا سبب بنتے رہے ہیں۔

آخر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، وہ یہ کہ انسان سب سے پہلے انسان ہے اور وہ ہر جگہ پایا جاتا ہے، اس کی جبلّی خصوصیات، اس کی معاشرتی اقدار اور اس کی خاندانی روایتیں، اس کی تعلیم گاہوں و تربیت گاہوں کا ماحول، اس کی مذہبی، معاشرتی اور پیشہ ورانہ خوبیاں اس کے ساتھ ہوتی ہیں، خواہ وہ سائنس و ٹکنالوجی کا آدمی ہو یا دیگر کسی بھی شعبۂ زندگی کا، وہ پوری طرح مہذّب و شائستہ، نرم گفتار، خوش اطوار، سب کچھ اپنے ماحول میں ہو سکتا ہے، اگر کسی شخص کی ادب سے وابستگی نہیں ہے تو اس کو سرے سے بے ادب اور غیر مہذّب سمجھنے کی غلطی اور غلط فہمی سے ہمیں بچنا چاہیے، ٹھیک اسی طرح جیسے ادب کا کوئی مستقل اور پیشہ ور قاری بھی اپنے خانگی، ہمسائگی اور شعبہ جاتی رویّوں میں غیر مہذب اور ناشائستہ ہو سکتا ہے۔ البتہ ادب کے مطالعہ سے اس کی شخصیت کو آب و رنگ اور جلا ضرور مل سکتی ہے اور ملتی ہے لیکن غیر ضروری احساس برتری سے بچنے کا یہ علم اور یہ سلیقہ بھی ادب کا مطالعہ ہی سکھاتا ہے۔

●

پروفیسر عقیل احمد صدیقی

آج پہلی بار میرے 'میں' کو کسی بڑے امتحان کا سامنا ہے۔ اس کے مدِ مقابل ایک ایسی سنجیدہ جماعت کا جمگھٹا ہے جو یہ طے کرے گی کہ میرے اس 'میں' نے زندگی کے عطیہ کا صحیح استعمال کیا؟ یہ کہ 'میں ادب کیوں پڑھتا ہوں'؟ بظاہر کتنا سادہ سوال ہے۔ لیکن اس نادار 'میں' کے لیے جو ہر گام پر 'ذہن رسا' رکھنے کا مدعی تھا یہ سوال ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس 'میں' کے پاس جو 'عیار' بھی ہے اور 'بہانہ جو' بھی، آج اس جھوٹ کا بھی سہارا نہیں جسے بول کر صاف بچ نکلے۔ یا سامعین کی عدالت کو اپنے (مبہم، گمراہ کن بات) Double Speak سے مخمصہ میں ڈال دے۔ اور اگر یہاں کامیابی حاصل بھی کر لے تو پھر اس کا سامنا اپنے ہمزاد کا ہے یا اس سیلف کا جس نے اس امتحان کی کٹھن گھڑی میں اس سے فاصلہ قائم کر لیا ہے۔ اور ترچھی نظروں سے اس 'میں' کے ہر لفظ اور ہر اک بیان کو پڑھ رہا ہے۔ آج میرا یہ اپنا 'میں' کتنا مورکھ دکھائی دے رہا ہے۔

تو حاضرین!

دیہی ماحول کے ایک 'اوسط گھرانے' میں میں نے آنکھ کھولی۔ گھر میں کچھ زیادہ علم کا چرچا نہیں تھا۔ البتہ میرے دادا جان کو حکمت بھرے اُردو اور فارسی کے ڈھیر سارے اشعار یاد تھے۔ جسے وہ اکثر تنہائی میں گنگناتے اور کبھی محفلوں میں مثال میں

پیش کرتے اور ساتھ ہی اگر شعر فارسی کا ہوتا تو اس کے معنی بھی بتلاتے۔ میں سعدی اور حافظ کے نام سُننے لگا تھا۔ وہ اکثر ان دو شاعروں کا نام لیتے تھے۔ اور ہاں 'کریما بخشائے بر حال ما' کو ترنم سے پڑھتے رہتے تھے۔ یہ میرے گھر میں آخری فارسی تھی۔ اس لیے کہ میرے والد شاعری سے فقیرانہ لگاؤ بھی نہیں رکھتے تھے۔ میں نے آج تک ان سے کبھی کوئی شعر نہیں سُنا۔ البتہ وہ کچھ گنگناتے تو ضرور رہتے تھے لیکن کیا گنگناتے تھے، میں نے کبھی پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ بچپن میں مجھے جا و بیجا پیٹتے تھے اور میں ان سے خوف کھاتا تھا۔ اسی بچپن کی بات ہے میرے مکان کے عین روبرو ایک کھپریل، کچے گھر کا مکان تھا۔ یہ خلیل (بہرو) کا گھر تھا۔ یہ شخص بلا کا قصہ گو تھا۔ اسے نہ جانے کتنی داستانیں ازبر تھیں۔ ہم اور ہمارے ہم سن بچے عام طور پر سردگوں، چاندنی راتوں میں پوال کے بچھونے پر بیٹھ کر ان سے داستانی قصے سُنا کرتے۔ قصہ گل بکاؤلی، طوطا مینا کی کہانی کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں۔ یہ بتاتا چلوں کہ میں نے اپنی روایتی نانی سے کبھی کوئی کہانی نہیں سُنی۔ بس ان کی ایک امیج ہمیشہ میرے سامنے یہ رہی کہ وہ مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ رہی ہیں یا تسبیح کے دانے گن رہی ہیں۔ تبھی نہ جانے کب کی بات ہے کہ مجھے اپنے گھر کے کباڑ میں اقبال کی بالِ جبرئیل اور ایک داستان کی کتاب مل گئی۔ اس داستان کو جس کے شروع کے کئی ورق غائب تھے، میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ وہ کون سی داستان تھی، یہ نہیں معلوم لیکن اس داستان میں ایک شہر یا قریہ 'کن مین پور' کے نام کا تھا۔ میں نے اس داستان سے فارسی کے کئی شعر یاد کیے تھے۔ جس میں خسرو کا یہ شعر بھی تھا۔

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده برکف
به امید آں که روزے بشکار خواهی آمد

یہ ایک اتفاق ہے کہ مجھے کہانی سُننے اور پڑھنے کے مواقع زیادہ ملے لیکن میری دل چسپی شعر پڑھنے اور سُننے میں شروع سے ہی زیادہ رہی۔ پھر ایسے اشعار تلاش کر کے یاد کرتا تھا جس میں سادہ اور عام فہم لفظوں میں دل کی حکایت بیان کی گئی ہو۔ میری عمر بڑھنے

لگی تھی۔ یہ میری دربدری کے دن بھی تھے۔ گھر سے دور مدرسہ کی فضا میں شاعری سے ربط مشاعرہ کے واسطے سے تھا دور دور تک مشاعروں کو سُننے جاتے۔ ان کے اشعار ڈائری میں قلم بند کرتے اور اپنے پسندیدہ اشعار یاد کر لیتے ۔ وہی اشعار پسند آتے جو میرے روحانی خوابوں اور آرزوؤں کی تمثیل تھے یا پھر جن میں زندگی کے بارے میں کوئی پسندیدہ تبصرہ ہوتا۔ شاعروں میں اقبال سے زیادہ دلچسپی شاید مذہبی ماحول کا نتیجہ تھی۔ فلسفہ تو خاک میری سمجھ میں آتا لیکن یہ بات سمجھنی آسان تھی کہ اقبال دردمند دل رکھتے ہیں اور مسلم قوم کو دنیا کے نقشہ پہ عظمت کی بلندی پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ مدرسہ کے ماحول میں فکشن پڑھنا غیر اخلاقی فعل تھا لیکن منشی فیاض علی کے دو مشہور ناول 'انور' اور 'شمیم' غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اسی دوران جاسوسی ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ ہو گیا۔ انہی دنوں بعض ایسے ناول بھی پڑھے جو سب سے چھپا کر ہی پڑھے جا سکتے تھے۔ تاریخی ناول بھی ان دنوں کافی پسند آتے تھے۔

پھر ہائر سکنڈری اور بی۔اے کی تعلیم کے زمانے میں اُردو زبان و ادب سے دلچسپی کم ہو گئی۔ اس کے بجائے انگریزی فکشن کچھ نصابی ضرورت اور کچھ طبعی میلان کے سبب، پڑھنا شروع کیا۔ اب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور چند ایسے احباب میں وقت گزارتا تھا جو اُردو زبان و ادب میں دل چسپی رکھتے تھے بلکہ ان میں بعض معتبر تخلیق کار بھی تھے۔ یہ سبھی حضرات جدیدیت پسند ادیبوں کے حلقہ بہ گوش تھے۔ خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر نارنگ، پروفیسر شمیم حنفی کو یہ سب جی بھر کے دیکھتے تھے اور 'شب خون' پابندی سے پڑھتے تھے۔ ان میں میری حیثیت Out sider کی تھی۔ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم۔ میں نے بعد میں جانا کہ ان صحبتوں نے مجھے کس حد تک متاثر کیا تھا۔

تب میں نے ایک دن اچانک فیصلہ کیا کہ میں 'اُردو زبان و ادب' سے ایم۔اے کروں گا۔ میرے اس فیصلے کو شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ کچھ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ قانون کا ایک نمایاں طالب ہونے کے باوجود اگر بیچ میں کوئی شخص کسی دوسرے موضوع کا

طالب علم بن جائے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ 'کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں'۔ لیکن یقین جانیے یہ فیصلہ محض اتفاق تھا جس کا کوئی تعلق 'کسی ناکام عشق' سے نہیں تھا۔

ادب کا باقاعدہ طالب علم بننے سے قبل میں یہی سمجھتا تھا کہ ادب سے مراد شاعری ہے یا پھر افسانہ اور ناول ادب ہیں۔ لیکن بی۔اے اور ایم۔اے کی تعلیم کے دوران پہلا سبق یہ ملا کہ ادب کا دائرہ وسیع ہے۔ شاعری اور فکشن کے علاوہ غیر افسانوی نثر کی بہت سی قسمیں ادب میں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ ادب پر کی جانے والی تنقید بھی ادب ہے۔ اس تصحیح پسندی کے باوجود میں شاعری اور فکشن کو ہی ادب میں مرکزی جگہ دیتا تھا۔ اسی دوران یہ بھی پتہ چلا کہ رجحانات کے اعتبار سے بھی ادب کی اَن گنت اقسام ہیں۔ اخلاقی ادب، افادی ادب، رومانی ادب، حقیقت پسند ادب، علامتی ادب، جدیدیت پسند اور اب مابعد جدید ادب بھی ایک حقیقت ہے۔

ادب کا طالب علم بننے کے معنی یہ تھے کہ اپنی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر مجھے ہر طرح کا ادب پڑھنا ہے۔ اسکالرشپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ ادب کی تمام اصناف سے اس کی تاریخ سے، فکروفن کے ارتقائی مراحل سے، بلکہ ادب کی تمام روایت سے واقف ہوں۔ تقریباً پانچ سو سال کے ادب کا بوجھ۔

ادب کی تعلیم کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اب اپنے اور احباب کے ذوق (Taste) پر بھروسہ کرنے کے بجائے مختلف ادبی نظریات کی روشنی میں اپنے ذوق کی تربیت کرنی ہوگی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب شاعری میں ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی یا دوسرے رومانی اور انقلابی شعرا ہماری پسند کے شاعر تھے، فکشن میں منشی فیاض علی اور نسیم انہونوی ہمارے پسندیدہ فن کار تھے۔ لیکن ایم۔اے کی تعلیم ختم ہونے تک منظر تبدیل ہو چکا تھا۔ شاعری میں میر، غالب، میراجی، ن۔م راشد، فیض، اختر الایمان اور فکشن میں منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور دوسرے جدیدیت پسند شاعر و ادیب ہماری پسند کے تخلیق کار بن چکے تھے۔ یہ فن کار اپنے فن کی تہہ داری کے لیے مشہور تھے۔ ان میں کچھ مشکل پسند بھی تھے جن کا بنیادی حسن 'ابہام' تھا۔ اور

جن کا ادب قاری کے لیے ایک چیلنج تھا۔ ایسے میں آئی. اے رچرڈس کی تجربہ گاہ کے نتائج سے سہارا ملا۔

اس تجربہ گاہ کی تفصیل 'عملی تنقید' (Practical Criticism) میں تحریر ہے۔ رچرڈس نے کیمبرج میں شاعری کے طلبا کو تیرہ نظمیں مہیا کیں۔ بغیر عنوان کے، بغیر مصنف کے حوالے سے، اور بغیر کسی ضروری اطلاع کے۔ طلبا کو ان نظموں کی قدر متعین کرنی تھی۔ بیش تر طلبا تو کئی نظموں کے سامنے کے معنی بیان کرنے سے قاصر تھے۔ بعض کے لیے نظموں کی حسی نوعیت سمجھ سے بالاتر تھی، اور بعض کے لیے پیچیدہ پیکر پریشانی کا سبب تھے۔ لیکن رچرڈس کے نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ تکلیف دہ تھی کہ زیادہ تر قاری نظموں کے بارے میں انتہائی غیر ضروری اور غیر ذمہ دارانہ تصوّرات رکھتے تھے۔ بعض طلبا نے جذباتیت کا مظاہرہ کیا تھا، بعض نے اخلاقی مسائل اٹھائے تھے بعض نے صاف اور سادہ صورت حال پر یکساں ردِّ عمل ظاہر کیا تھا۔ اور بیش تر تکنیک اور تنقیدی اصولوں کی تفہیم اور تحسین سے نابلد تھے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ بیش تر قاری شاعری کے بارے میں اس نوع کی گفتگو کرنے سے قاصر تھے جس کا مطالبہ رچرڈس کی کتاب کرتی ہے۔ یا پھر یہ نظمیں ان سب کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ایسی صورت حال میں طلبا کی تربیت ضروری ہے کہ وہ کس طرح کا ادب پڑھیں اور کیوں پڑھیں؟

میں بھی آئی. اے رچرڈس کے مظلوم طالب علموں سے مختلف نہیں تھا (اور شاید آج بھی نہیں ہوں) لیکن میرے احباب اور بعض اساتذہ کی ادبی ترجیحات نے مجھے بھی خاص نہج پر ڈال دیا۔ میں جدیدیت پسند ادبی رجحان سے خود کو زیادہ قریب محسوس کرنے لگا۔ اس رجحان نے میرے لیے تقریباً طے کر دیا کہ میں ادب کون سا پڑھوں، کیوں پڑھوں اور کیسے پڑھوں؟

اسی ماحول کا شاید نتیجہ تھا کہ جب 'اقبال کا خصوصی مطالعہ' کے پہلے دن کے کلاس میں مجھ سے استادِ محترم خلیل صاحب مرحوم نے پوچھا کہ میں نے 'اقبال کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ میں نے جواب دیا تھا کہ شاعر اقبال کے فن کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ وہ

میرے اس جواب پر مسکرائے تھے، اور میں اس جواب کی باریابی پر خوش ہوا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانے میں مجھ پر منکشف ہوا کہ ادب پڑھ کر کسی کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اور تب میں نے مقدمہ شعر وشاعری میں حالی کے تصور شعر کی اخلاقی اساس پر شبہ کی نظر ڈالی۔ اور ترقی پسند تحریک کا افادی تصور ایک کمزور نظریہ محسوس ہوا۔ اس لیے بھی کہ ادب کے اخلاقی اور افادی تصور کو تسلیم کرنے کے یہ معنی تھے کہ ہم شاعری میں مواد اور ہیئت کی دوئی کو تسلیم کرتے ہیں اور ہمارے لیے لفظ محض وسیلہ ہے اس تصور کو پیش کرنے کا جو شاعری سے الگ اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ اور جسے شاعری کے بغیر بھی سمجھا اور جانا جاسکتا ہے۔ جب کہ ہم تو اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ مواد اور ہیئت ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ اور جب ہم ادب پڑھتے ہیں تو اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس سے ہمیں اجتماعی مستقبل سنوارنے میں مدد ملے گی۔ البتہ اس بات کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں کہ ادب کی قرأت قاری کی نفسیات پر گہرا اثر مرتب کرتی ہے۔ ارسطو نے بھی ٹریجڈی کی خصوصیات کے بیان میں کتھارسس کی بات کی ہے اور آئی۔ اے رچرڈس نے مذکورہ کتاب میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ شاعری جذبات کو معتدل بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس سے یقیناً قاری کے جذبات مراد ہیں۔ یعنی شاعری نفسیاتی علاج بھی ہے۔ لیکن ہم نہ تو ہمیشہ نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہوتے ہیں کہ ادب ہمارے لیے نفسیاتی علاج بن جائے۔ اور نہ ہی ادب پڑھتے ہوئے خوف اور رحم کے جذبات میں ہمیشہ مبتلا ہوتے ہیں جس کا کتھارسس ہوگا۔ ہم تو اپنے احساس جمال کی تسکین کے لیے ادب پڑھتے ہیں۔ وہ احساس جمال جسے ہم نے بڑے جتن سے تلاش کیا ہے اور جس کی بھرپور حفاظت کی ہے۔ اس طرح ہمیں شعر کے معنی کی تلاش میں ترقی پسند ادیبوں کی طرح فن پارے سے باہر بھٹکنے کے بجائے 'انہی الفاظ تک خود کو محصور رکھنا ہوگا جو صفحہ قرطاس' پر روشن ہیں۔ یہ سبق ہم نے جدیدیت سے حاصل کیا، یہی روسی ہیئت پسندی سے اور یہی ساختیات سے بھی کہ ادبی ساختیات بیانیہ کی تشکیل کے بنیادی ساختیہ کو دریافت کرنے کا طریق ہے جو اس نظریہ کی رو سے معنی کو ممکن بناتا ہے۔ اس طریق کار

سے میں شاعری پڑھتا ہوں۔ فکشن پڑھتے ہوئے میری تلاش بدل جاتی ہے اور میں جدیدیت کے تصورِ قرأت سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پاتا۔ میرے خیال میں جدیدیت نے پورے ادب کی جس قرأت کو فروغ دیا اسے فکشن کے لیے مناسب قرأت نہیں سمجھتا۔ میں اس باب میں سارتر کے تصور سے خود کو ہم آہنگ پاتا ہوں۔

سارتر نے اپنی کتاب The Psychology of Imagination میں فکشن اور شاعری دونوں کو 'جمالیاتی معروض' aesthetic Object تسلیم کیا ہے اور اس 'آبجکٹ' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جس کے فن کار (وابستہ) Committed ہیں اور ایک وہ جس کے فن کار Uncommitted (ناوابستہ) ہیں۔ شاعری، ڈراما اور پینٹنگ وغیرہ کے فن کار Uncommitted ہوتے ہیں۔ جب کہ فکشن کے فن کار 'وابستہ Committed ہوتے ہیں۔ جن کا مقصد سماج کے بارے میں سچائیوں کو طشت از بام کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ سماجی ناانصافیوں سے چھٹکارا پایا جا سکے۔ وابستہ مصنف اس بات سے واقف ہے کہ:

> " Word are actions. He Knows that to reveal is to change and that one come reveal only by planning to change. He has given up the inpossible dream of giving an impartial picture of society and the human condition. Man is the being toward whom no being can be impartial, not even God.-.. It is in love, in late, in anger, in fear, in joy, in indignation, in admiration, in hope, in despair, that man and the world reveal theselves in their truth."

گویا سارتر کے مطابق شاعر اور فکشن نگار دونوں کے مقاصد الگ ہیں۔ اور جب مقاصد الگ ہیں تو قرأت کا مقصد بھی الگ ہو سکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر اُردو فکشن کا اعتبار ہیں۔ جب ان کا ناول 'آگ کا دریا' شائع ہوا تو اُردو ادب کی تنقیدی فضا میں ہلچل مچ گئی۔ تب سے قرۃ العین حیدر کی مقبولیت کا گراف بڑھتا گیا۔ اور آج وہ ایک ایسا Canon ہیں جن کے بارے میں مخالف رائے کی گنجائش نہیں۔ میرؔ کی طرح، غالبؔ کی طرح۔ اور جس طرح ان دونوں کے مخالفین کو شکست ہوئی۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر کی اہمیت سے انکار کسی کے لیے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ قرۃ العین حیدر کا فکشن فنّی تجربات اور زبان و بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ لیکن میں فکشن کو شاعری کی طرح نہیں پڑھتا۔ جس طرح جدیدیت نے پڑھا۔ یا جس طرح پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے دانش ورانہ سطح پر برصغیر کی تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ ہر تبدیلی کے خلاف ہیں اور Status quo قائم رکھنے کی حمایت کرتی ہیں۔ وہ ہماری زبان کی واحد ادیبہ ہیں جنہوں نے جدوجہد آزادی کو شبہہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ کسی نظریۂ حیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے خیال میں آزادی نے ان کے خاندانی عروج یا Status کو نقصان پہنچایا ہے۔ جس کے سبب وہ اور ان کا خاندان وقت کے سیل میں سیلانی بن گئے۔ اسی لیے انھیں 'کارِ جہاں دراز ہے' کے نام سے 'فیملی ساگا' لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

میں ان کے طویل ناولوں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ اور ان کے مطالعہ کی، داد دیتا ہوں، لیکن میرے نزدیک ان کے ناولوں کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان میں Story line نہیں کے برابر یا بے جان ہے۔ ان کے کردار کسی اندرونی تضاد سے دوچار نہیں ہوتے۔ وہ کسی جدوجہد سے نہیں گزرتے، ان کے اندرون میں کوئی جنگ نہیں چھڑتی۔ عقیدہ اور عقل کی جنگ، ذہن اور جبلّت کی جنگ، مجھے دستوفسکی کے ایڈیٹ کا 'پرنس مِشکن' پسند ہے، 'جرم و سزا' کا Roskonikov پسند ہے، کامیو کا

مرسال پسند ہے، عبداللہ حسین کے ناول اُداس نسلیں کا 'نعیم' پسند ہے۔ یہ بھی تاریخ کے اندر جیتے ہیں۔ تاریخ سے باہر یا اوپر نہیں۔ قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی طرح۔

آپ کو اختلاف کرنے کی پوری آزادی ہے لیکن آپ نے اندازہ لگایا ہوگا، میں شاعری اور فکشن پڑھتے ہوئے دو الگ انداز نظر رکھتا ہوں۔ فکشن کے وسیلے سے میں خود کو، اردگرد کی کائنات کو، دوسرے کرداروں کو، سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دراصل فکشن میرے تعقل کی آماجگاہ ہے اور وہی فکشن میرے دل و دماغ کو بھاتا ہے جو میری عقل کو، Reasoning کو مطمئن کرتا ہے۔ میرے نزدیک شاعری کے مقابلے میں فکشن ایک سماجی ساخت (Social Construct) ہے۔ اسی لیے یہ سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔ اچھوتا تو شاعری بھی نہیں رہتی، لیکن شاعری میں اظہار کی نوعیت، فن کے تقاضے اور لسانی تسلسل اسے فکشن کی تعمیر سے الگ کردیتے ہیں۔ اسی لیے فکشن کی سیاسی قرأت کو ممکن ہی نہیں مستحسن سمجھتا ہوں۔ میں نے اس قرأت کو اُداس نسلیں، اور نذیر احمد کے ناولوں کی تعبیر میں رہنما بنایا ہے۔ لیکن شاعری جمالیاتی تسکین کے لیے پڑھتا ہوں۔ یہ مجھے رفعت بخشتی ہے، تھوڑی دیر کے لیے اس کثیف دنیا سے بلند ہوجاتا ہوں۔ مجھے اقبال کی فلسفیانہ موشگافیاں پریشان نہیں کرتیں مجھے راشد کی مغربی فرد پرستی سے چڑھ نہیں ہوتی۔ لیکن مجھے شکایت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں ۴۷ء کو کیوں نظر انداز کیا، اور ان کے سبھی کردار ۴۷ء کے بعد جلاوطن ہوکر انگلینڈ کیوں گئے؟ مجھے فکشن میں Stock responses بھی پسند ہیں۔ مجھے آج کے فکشن سے یہی شکایت ہے وہ ایسا کردار کیوں نہیں تخلیق کرتے، ایسی کہانی کیوں نہیں سناتے جو ہمارے وجود کو اتھل پتھل کردے۔ اور اس کردار سے ہم محبت کرنے لگیں۔

تو حاضرین۔ اس طرح میرے 'میں' نے ادب پڑھنا شروع کیا۔ ادب کے ایک عام قاری سے خصوصی قاری تک کا سفر۔ اس بیانیہ کو آپ لن ترانی جانیے۔ ورنہ اس نے کئی باتیں آپ سے چھپالیں۔ اس میں نے یہ نہیں بتایا کہ اسے بہت سے اشعار محض

اس لیے پسند ہیں کہ وہ اس کی نجی زندگی کے نشیب وفراز کے ہم سفر ہیں۔ فرانسیسی مقولہ ہے کہ:

"Art is life seen through a temperament."

یعنی یہ 'میں' یہی سمجھتا ہے کہ فن کار نے اس کے اردگرد کی دنیا کے روبرو آئینہ لگا رکھا ہے جو اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہے۔ اس آئینہ میں اس کی اپنی خوشیاں، اپنے غم، اپنی عداوتیں، اپنی نفرتیں، اپنی تنہائی اپنا فرسٹریشن اور اپنی مجبوری دکھائی پڑتی ہے۔

اس 'میں' نے یہ بھی نہیں بتایا کہ ایسی کئی ادبی اصناف ہیں جو اس کے ذہن و دل کو نہیں بھاتیں۔ قصیدہ میں شاعر کے تخیل کی اُڑان اپنی جگہ لیکن یہ صنف ضرورت سے زیادہ مصنوعی لگتی ہے۔ اس کے خیال میں جدیدیت کے تصورِ شعر سے سب سے زیادہ مرثیہ کی صنف کو فائدہ پہنچا۔ اس صنف میں انیس و دبیر نے یقیناً فن کے گہر لٹائے ہیں لیکن اسے اس صنف سے کبھی نہ تو ذہنی اور نہ ہی دلی لگاؤ پیدا ہوا۔ اس لیے وہ اس صنف کو ایک مخصوص طبقہ کی ایک طرفہ کارروائی سمجھتا ہے۔ صرف پروفیشنل مجبوری اُسے یہ اصناف پڑھواتی ہیں۔ اب آپ کو سامعین فیصلہ کرنا ہے کہ اس 'میں' نے کہاں تک موضوع کے تقاضوں سے انصاف کیا ہے۔

●

پروفیسر قاضی جمال حسین

اکثر سادہ اور معصوم سے سوالات کتنی اُلجھنیں پیدا کرتے ہیں؟ اس کا کسی قدر اندازہ تو ہر شخص کو ہوگا۔ یہ اُلجھن اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے۔ جب اس نوعیت کے سوالوں کا آپ دیانتدارانہ جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی خاص رنگ ہی کیوں زیادہ پسند ہے۔ فلاں شخص کیوں اچھا لگتا ہے؟ فٹ بال کے مقابلہ میں آپ لان ٹینس میں کیوں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان سوالوں میں نہ تو فلسفیانہ موشگافی سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی کسی حکیمانہ نکتہ رسی سے۔ لیکن ان کا اطمینان بخش جواب دینا ہر کس و ناکس کے مقدور میں نہیں! شاید ان سوالات کی سادگی ان کے جواب کو پیچیدہ بناتی ہے۔ سادگی کا تجزیہ کرنا اور معصومیت کے اسباب دریافت کرنا ہوتا بھی بہت دشوار ہے۔ پیچیدہ گرہیں کھولنا، اور مہمات سر کرنا شاید اتنا مشکل نہ ہو جتنا اس گرہ کو کھولنا جو نظر ہی نہیں آتی۔ کوئی مہم درپیش بھی نہیں اور سر کرنے میں سرگرم عمل بھی ہیں؟

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں۔

''میں ادب کیوں پڑھتا ہوں'' میں دوسری مشکل یہ ہے کہ آپ کا روئے سخن خود اپنی طرف ہے۔ جب آپ کے قائم کردہ سوالوں کا جواب اپنے آپ ہی سے مطلوب ہو تو دشواری دو چند ہو جاتی ہے۔ دلائل کی قوت اور آپ کا زور بیان مخاطب کو خاموش کر سکتا ہے لیکن خود آپ کے حق میں یہی دلائل پائے چوبیں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے کہ یہاں دلائل کی پشت پناہی سے زیادہ، بیان کی صداقت اور دیانت درکار ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ادب پڑھا تو کسی طے شدہ منصوبے کے بغیر ہی جاتا ہے۔ ہاں ادب پڑھنے سے ہمیں حاصل کیا ہوتا ہے؟ ہمارے باطنی زندگی میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں؟ اس کا ایک نامکمل گوشوارہ ضرور مرتب ہوسکتا ہے۔ آئندہ سطریں اس گوشوارے کا مبہم خاکہ ہیں۔ فقط چند خطوط ہیں جن سے تصویر کا دھندلا نقش ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ اگر ہم طے شدہ اسباب کے پیش نظر ادب پڑھتے ہیں اور ان اسباب کو روشن حرفوں میں بیان کرنے پر قادر ہیں تو شاید تطہیر اور بصیرت کی وہ روشنی ہمیں میسّر نہ ہوسکی جو ادب کے بے لوث مطالعے سے مخصوص ہے۔ ادب پڑھنے کے اسباب اور اس سے مرتّب ہونے والے نتائج دو ایسے منطق ہیں جن کی حدیں اکثر اتنی قریب آجاتی ہیں کہ دونوں کی تنقیحات گڈ مڈ ہونے لگتی ہیں۔

فرض کیجیے ادب کا استاد ہونے کے بجائے میں کسی دوسری ملازمت یا پیشے سے وابستہ ہوتا یا معاشیات یا ریاضی کا استاد ہوتا! تو ادب کے مطالعے سے ہمارے شغف کی نوعیت کیا وہی ہوتی جو اس وقت ہے؟ تو ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں'' کا سامنے کا ایک جواب تو یہی ہے کہ بخت واتفاق اور مسلسل پیش آنے والے واقعات کے نتیجہ میں ہم خود کو ایسی صورتِ حال میں پاتے ہیں کہ ادب پڑھنا ہماری ضرورت اور کس حد تک مجبوری ہے جس نے رفتہ رفتہ شوق کی شکل بھی اختیار کرلی ہے۔ اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد آج شوق اور ضرورت ایک دوسرے کے ہمدم و دمساز ہیں۔

ادب پڑھنے کا دوسرا ظاہری سبب جسے نمایاں طور پر شناخت کرسکتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے لیے سامعین کی طرف سے آنکھیں بند کرکے بہ طور اعتراف بیان کرسکتے ہیں وہ لکھنے کی ضرورت اور خواہش ہے۔ جب کسی مذاکرے، سیمینار یا ادبی رسالے کے لیے لکھنے کی خواہش ہوتی ہے تو موضوع سے متعلق کتابیں اور مضامین پڑھنا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ مطالعے کا معتدبہ حصّہ ان ضرورتوں کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے اس نوعیت کے مطالعے کو محض مجبوری کے خانے میں اس لیے بھی نہیں ڈالا جاسکتا کہ اوّلاً تو سیمینار میں شرکت یا رسالوں میں چھپنا اس درجہ کی مجبوری نہیں جس کے بغیر زیست

دشوار ہو۔ آدمی اس کے بغیر بھی آرام سے زندگی گزار سکتا ہے اور دوسرے مشاغل سے جی بہلا کر خوش بھی رہ سکتا ہے اور قدرے بے حس ہو تو لکھنے پڑھنے کو کارِ فضول سمجھ کر اس کا مذاق بھی اُڑا سکتا ہے۔ موضوع سے متعلق ضروری مواد کو پڑھے بغیر خیال کے طوطا مینا بنا کر تھوڑی دیر کے لیے انھیں فضا میں اس طرح اُڑا بھی سکتا ہے کہ ناظرین کو ان پر حقیقی ہونے کا دھوکا ہو۔ لیکن خاطر نشان رہے کہ ایسی طلسم بندی ایک خاص قسم کی ہُنر مندی کا بھی تقاضا کرتی ہے جو اب روز بروز کمیاب ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر مذاکروں میں بیش تر مضامین ایسے بھی پڑھے جاتے ہیں اور رسالوں میں اکثر تحریریں ایسی بھی شائع ہوتی ہیں کہ اگر نہ شائع ہوتیں تو بھی کوئی ہرج نہ تھا۔

ادب پڑھنے کے جو اسباب معروضی تجزیے کی گرفت میں آسکتے ہیں ان میں بیش تر سبب، خود کو اپنا معاصر بنائے رکھنے کی خواہش ہے۔ کون سے نئے مجموعے شائع ہوئے کون سا نیا ناول چھپا، کن نئے افسانہ نگاروں نے قارئین کو متوجہ کیا؟ شاعروں اور افسانہ نگاروں نے حسیّت کے کون سے نئے پہلو دریافت کیے؟ اظہار کا کون سا نیا پیرایہ ایجاد کیا۔ ہم ادب اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ معاصر ادبی صورتِ حال سے خود کو باخبر رکھ سکیں۔ یہ بات اپنے آپ میں اطمینان بخش ہے کہ شائع ہونے والی معاصر ادبی تخلیقات سے میں واقف ہوں اور ان میں اکثر کو پڑھ بھی چکا ہوں۔

ادب پڑھنا ارتکاز اور ذہنی یکسوئی کی خاطر بھی ہوتا ہے۔ جب کبھی عادۃً یا یوں ہی کسی کی لکھی ہوئی سوانح عمری، سفر نامہ، یا خود نوشت پڑھنا شروع کرتا ہوں تو علائقِ دنیا کی گرد از خود بیٹھنے لگتی ہے اور ذہن یکسو ہو کر انتشار کی کلفت سے نجات پا جاتا ہے۔ یکسوئی اور ارتکاز کی یہی کیفیت، کسی بھی مجاہدے اور ریاضت کا حاصل ہے۔ ذہنی انتشار سے نجات کی خاطر بھی ادب کا مطالعہ ہمیشہ کارگر ثابت ہوا ہے۔

ادب اس لیے بھی پڑھتا ہوں کہ بیان کے پیرایوں پر دست رس اور الفاظ کے موزوں ترین استعمال پر قدرت، اچھے اور معیاری ادب سے شغف کا لازمی نتیجہ ہے۔ روز مرّہ کی عام بول چال سے لے کر سنجیدہ ادبی تحریروں تک بیان کے اسلوب میں

خفیف سی تبدیلی، مطلوبہ ردِّ عمل کی نہج اور سطح دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آپ اپنی گفتگو یا تحریر سے مخاطب تک جو خیال یا کیفیت جتنی شدّت یا لطافت کے ساتھ پہنچانا چاہتے ہیں، وہ محض جملوں کی نحوی صحت سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے بیان کا مناسب پیرایہ، لہجہ کی موزونیت اور لفظوں کا موزوں انتخاب ناگزیر ہوگا۔ اچھے ادب کا مطالعہ اوّلاً تو ہمیں خیالات کے لطیف اور نازک فرق کو محسوس کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، نیز خیال کے گرد لپٹے ہوئے احساس کے لطیف رنگوں کو دیکھنے کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ ادبی تحریریں ہم اس آرزو میں بھی پڑھتے ہیں کہ فکر و احساس کی ان دیکھی کائنات کے دریچے ہم پر بھی کھل سکیں۔

ادب پڑھنے کے یہ چند ایسے اسباب تھے جو مدارج کے فرق کے ساتھ کسی حد تک ہماری تجزیہ کار عقل کی گرفت میں آتے ہیں لیکن وہ سبب جو عقل کی ہر تگ و تاز کو پسپا کر دیتا اور بے معنی بنا دیتا ہے، بیان کی گرفت میں کیوں کر آ سکتا ہے۔ ہستی کا ایک رُخ اگر وجود کے محسوس مظاہر کی طرف کھلتا ہے تو دوسرا راستہ عدم کی اتھاہ پنہائیوں میں بھی اترتا چلا جاتا ہے۔ بہ قول شاعر

بہ فکرِ ہستیِ خود چوں سرے فرو بردم
عدم کشود درے تا بہ یا چہ می جوئی

یا

عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

محسوس مادّی وجود کے علاوہ انسان کی باطنی کائنات اپنی رنگینی اور بے نہایتی کے سبب عجائبات کا حیرت کدہ ہے۔ ع

ہے ہر اک شخص جہاں میں ورقِ ناخواندہ

ادب ہمیں، مادّی وجود سے ماورا باطن کے اسی حیرت کدے کو اپنے طور پر دیکھنے اور اس کے عجائبات کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ تخلیق کار مضامین و موضوعات

کے لیے نئے عالم یہیں سے ایجاد کرتا اور ہماری آنکھیں اس داغِ نہاں کی چکا چوند سے خیرہ ہوتی رہتی ہیں۔

وجود و عدم یا بے خودی و ہوشیاری کے درمیان موہوم نقطۂ اتصال پر دیر تک ٹھہر کر دونوں کے جلووں سے بیک وقت لطف اندوز ہونے کا واحد وسیلہ شعروادب ہے۔ سرشاری کا یہی نادر لمحہ عرفانِ ذات سے عبارت ہے۔ اعلیٰ درجے کا شعروادب بھی اگر ہمیں خود آگہی کے نشاط سے ہم کنار نہیں کرتا تو پھر شیراز کے جہاں دیدہ اور آزمودہ کار بزرگ کا یہ شعر پڑھ کر نہایت صبر و شکر سے کسی دوسرے نفع بخش کام میں پوری تن دہی سے لگ جانا چاہیے۔ دنیا میں اور بھی سیکڑوں کام ہیں اور ہر کام کے لیے خدا نے بہت سے لوگ پیدا کئے ہیں۔ عرصۂ حیات یوں بھی بہت کم ہے، اسے ضائع کرنے سے کیا حاصل!

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

●

پروفیسر صغیر افراہیم

ادب کے ایک سنجیدہ قاری کی حیثیت سے زیرِ نظر موضوع ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں'' میں پنہاں اہم نکات و رموز پر غور کرتے وقت سب سے پہلے لفظ ''ہم'' پر نظر ٹھہرتی ہے اور اس 'ہم' کا دائرہ بہت وسیع ہے، لیکن یہاں یہ لفظ محض اپنی ذات کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اپنی پسند کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ دراصل یہ عنوان ادب کے ایک طالب علم کے لیے بہت دلچسپ، موزوں اور معنی خیز ہے کہ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں، کیا پڑھتے ہیں اور اس سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے کہ ''سود و زیاں'' کے تمام معاملات ہماری شخصیت سے جڑے ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک انشائیہ میں لکھا ہے:

> ''گناہ میں نیکی سے زیادہ لذت ہوتی ہے یا گناہ کے بیان میں نیکی کے بیان سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر گناہ مخفی ہوتے ہیں اور وہ گناہ کی باتوں کو اپنے آئینۂ مخفی میں دیکھ کر متاثر اور مسرور ہوتا ہے۔''

تو ہم نے بھی مجوزہ عنوان کے تحت اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی اور اپنے ماضی کے طریقۂ مطالعہ پر غور کیا تو یہ بات عیاں ہوئی کہ کل تک ہم ہر وہ کتاب شوق سے پڑھتے تھے جو اچھی لگ جاتی، جس سے تحیر پیدا ہوتا، تجسس بڑھتا۔ اسی لیے ابن صفی، شکیل جمالی، ایم۔ اسلم، خان محبوب طرزی، عارف مارہروی، مائل ملیح آبادی، صادق

سردھنوی، نسیم حجازی وغیرہ ہمارے لڑکپن کے پسندیدہ ادیب تھے۔ ان کی تخلیقات میں تہذیبِ نفس اور شائستگیِ اخلاق کے لیے زندگی اور سماج کے فلسفیانہ نکات بیان کیے گئے تھے جن پر میں اکثر غور وفکر کرتا۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپی اور انہماک کی وجہ یہ تھی کہ جب ان کو پڑھنا شروع کرتا تو استغراق کا ایک عالم طاری ہو جاتا۔ اور پھر ایک سحر زدہ ماحول میں، میں ایک ایسی جذباتی دُنیا کی سیر کرتا جو روزمرّہ کی دنیا سے مختلف ہوتی۔ ہوسٹل کی بے تکلف زندگی میں افسانوی ادب کی یہ انوکھی، رنگا رنگ اور دلفریب دنیا ہر طرح کی فکرو پریشانی سے آزاد ہوتی۔ عمران، فریدی، حمید، قاسم اور ڈھیر سارے تاریخی اور نیم تاریخی کردار، دوستی و دشمنی، رشک وحسد کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے نظر آتے۔ وہ یا تو نیکی کے پُتلے ہوتے یا بدی کے مجسّمے۔ اُن کے یہاں ہر چیز اپنی انتہا پر ہوتی۔ نیکی و بدی، شرافت وخباثت، بہادری و بُزدلی، محبت ونفرت، ہر چیز بلند تر اور پست سے پست تر۔ اُن تمام تخلیقات میں عموماً ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے جن کا اس سے پہلے کوئی نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خیر کا پہلو ہمیشہ حاوی رہتا جسے میرا ذہن بخوشی قبول کرتا۔

خیال وخواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں داخل ہوا تو ادب اور غیر ادب کے درمیان فرق کا احساس ہوا۔ ورنہ ماضی میں تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ ''ہر وہ چیز جو نظم و نثر میں لکھی جاتی ہے'' وہ ادب ہے۔ لیکن ہمارے اساتذہ نے غلط اور صحیح، معیاری اور غیر معیاری کی تفریق کی اور یہ بتایا کہ ادب ایک فنِ لطیف ہے۔ اس کا موضوع زندگی ہے۔ اس کا مقصد اظہار، ترجمانی اور تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ آدمی کی قوتِ اختراع ہے۔ اس کی ظاہری شکلیں وہ تراشی ہوئی ہیئتیں اور اظہار کے وہ مختلف ومنفرد پیرائے ہیں جو لفظوں کے انتخاب اور ان کے دروبست سے وجود میں آتے ہیں۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے، کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

مجھے چڑے چڑیا کی کہانیاں پسند نہیں۔ شروع سے ہی اُن فن کاروں کی تخلیقات بار بار پڑھنے کو جی چاہتا جن کو اپنا ہم مزاج اور ہم نوا پاتا، اور جو مختلف حواس کو

تحریک دیتے اور ایک وقت وہ آیا جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی کہ ادب زندگی کی پیچیدگی کا احساس دلاتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں کوئی حتمی نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ میرے لیے یہ اطلاع اہم تھی کہ ''انسان کے لیے بہترین مطالعہ خود انسان ہے۔'' خلاف واقعہ باتیں یا عقل کو حیرانی میں ڈالنے والے قصے ہمارے وقت کو ضائع کرتے ہیں کیوں کہ وہ ہمیں، اپنے آپ کو، اپنے ماحول کو، اپنی زندگی کے تہہ بہ تہہ مسائل کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دیتے ہیں، لہٰذا رفتہ رفتہ پریم چند، منٹو اور بیدی سے دلچسپی بڑھی اور شاعری میں میر، غالب اور اقبال پسندیدہ شاعر ہوگئے۔ حالی، شبلی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں کے ارشادات یہ احساس دلانے لگے کہ ادب زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے یہ انسانی زندگی کی ایسی تصویر ہے جس میں جذبات و احساسات کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات بھی منعکس ہوتے ہیں، تو پھر مجھے ادب پاروں کے مطالعہ میں حیرت و عبرت کے ساتھ ایک وجدانی سرور حاصل ہونے لگا، اور میں الفاظ کے معانی کا تعین سیاق و سباق کی روشنی میں کرنے لگا جس سے یہ واضح ہوا کہ ادب بنیادی طور پر لفظوں کا فن ہے یعنی نگارشات میں خصوصی اہمیت الفاظ کو حاصل ہے، جہاں خیال پر احساس کی تاثیر کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو میرے ادب پڑھنے اور اس سے انبساط حاصل کرنے کا زاویہ ہی بدل گیا۔ ہیئت اور الفاظ کے کھیل کو سمجھنے کی کاوش نے سوال اُٹھایا کہ ادب کا عمل کیا ہے؟ اپنے آپ اور دنیا سے کیا معاملہ ہے؟ تب یہ بھی کھلا کہ ادب ایک دریافت ہے، انکشاف ہے، ڈسکوری ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو بآسانی گرفت میں نہیں آتی ہے بلکہ مختلف اشاروں، تمثیلوں، علامتوں کے ذریعہ ذہن و دماغ میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جیسے انتظار حسین کی کہانی ''شہر افسوس''، خالدہ حسین کی کہانی ''ہزار پایہ'' یا انور سجاد کا ناول ''خوشیوں کا باغ''۔ اس طرح کی نگارشات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ادب مصنوعی صناعی (Artifact) ہے۔ اس میں تشکیلی نظام (Structuring) اور اُس کی تنظیم (Organizing) کو دیکھنا ہوتا ہے۔ مثلاً '' خوشیوں کا باغ '' اُن آفاقی سچائیوں کا اظہار ہے جو

معاشرے سے مفقود ہو رہی ہیں، لیکن پیش کش کا انداز جداگانہ ہے۔ ناول کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے:

''بوش کے خوشیوں کے باغ کا ہر پینل ایک دنیا ہے اور تیسرا پینل، تیسری دنیا۔''

اور اختتام اس پر:

''میں خواب میں جاگتا ہوں یا جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر روایتی ناولوں سے ''خوشیوں کا باغ'' مختلف کیوں ہے۔ تجسس اور گرید یکسوئی سے پڑھنے کی طرف راغب کرتا ہے اور مطالعہ احساس دلاتا ہے کہ چوں کہ مصنف پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہے اس لیے زمینی سچائیوں کی پوری کیس ہسٹری تیار کرتا ہے اور طبّی علاج کے بجائے روحانی علاج تجویز کرتا ہے۔ وہ مصوّر اور ٹی.وی آرٹسٹ بھی ہے اس لیے ہالینڈ کے مشہور مصنف ہائرانیمس بوش (Hieronymus Bosch) کے تصاویری پینلس کو سُرریلسٹک امیجز (Surrealistic Images) کے سہارے پیش کرتا ہے۔

ادب کا خاص قاری یعنی پروفیشنل ریڈر اصطلاحوں سے واقف ہوتا ہے اور وہ اُن کے توسط سے تجزیہ کرتا ہے اور اُس تیسری دنیا کو دیکھتا ہے جہاں ظلم و ستم اور مذہب کا استعمال معاشرتی ناانصافی اور جمہوری روایات کو پامال کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ ناول ہمیں فکشن کے تمام لوازمات کے ساتھ تجریدی آرٹ سے بھی واقف کراتا ہے۔

میں نے اس ناول کو مثال کے طور پر اس لیے پیش کیا کہ عام اور خاص ادب کی وضاحت کرسکوں۔ ماضی میں جو ادب شوق سے پڑھا گیا اُس کا لینڈ اسکیپ بہت وسیع نہیں تھا۔ بیانیہ میں بھی اتنی تہہ داری نہیں تھی، موضوعِ بحث ناول کو ماضی میں اپنی پسند کے ناولوں کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ''خوشیوں کا باغ'' میں

کہیں سیاست داں کی تقریر ہے، کہیں وعظ ہے، کہیں مداری کا تماشہ ہے، کہیں خط ہے، کہیں کردار کی سوچ ہے، لیکن ان تمام ٹکڑوں کو منطقی ربط دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ مونتاژ کی صورت میں اُنھیں یکجا کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی تصویروں سے مل کر صورتِ حال کی ایک بڑی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

اس طرح کی نثری اور منظوم تخلیقات کے مطالعے سے یہ تاثر ملا کہ زبان کے معاملے میں فکشن اور شاعری کی حدیں ٹوٹ چکی ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی انکشاف ہوا کہ زبان واقعی، نہایت پیچیدہ ذریعۂ ابلاغ ہے۔ اس میں ایک ہی لفظ کے مختلف معانی اور مفاہیم ہوسکتے ہیں۔ وہ یا تو مختلف چیزوں کا اظہار کرتے ہیں یا اُنھیں مختلف انداز سے استعمال کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ابوالخیر کشفی کی اس موضوع پر مُدلّل گفتگو (ادب اور ادیب، مطبوعہ ۱۹۷۱ء کراچی) سے لامحالہ اس جانب توجہ مبذول ہوئی کہ اشعار یا کہانی میں الفاظ کا حقیقی مفہوم کیا ہوتا ہے۔ مثلاً

۱۔ کم بخت تو کہاں مرگئی

۲۔ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

۳۔ ہائے اُس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط

مذکورہ بالا تینوں مثالوں میں کم بخت کا لفظ ہر جگہ ایک بالکل ہی مختلف ''تجربہ'' کا اظہار کرتا ہے۔ یا یہ دیکھیے:

۱۔ اُس کا مزاج بہت نرم ہے

۲۔ میرے لیے نرم روٹی لانا

۳۔ ہوا نرم نرم بہہ رہی تھی

یا اقبال کا یہ مصرع

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

ان مثالوں میں 'نرم' لفظ مختلف سیاق وسباق میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے اور مختلف تجربات کو پیش کرتا ہے۔ مزاج کے ساتھ نرم کے لفظ میں استعارہ کا پہلو ہے تو 'نرم

روئی' کہہ کر ایک حسّی تجربہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح میر امّن کے فقرہ ''ہوا نرم نرم'' میں ہوا کی تجسیم سے قطع نظر یہ لفظ اپنی تکرار کے ساتھ رفتار کو محسوسات کے دائرے سے زبان کے دائرے میں داخل کرتا ہے۔ اور اقبال کے مصرعہ میں نرم کا لفظ مزاج اور کردار کی کیفیت کو تشبیہ کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح ''کم بخت'' اور ''نرم'' ان دو لفظوں کے استعمال میں کچھ اشتراک کے باوجود اختلاف اور تنوع کے ایسے پہلو موجود ہیں جو ہم جیسے عام قاری کی توجہ ادب میں زبان کے عمل اور اُس عمل کی پیچیدگی اور لطافت کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

ادب کا بنیادی عمل یہی ہے کہ وہ ذہن اور حواس کے نازک ترین ارتعاشات کو زبان دے اور پڑھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ اس عمل پر اپنی توجہ مرکوز رکھے —— اب، ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہماری دلچسپی اس حد تک محدود نہیں رہتی کہ موضوع کیا ہے۔ تھیم کیا ہے، کیا کہا جا رہا ہے بلکہ ہمارا مطالعہ اب یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ زبان کس طرح استعمال کی گئی ہے، خاص طور سے ناولوں اور افسانوں میں۔ کیوں کہ یہی وہ ادبی اثاثہ ہے جو میرے لیے پڑھنے کا محرک بنا رہا، اور ذہنی دریچوں کو کھولنے کا باعث بنا۔ متن پر توجہ کا یہ انداز ہمیں تحریر کے معنی سے بے خبر نہیں کرتا۔ پڑھتے وقت یہ ضرور خیال رہتا ہے کہ اگرچہ کردار، واقعات و افعال اختراع کیے جاتے ہیں لیکن بہر حال ان کے توسط سے کسی قسم کی دنیا یا زندگی کی ترجمانی مقصود ہوتی ہے۔ پیش کردہ متن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے انسلاکات چاہے جو بھی ہوں اور الفاظ ہمارے ذہن کو جس طرف بھی منتقل کریں گھوم پھر کر ہمارے سامنے جو چیز قائم رہتی ہے وہ متن ہے۔ متن سے وفاداری ہی، پڑھنے والے کے لیے ''اصلِ ایماں'' ہے۔

●

پروفیسر طارق چھتاری

انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کا ہر عمل کسی داخلی کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کا باطن ایک مکمل کائنات کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ سرسبز زمین، نیلا آسمان، تپتے ریگستان، چاند، ستارے، دریا اور پہاڑ، سوکھی جھاڑیاں، اونچے درخت، چہچہاتے پرندے، قلانچیں بھرتے ہرن یعنی اس جہان میں جو بھی نظر آرہا ہے، محض انسانی ذات کا عکس ہے، اور کچھ نہیں۔ شاید اسی لئے کسی اداس لمحے میں، سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی انسان کو کچھ نظر نہیں آتا، جب کہ وہ اپنی زندگی کے خوشگوار لمحوں میں، کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ دیکھ لیتا ہے۔ انسان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے صدیوں کی ریاضت کے بعد اپنی ذات کو پہچاننے کا وسیلہ تلاش کرلیا اور اس کا نام ادب رکھا۔ ادب انسانی زندگی کو پہچاننے کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ اس کی تشکیل و تزئین کا ذریعہ بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جو کام ادب کرتا ہے وہ نفسیات، سماجیات اور فلسفہ بھی نہیں کرتا اور اس لئے نہیں کرتا کہ یہ تینوں علوم انسانی تجربوں کا تصوراتی، نظریاتی اور تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں، انسانی زندگی کے تجربوں کو پہلے الگ الگ کر کے اور پھر ترکیبی ضابطوں، نظام اور قوانین سے مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کے برخلاف ادب انسانی زندگی کی اکائی کو توڑتا نہیں بلکہ اسے ساری انسانی زندگی کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ ادب کی سطح پر زندہ تجربے' اتنے زندہ اور توانا ہوتے ہیں کہ

انھیں ترکیبی ضابطوں، قوانین اور تصورات کے ذریعے دوسرے کے اندر زندہ و پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ تخلیقی تخیل کے ذریعے ہی زندگی کی جیتی جاگتی صورت حال کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ اس سے جذبات کا تانا بانا بنا جا سکے۔"

(ادب کا کام۔ بادبان، شمارہ۔ ۱۱، ص ۱۹۶)

ادب انسانی زندگی کی جیتی جاگتی صورت حال کو اجاگر بھی کرتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ جب انسان کو رلاتا ہے تو نفس کو پاک کر کے اس کے تمام دکھ دھو ڈالتا ہے اور جب اسے ہنساتا ہے تو اس کے غموں کو اس طرح بھلا دیتا ہے جیسے ستاروں کی جھلملاہٹ تاریکئ شب کے احساس کو بھلا دیتی ہے۔ فلسفے، افکار اور زندگی کے پیچیدہ مسائل جب ادب کی پناہ میں آتے ہیں تو ان کے سربستہ راز اور پوشیدہ گوشے روشن ہونے لگتے ہیں اور ادب قارئین کے لیے مشعل راہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کی ناکامیابی، پشیمانی اور لغزشیں ظرافت کے پیرائے میں فن پارے کا حصہ بنتی ہیں تو ادب قاری کے شعور و احساس کے بوجھل پن کو دور کر کے اسے فرحت و انبساط بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب پڑھنا انسان کا سب سے محبوب مشغلہ رہا ہے۔

اگر ہم اپنے معاشرے کے پس منظر میں ادب کے قارئین کا جائزہ لیں گے تو پائیں گے کہ ابھی کچھ برس پہلے تک ہر discipline کے اشخاص کو ادب سے یکساں دلچسپی ہوتی تھی۔ ادھر کچھ عرصے سے مشہور ہوا کہ یہ Specialization کا زمانہ ہے۔ اگر کسی کو اچھا ڈاکٹر، انجینیر، سائنس داں، فلسفی، ماہر نفسیات یا ماہر معاشیات بننا ہے تو اسے صرف اپنے مضمون پر توجہ دینی چاہیے تاکہ وہ اپنے Profession کے ساتھ انصاف کر سکے، لہذا Professionals کو بہت اہمیت دی جانے لگی اور لفظ Professional جو گزرے زمانے کی ہندوستانی تہذیب میں، جہاں خدمت خلق کے لیے تمام عمر صرف کر دینا باعث فخر تسلیم کیا جاتا تھا، اکثر منفی معنوں میں ہی

استعمال ہوا کرتا تھا، وہی لفظ اب نہ صرف یہ کہ مثبت معنی میں استعمال ہونے لگا بلکہ Professionalism کو کامیاب شخص کی اعلیٰ صفت سمجھا جانے لگا۔ظاہر ہے کامیابی کے معنی بھی تبدیل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب ہی کیا تمام فنون لطیفہ کو کارِ زیاں سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔اب ادب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جو ادب تخلیق کرتے ہیں یا ادب کی تدریس سے وابستہ ہیں ان کے علاوہ ادب کے قارئین برائے نام ہی باقی رہ گئے ہیں تو اس صورت حال کے نتیجے میں کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ تصورِ انسان اور تصورِ کائنات کا زوال ہوا چاہتا ہے۔لہذا جب انتظار حسین نے کہا کہ:

''آخر ایک میدان آیا جہاں دیکھا کہ ایک خلقت ڈیرا ڈالے پڑی ہے۔ بچے بھوک سے بلکتے ہیں۔ بڑوں کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں، شاداب چہرے مرجھا گئے ہیں۔ میں وہاں پہنچا کہ اے لوگو کچھ بتاؤ کہ یہ کیسی بستی ہے اور اس پہ کیا آفت ٹوٹی ہے کہ گھر قید خانے بنے ہیں اور گلی کوچوں میں خاک اڑتی ہے۔ جواب ملا کہ اے کم نصیب تو شہرِ افسوس میں ہے اور ہم سیہ بخت یہاں دم سادھے موت کا انتظار کرتے ہیں'' (شہرِ افسوس)

تو سراج میر نے فرمایا:

''یہ دراصل ایک تصورِ انسان اور تصورِ کائنات کے زوال کا عمل ہے۔''

''جسے حق کہتے ہیں وہ بھی باطل ہے۔'' (شہرِ افسوس)۔اسی لئے ہمارے معاشرے میں ڈاکٹر، سائنس داں اور ماہر اقتصادیات، سب ہیں بس انسان نہیں ہیں۔ چونکہ انسان کو انسان بنانے کے عمل میں ادب نے ہمیشہ سے ایک اہم کردار ادا کیا ہے تو پھر اس عہد میں ادب کی اہمیت سے اور ادب پڑھنے کی افادیت سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

دنیا میں انسان کی فتوحات کی داستان بہت طویل ہے۔اس نے آسمانوں پر کمندیں ڈالی ہیں تو سمندر کی تہوں کو بھی کھنگالا ہے۔ اس نے ہوا، پانی، روشنی، آواز اور عکس سبھی کو اپنا تابعدار بنا لیا ہے مگر "وقت" وہ واحد شے ہے، جس پر انسان کبھی

حکمرانی نہیں کر سکا۔ وہ ہر لمحے وقت کے حصار میں ہے مگر وقت کبھی اسکی دسترس میں نہیں رہا، وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ گزر جانے کے بعد ہی احساس ہوتا ہے کہ وقت آیا تھا اور گزر گیا۔ گزرے ہوئے لمحات انسان کے ذہن و دل پر رفتہ رفتہ اتنے گہرے نقوش قائم کرنے لگتے ہیں کہ اس کے دل میں ان لمحوں کو پھر سے جینے کی خواہش شدت اختیار کر لیتی ہے مگر وقت نکل چکا ہوتا ہے، عکس باقی رہ جاتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس اور دولت کسی میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی جو انسان کو گزرے ہوئے زمانے میں لے جاسکے، خواہشات کے انھیں بے قرار لمحوں میں ہم ادب کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ ادب میں وہ طاقت ہے کے وقت اور زمانے کو اس کی اصلی حالت میں وہ لمبے عرصے تک زندہ رکھ سکتا ہے۔ ایک ادب ہی ہے جو تمام تر جزئیات اور کیفیات کے ساتھ زمانے کو تھامے رکھتا ہے۔ جب ہم گزرے وقت کے ماحول میں سانس لینا چاہتے ہیں، اس دور کے افراد کے ساتھ جینا چاہتے ہیں، اس عہد کی پیچیدگیوں میں الجھنا چاہتے ہیں، چھوڑی ہوئی زمینوں کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہتے ہیں یا گزرے زمانے کو آئینہ بنا کر آنے والے زمانے کا ادراک چاہتے ہیں تو ادب پڑھتے ہیں۔

انسان کی اپنی شخصیت اس کے لیے ایک Black Hole کی مانند ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور ایک دن ذات کے سیاہ غار میں غرق ہو جاتا ہے۔ بس ادب ہی ہے جو انسان کو عرفان کی اس منزل تک پہنچا سکتا ہے جہاں اس پر اپنی ذات منکشف ہو جاتی ہے اور وہ خود کو اصل شکل میں دیکھ پاتا ہے۔ ادب کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ مذہب، فلسفہ، تاریخ، سیاست، سماجیات، معاشیات اور سائنسی ایجادات، سبھی کچھ ادب کے دائرے میں آتا ہے۔ بلکہ وہ کام جو بقول جمیل جالبی:

> ''نفسیات، سماجیات اور فلسفہ انجام نہیں دے سکتے، موثر انداز سے صرف تخلیقی ادب انجام دیتا ہے۔ انسان خواہ خلاؤں میں پرواز کرنے لگے، مریخ اور عطارد پر ڈیرے جمادے، سائنس انسان کی ساری موجود تہذیب کو بدل کر رکھ دے، جب تک انسان اپنی موجودہ ہیئت

میں ایک سالم اکائی کے طور پر زندہ و باقی ہے، ادب کی اہمیت ہر صورت میں ہمیشہ باقی و برقرار رہے گی۔"

(ڈاکٹر جمیل جالبی۔ادب کا کام۔بادبان،۱۱،ص ۱۹۶)

ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے تجربات کی عمر طویل سے طویل تر کر سکتا ہے۔ دیگر علوم ہمارے تجربات نہیں ،ہماری معلومات بڑھاتے ہیں صرف ادب ہی ہے جو ہماری ذات کا حصّہ بن جاتا ہے اور گزرے ہوے سیکڑوں برسوں کے تجربات کو ہماری اپنی طبعی عمر کے تجربات میں شامل کر کے گویا ہماری عمر طویل کر دیتا ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم خوش نصیب ہیں جو ادب پڑھتے ہیں اور ادب اس لیے پڑھتے ہیں کہ ہم کائنات کے بارے میں،اپنے عصر کے بارے میں اور جو نہیں دیکھے ان زمانوں کے بارے میں محض جاننا نہیں چاہتے بلکہ ان کا Experience کرنا چاہتے ہیں انھیں Feel کرنا چاہتے ہیں،ادراک،عرفان اور وجدان چاہتے ہیں یعنی ہم ادب اس لیے پڑھتے ہیں کہ بصیرت چاہتے ہیں محض بصارت نہیں۔

●

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

بقول محمد حسن عسکری:

''وجود کی دو قسمیں ہیں، ایک تو محض مادی وجود جو پتھروں کو بھی حاصل ہے۔ دوسرے آگاہی اور شعور کے وہ لمحے جو انسان کو کبھی کبھی میسّر آتے ہیں۔'' (مجموعہ محمد حسن عسکری، ص ۵۵۹)

آگہی اور شعور کے یہ لمحات ادب کے وسیلے ہی سے ہمارے ہاتھ آتے ہیں۔ کسی ناول، کسی افسانہ یا کسی شعری فن پارے کی قرأت ہمارے اندر اس تفکر کو جنم دیتی ہے جس کے نتیجے میں ہم اپنے ذاتی تجربات کا دوسروں کے تجربات سے مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ میں اور مجھ جیسے دوسرے آدمی کون ہیں؟ انسانوں کی یہ فصل کون اگاتا ہے اور کون کاٹتا ہے؟ ہم سب کدھر سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ یہ اور اس قسم کے صدہا سوالات ہمارے اندر ہزار قسم کی شادمانیاں، ہزار قسم کی مایوسیاں اور ہزار قسم کا استعجاب پیدا کرتے رہتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟ ۔۔۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ ۔۔۔ نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

مصنّف کا عنوان: ''ادب کا بڑا باغ''

نسلِ انسانی کی ساری روحانی مایوسیاں، مجبوریاں، معزوریاں، اس کی ساری حسرتیں، آرزوئیں ادب کے آئینہ خانے ہی میں جلوہ گر ہیں:

ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی　　جو کچھ بھی اتیجے ہے جی میں، سو مار رکھتے ہیں
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں　　تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر　　منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

ادب کی بنیاد تجربے اور احساس پر ہوتی ہے۔ تجربے سے مراد ہر وہ حادثہ ہے جس سے ذہن دوچار ہوتا ہے چاہے وہ بظاہر اہم ہو یا غیر اہم۔ احساس سے مراد ہر وہ ردِّعمل ہے جو ان تجربات کی وجہ سے ذہن کے پردے پر رونما ہوتا ہے۔ جس طرح زندگی کے جلوے صد رنگ، لامحدود اور لحہ بہ لحہ تغیر پذیر ہیں، اسی طرح انسان کے تجربات اور احساسات بھی بوقلموں اور گوناگوں ہیں۔ ادیب یا شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک ٹکڑے کا انتخاب کرتا ہے پھر اسے اپنی شخصیت کی رنگارنگی اور مزاج کی بلندی سے آمیز کر کے تخیل کی بھٹی میں تپا کر ایک نئے رنگ و آہنگ میں پیش کر دیتا ہے۔ جس طرح انسانی وجود گوشت پوشت کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ''احسن تقویم'' کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اسی طرح زندگی کا کوئی سادہ سا نقش بھی تخئیل کے نگار خانے سے ایک نیا حسن اور نئی آب و تاب لے کر نکلتا ہے۔ ادب کا مطالعہ درحقیقت تخیل کی اسی نادرہ کاری کا مطالعہ ہے۔

بلند پایہ ادبی متون کی قرأت ہمیں ایک خاص طرح کی ذہنی مسرت اور لطف و انبساط سے بھی ہم کنار کرتی ہے۔ اس روحانی اہتزاز و انبساط کا سرچشمہ کبھی تو خود تجربے کی ندرت و انفرادیت ہوتی ہے اور کبھی اس کی تشدید۔ تشدید سے مراد یہ ہے کہ معمول کے تجربے میں فن کار احساس کی وہ شدت پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے نتیجتاً قاری اہتزاز و انبساط اور حیرت و استعجاب کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ ناچیز راقم سطور ایسے فن پاروں کا خاص طور پر دلدادہ ہے۔ اس کی ایک مثال

ملاحظہ ہو۔ مولانا جامیؔ نے یوسف زلیخا کا آغاز غالباً اس شعر سے کیا ہے:

الٰہی غنچۂ امید بکشائے　　　گلے از روضۂ جاوید نمائے

''روضۂ جاوید'' اور ''غنچۂ اُمید''۔ جامی کے تراشیدہ پیکر ہیں، لیکن ان میں غیر معمولی شدت نہیں ہے۔ دیا شنکر نسیم نے بات آگے بڑھائی اور مثنوی کا آغاز اس طرح کیا:

یارب مرے خامہ کو زباں دے　　　منقار ہزار داستاں دے

زبان خانہ کی منقار ہزار داستاں سے نغمہ زنی تخیل کا کرشمہ ہے، جس کے حسن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب غالب آتے ہیں اور ہمیں انبساط سے گزار کر استعجاب کی انوکھی دنیا میں چھوڑ آتے ہیں:

گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے　　　کہ خامُشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

استعجاب اس لیے کہ یہاں خامُشی سے پیرایۂ بیاں کی تراوش ہو رہی ہے۔

ادب میں ایک ساحرانہ عمل کے ذریعے پرانی اور مانوس اشیا نئی نئی شکلیں اختیار کرنے لگتی ہیں۔ ادیب یا شاعر کا زرخیز تخیل احساسات کی ان پرچھائیوں کو مناسب الفاظ و تعبیرات عطا کرتا ہے۔ اسالیب بیان کے حیرت انگیز نمونے بھی ادب ہی کی دنیا میں نظر آتے ہیں۔ ادبی شاہکاروں کے مطالعے کے دوران ہم ان سے محظوظ بھی ہوتے رہتے ہیں اور اکتساب فیض بھی کرتے جاتے ہیں۔ صدہا نازک استعارے، ہزارہا نادر تشبیہیں، بے شمار مجازات و کنایات ہمارے ذہن و حافظہ کا جزو بنتے جاتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال کا ہنر اور اس کی نازک دلالتوں کا شعور مطالعۂ ادب کا ہی رہین منت ہوتا ہے۔ یہ بے زبانوں کو زبان اور گونگوں کو گویائی عطا کرتا ہے۔

افسانوی ادب کے مطالعے سے بہ طور خاص ہمیں حیات و کائنات کے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہماری خود آگاہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ زندگی کے دکھ درد مسرتوں اور شادمانیوں، مایوسیوں اور مجبوریوں کے ہزار پہلو سامنے آتے ہیں۔ باطن یک دیگر سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ قضا و قدر کے بے رحم ہاتھ انسانوں سے کس

طرح کھیلتے ہیں؟ آباد بستیوں پر موت کا مسخرہ کس طرح شب خون مارتا ہے؟ نسل انسانی کی کھڑی کھیتیاں کس طرح تہس نہس کی جاتی ہیں؟ ان سب کی لرزہ خیز داستانیں افسانوی ادب کا موضوع ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہمارے باطن کی تطہیر، توسیع اور تقلیب ہوتی ہے۔

پس ہم ادب اس لیے پڑھتے ہیں:

کہ ہماری خود آگاہی میں اضافہ ہو۔

زندگی اور اس کے جلوہ ہائے صد رنگ اپنے خیر و شر کے ساتھ ہم پر عیاں ہوں۔

ہمارے بہترین اذہان کے بہتر رشحات فکر ہماری دسترس میں آئیں۔

انسانی تخیل کی حیرت انگیز بلندیوں، زبان و بیان کی سحر طرازیوں اور لفظ و معنی کی پُر اسرار وادیوں تک ہماری رسائی ہو سکے۔

اور سب کے آخر میں یہ کہ ہماری زبان بے زبانی کو زبان مل جائے۔

اس سنجیدہ اور گاڑھی گفتگو کے بعد آپ سب کی ضیافت طبع کے لیے جوشؔ ملیح آبادی کا ایک طنزیہ مکتوب بنام نیاز فتح پوری پڑھ کر سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس کا پس منظر جوشؔ کی شاعری پر نیاز کی تنقیدیں ہیں۔ یہ خط جولائی ۱۹۵۵ء میں ''نگار'' میں شائع ہوا تھا۔ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے سپاہیوں میں یاد لش بخیر، ایک ستر بہتر برس کے ناتواں، لیکن بلا کے تیکھے اور کڑوے نو مسلم ٹھاکر، ''اللہ بخشے'' ہدایت اللہ خاں اور ہمارے قرابت داروں میں ایک تھے نوجوان قومی ہیکل اور قیامت کے ظرافت پسند خلیل اللہ خاں۔''

خلیل اللہ خاں آج بھی زندہ ہیں لیکن چونکہ ان کی وہ ظرافت باقی نہیں رہی، جو روتوں کو ہنسایا کرتی تھی اور اس بنا پر وہ اب ''وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے'' کے زمرے میں آچکے ہیں، اس لیے ایک تھے خلیل خاں۔ چنانچہ ایک روز سریع الاشتعال ہدایت اللہ خاں کے غیظ و غضب کا تماشا دیکھنے کی خاطر ان کے بیڑے

کے ایک سپاہی نے ان سے کہا" ہدایت اللہ خاں تمھاری مونچھوں سے تو چنگاریاں اڑا کرتی ہیں، تمھیں اپنے پوتے کی بھی کچھ خبر ہے؟"

"ہم رے پوتے کی کیا بات کرت ہو" ہدایت اللہ خاں نے خوخیا کر جواب دیا۔ اس پر اُس سپاہی نے، اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھما کر کہا کہ" خلیل خاں تمھارے پوتے کو" بڑے باغ" کی ہوا کھلاتے پھرتے ہیں۔"

"ہم رے پوتے کا؟" ہدایت اللہ خاں نے تین بل کھا کر کہا اور ان کی سفید داڑھی کے بال ساہی کے کانٹوں کی طرح یکا یک کھڑے ہو گئے۔

ابھی ان کے اعصاب کی کھولن کم نہیں ہونے پائی تھی، اور اُن کے چہرے کی جھرّیاں آپس میں گتھی ہوئی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خاں محل کے پھاٹک پر نمودار ہوئے اور ہدایت اللہ خاں نے جوانوں کی سی چستی کے ساتھ معاً کھڑے ہو کر خلیل خاں سے، اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا کہ" کھلیل کھاں ہم تم سے یو پوچھت ہیں کہ یو تم کا ہم رے کالے پوتے میں کا مجا آوت ہے کہ تم اُس سار کو باگن باگن کی ہوا کھلات پھرت ہو۔"

اور قبل اس کے کہ مسکراتے ہوئے خلیل خاں کچھ جواب دیں، ہدایت اللہ خاں نے اپنے سوکھے ہاتھ میں لاٹھی بلند کرلی۔ یہ دیکھتے ہی دوسرے سپاہی اور خدمت گار دوڑے اور ایک نے ان کی لاٹھی پکڑ کر کہا۔" گھاس کھا گئے ہو ہدایت اللہ خاں اگر خاں صاحب بہادر کو خبر ہو گئی تو جانتے ہو کہ اس بڑھوتی میں تمھاری کیا گت بنا دی جائے گی۔"

غرض کہ اس روز کا یہ ہنگامہ رفت و گزشت ہو گیا۔ لیکن ناعاقبت اندیش و کینہ پرور بوڑھا ٹھاکر بھول جانے یا معاف کر دینے والا انسان نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقع کے دوسرے ہی دن وہ بوڑھا رینگتا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا "بڑے باغ" پہنچ کر" گاڑے" پر بیٹھ گیا۔ اور جب اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ خلیل خاں، حسب دستور ہدایت اللہ خاں کے" کالے" پوتے کو لیے ہوئے بڑے

باغ میں نمودار ہوئے تو اس بر چھائے ہوئے بوڑھے نے ڈپٹ کر آواز دی کہ" ٹھار ہو جاؤ کھلیل کہاں بڑے جیوٹ ہو تو آؤ اور دوئی دوئی بات کر لیو۔"

دادا کا یہ تھرتھراتا نعرۂ جنگ سنتے ہی ان کا پوتا تو غزالِ وحشی کی طرح، چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا، اور خلیل خاں نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہدایت اللہ خاں تم بوڑھے آدمی ہو۔ میں تم پر کیا ہاتھ اٹھاؤں، ہاں تم اپنا حوصلہ نکال لو۔"

"اچھا بڑے جوان بنت ہو" کہہ کر ہدایت اللہ خاں نے اپنی داڑھی دانتوں مین دبالی اور اپنی پوری جسمانی و روحانی طاقت کے ساتھ یہ یقین کر کے بھرپور لاٹھی ماری کہ پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا بھیجا بہتا نظر آئے گا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنی لاٹھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا "فش" اس غیر متوقع حیرتِ ذلت آمیز سے بلبلا کر ہدایت اللہ خاں نے "پھس پھس کا گرت ہے اور لے" کا نعرہ بلند کر کے دوسری لاٹھی ماری۔

خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر "فش"

"اے پھس پھس کا کرت ہے اور لے" کھٹاخ "فش"
"اے پھس پھس کا کرت ہے اور لے" کھٹاخ "فش"
"اے پھس پھس کا کرت ہے اور لے" کھٹاخ "فش"

الغرض خلیل اللہ خاں کی "فش" اور ہدایت اللہ خاں کی "پھس پھس کا کرت ہے اور لے"۔ نے اس قدر طول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دم پھول گیا، اس دم پھولنے میں بھی آخری بار پھس........پھس........کا........کرت ہے۔ کہہ کر وہ بے چارے دھڑام سے گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

سنتے ہیں تاریخ اپنے کو دہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ بالکل اسی طرح ایک فتح پوری نیاز محمد خاں عرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں عرف "نگار باز" پچیس تیس برس

تک یہی ''فش'' اور ''پھس پھس کا کرت ہے اور لے'' کا کھیل کھیل کر ابھی چند ماہ ہوئے کہ فارغ ہوئے ہیں۔

اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ نئے فتح پوری ہدایت اللہ خاں، انتقاد کے بڑے باغ میں چاروں خانے چت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور نئے ملیح آبادی خلیل خاں ''شکر خورے کو شکر'' اور موزی کو ٹکر'' کی زندہ مثال بنے ہوئے فتح پوری کی، زرد رو شہرت انتقاد کو ہدایت اللہ خاں کے کالے پوتے کی طرح۔ باغوں باغوں کی ہوا کھلاتے پھر رہے ہیں۔

جاہلانہ انتقاد	مردہ باد
غیظِ ناتوانی	مردہ باد
احساسِ کم تری	مردہ باد
بغضِ للّہی	مردہ باد

اور

پھس پھس کا کرت ہے اور لے	مردہ باد

والسلام
جوشؔ

یہاں اس خط کے نقل سے یہ بتانا ہے کہ ہم سب بھی ادب کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں اور ہمیں بھی ادب کے ''بڑے باغ'' کی سیر کا مزا مل گیا ہے۔ لہٰذا سائنس، ٹکنولوجی اور صارفیت کے ہدایت اللہ خاں ہم پر لاکھ لاٹھیاں برسائیں، ہم خلیل خاں کی فاختہ بنے ہوئے ادب کے باغوں باغوں کی سیر کرتے رہیں گے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ کس طرح ایک معمولی تجربہ شخصیت کی رنگ آمیزی، تخیل کی نیرنگی اور زبان کی نشتریت سے آراستہ ہو کر ادبی فن پارے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

●

محترمہ کنیز خواجہ احمد

سب سے پہلے تو اس مذاکرے کے منتظمین کی تعریف کرنا چاہتی ہوں کہ انھوں نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور اس کے لیے ان کی شکرگذار ہوں کہ انھوں نے مجھے گفتگو کے لیے وہ عرصہ فراہم کیا جس کی سیر (گل گشت) سے مجھے بے حد مسرّت ملتی رہی ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ اس بار میں فرحت کے اس تجربے میں اپنے دوستوں، معاصرین اور طالب علموں کو شریک کروں گی۔ میں اس کا اعتراف کرتی ہوں کہ میں دانستہ طور پر اس مسئلہ کا مفہوم قدرے تبدیل کروں گی تاکہ اس گفتگو کے اختتام پر قدرے غیر دانشورانہ کلام کا جواز پیدا ہو جائے۔ قرأت کی ''معنیات'' کی قدرے توسیع کرلی جائے تاکہ وہ چیز جسے امریکی شاعر ROBERT FROST اپنی نظم میں MENDING WALL کہتا ہے اور اسے شامل کرسکوں جو میرا منشا ہے۔

لیکن سب سے پہلے ''مطالعۂ ادب کے اسباب''؛ اس موضوع کے دو مرکزِ توجہ ہیں: ادب اور قرأت۔ دانشورانہ مباحثوں میں پہلی کی اصل وصفات کے متعلق تجزیاتی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ TERRY EAGLETON نے مختلف تنقیدی تناظر میں ادب کے بدلتے ہوئے تصور کی تفتیش کی ہے۔ لیکن ایک مفہوم میں جستجو کرنے والا دونوں اصطلاحات 'ادب' اور 'ادبی' کی واقعی تعریف متعین کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ EAGLETON توضیحی یا تشریحی بیانات دیتا ہے، لیکن پھر مسلسل اور متعدد ملتوی کیے جارہے دلائل کی روشنی میں خود اس کی تردید کرتا ہے جو لامحدود تک کھلے

ہوئے ہیں۔ روسی ہیئت پسندوں کے مواد کی قیمت پر ہیئت پر اصرار اجنبیانے (Defaniliaizing) اور 'ایک لسانی تشدد' سے اپنے مطالعے کی ابتدا کرتے ہوئے یہ نظریہ ساز ادب کی خود انعکاسی (SELF REFERENTIAL) جہت، اس کے عملی اور وجودی متعلقات کے حوالے سے بالآخر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ——

''ادب اس مفہوم میں خالص کھوکھلے نوع کی تعریف ہے۔''

ایک اور جگہ EAGLETON لکھتا ہے:

''بحیثیت ایک کل اور اجزا ادب مختلف ادیبوں، نقادوں اور مؤرخین کے لیے مختلف معنی رکھتا ہے۔''

ادب پر اپنی کتاب میں WIDDOWSON لفظ ادب کا آغاز ارسطو کے نظریۂ نقل اور جمالیاتی مباحث میں اس کے داخلے سے کرتا ہے۔ WIDDOWSON لکھتا ہے کہ لفظ براہ راست یا بالواسطہ فرنچ لفظ ''LITERATURE'' یا لیٹن لفظ ''LITTERATURA'' سے لیا گیا ہے، جس میں LITTERS کے معنی ''کتاب پڑھنا یا کتابوں سے مانوسیت'' ہے۔ اس قیاس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے WIDDOWSON نظریہ سازوں اور تخلیق کاروں کے متعدد بیان پیش کرتا ہے، جس میں اس تصور کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ DAICHES, WIDDOWSON, EAGLETON جائزے کا طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ ادب کی غیر متعین تعریفوں تک پہنچ جائیں۔ ادب میں یہی طریقہ رائج ہے، لیکن اس لفظ کے ساتھ منسوب ابہام زیادہ گہرا اور گھنا ہو گیا ہے۔ دانشور اور ادب کے نظریہ ساز ARNOLD, COLERIDGE, DRYDEN سے لے کر نئی تنقید کی شدت کار اور متن کی گہری تجزیاتی قرأت تک، اور پھر بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی میں کثرت تعبیر پر مرکوز مثلاً ہیئتی تنقید، نسائیت، نوآبادیت، پس نوآبادیت، ساختیات اور لاتشکیل تک ادب کی تعریف مختلف ادبی نظریات سے گذری۔ یہ مواقفِ ادب یا متن (اپنی جدید اصطلاح میں) کے لامحدود معنی، داخلی کثرت، داخلی اور ظاہری روابط، تناسب، Roots، بے دخلی، معنیات، اشارے،

غیاب، احضار، افتراق، تخم ریزی (DISSEMINATION) کی دریافت کے لیے دانشورانہ اور ذہنی اعمال ہیں جو اس تجزیاتی نظام کلام کی خصوصیت ہے۔ تشخیص کا یہ پورا عرصہ دانشورانہ اور تعقلی ہے، متن کے تئیں اس میں جذباتی ردِّ عمل یا ذاتی احساسات نہیں ہیں۔

ایسی ہی ایک تعبیر جس کا تعلق اس موجودہ موضوع سے ہے، متن کا قاری اساس نظریہ ہے۔ اس مفروضے پر کہ مصنف کا انتقال ہو چکا ہے اور قاری ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔ یہ نظریہ قاری اور متن دونوں کے درمیان ربط سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ان غیر واضح طریقوں کو روشن کرتا ہے جن میں قاری ادبی فن پارے کی تفہیم کے عمل میں شریک ہوتا ہے۔ اس میں وہ تناظر شامل ہے جو قاری اور متن کے درمیان ربط سے اُبھرتا ہے۔ ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ جب تک پڑھا نہیں جاتا متن کا کوئی وجود نہیں ہوتا کہ متن میں معنی کی حیثیت امکانی ہوتی ہے۔ قاری اپنی قرأت اور متن کے تجزیہ کے ذریعہ اس نمایاں امکان کو فعال کرتا ہے۔ متضاد اصولوں اور CODES کے ذریعہ تجزیہ نگار متن کھولتا ہے۔ آئی زر (ISER) کے طریقے میں ایک دیے ہوئے مواد میں وقفے، خالی جگہیں اور کمیاں دریافت کی جاتی ہیں۔ واقعی قاری اور متصور قاری میں فرق کرتے ہوئے ISER دکھاتا ہے کہ متن کیسے اپنے قاری کے لیے معیاد مقرر کرتا ہے۔ متن ایک ''معروض'' ہے جس کا کوئی معلوم فاعل نہیں اور قاری اس کی تعبیر کرتے ہوئے اس خلا کو پُر کرتا ہے۔ قرأت کے عمل میں، ISER کا خیال ہے کہ:

> ''جب قاری کی توقعات اور متن کا نظام ہدایت ایک دوسرے کے متوازی ہوتے ہیں تو معنی کی تشکیل کے لیے ایک متحرک تناؤ موجود ہوتا ہے۔''

قاری کو اپنے موجودہ شعور اور فہم میں متن کی جدلیات کے عمل کو قبول کرنے کے لیے مناسب ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ مفروضہ قیاسی قاری اور واقعی قاری شعور کی مختلف سطحوں پر مختلف طریقوں سے ردِّ عمل ظاہر کرتے ہوئے ایک ساتھ موجود ہو سکتے ہیں۔ اس (آئی زر کے طریقۂ کار) کے متعلق یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا قاری جو معاشرتی، تاریخی

اور تہذیبی اقدار کا تصوراتی نظام فراہم کرتا ہے متن پر من مانی تعبیر عائد نہیں کرتا کہ وہ اسے ظاہر کرے، یا کیا متن خود قاری کی تعبیر و تشریح کا مواد نہیں ہوتا۔

یاؤس (JAUSS) کا طریقہ جو 'توقع کے افق' کے تصور سے متعلق ہے، ان نظریات کے درمیان مصالحت ہے جو تاریخی تناظر کو نظر انداز کرتے ہیں اور جو متن کو حاشیے پر رکھتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں قاری ادب یا اصناف کی ادبیت کی قدر شناسی کے مختلف پیمانے اختیار کرتا ہے۔ ادب کی آفاقیت کے تصور کی تخفیف کرتے ہوئے یاؤس کہتا ہے:

''ادب لافانی / ماورائے زماں ناقابلِ فراموش / یادگار لمحہ نہیں ہے جو ہر زمانے میں ہزاروں پڑھنے والوں پر یکساں مفہوم اور اثر ظاہر کرے اور چوں کہ ہر زمانے کے لیے کوئی ایک یکساں پیمانہ یا تعبیر و تشریح کی یکساں روایت نہیں ہوتی اس لیے تاریخی یا سیاقی (SITUATIONAL) پیمانوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال میں ذاتی طور پر محسوس کرتی ہوں کہ تھیوری، جواب اس مرتبہ پر پہنچ گئی ہے کہ خود ایک الگ شعبۂ علم (DISCIPLINE) تصور کی جاتی ہے، ماورائیت اور آفاقیت کے خلاف ہے۔ انسانی جذبوں کی تخفیف / تضحیک کرتے ہوئے دانشوروں اور تبصرہ نگاروں نے فن پاروں کو ان ثانوی ماخذوں سے باندھ دیا ہے جنھیں الگ الگ کرنا آسان ہے۔ ادب میں ماورائیت اتنی ہی ذو معنی ہے، جتنی کہ یہ اصطلاح خود ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ مصنف اس کے کیا معنی لیتا ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ دانشور یا نقاد کی معنی کی جستجو کا نتیجہ بھی یہی ماورائیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی متن تاریخ، بشریات یا جنسی تعصب کے ساتھ باندھ دیا جا رہا ہے تب بھی خالق کا تجربہ مرتا نہیں ہے، بلکہ زمان و مکان سے ماورا ان تمام ذہنوں تک پہنچتا ہے جو اسے مَس کرتے ہیں یا اس میں معنی تلاش کرتے ہیں۔ نظری مواقف (تھیوریز) بدل سکتے ہیں مگر ادب زندہ رہتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔

قاری اساس نظریہ کا امریکی نظریہ ساز اسٹینلی فش (Stanley Fish) اس نقطۂ نظر کو 'جذباتی اسلوبیات' کہتا ہے۔ فش ایک ایسے تعبیری یا تشریحی معاشرے کا

تصور کرتا ہے جس میں اکثریت کی رائے کو معیّنہ طور پر صحیح تصور کیا جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے درمیان ایک تعبیری حکمت عملی مشترک ہوتی ہے۔ یہ قاری کی جماعت بندی ہے جس میں اس کی ایک حلقہ جاتی شناخت بن جاتی ہے، جس سے قرأت یا رائے میں ایک امکانی استحکام پیدا ہوجاتا ہے بشرطیکہ پڑھنے والے ایک ہی تعبیری معاشرے کے فرد ہوں۔ فش کے مطابق فیصلے یا ثالثی کے کسی غیر جانب دار طریقۂ کار سے متن کے حتمی معنی متعین کیے جاسکتے۔ تبدیلیاں بار بار ہوتی ہیں اور ایک تشریحی حلقے کے متعین کیے ہوئے مقصود کو دوسرے تشریحی حلقے کا معیّنہ مقصود بے دخل کر دیتا ہے۔ بہر حال فش کے قیاسات انفرادی قاری کے تجربات کی تخفیف کرتے ہیں اور متن میں معنی کے استخراج کی ذمہ داری کو ایک واحد قاری کی دسترس سے باہر کر دیتے ہیں۔ معاشرے کو فرد پر فوقیت دینے کا یہ تصور مؤخر الذکر کے شعور اور احساسات کی تخفیف کرتا ہے۔

امبرتو ایکو (UMBERTO ECO) کھلے اور بند متن کا تصور پیش کرتا ہے۔ داریدہ کی پُر جوش لاتشکیل اور پال دی مان (PAUL DE MANN) اور ہلس ملر (HILLS MILLER) کے تناظر میں ایکو معنی کے لامحدود بے مزاحمت بہاؤ اور تعبیر کی حدود کے امکان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ تعبیر در تعبیر (overinterpretation) کو تسلیم کرنے اور اس کی اجازت دینے کی وکالت کرتا ہے، اور ایک مفہوم کے استخراج کی خوبیوں کو ثابت کرنے کی ضرورت کو ختم کرنے کے حق میں ہے۔ معروضی قاری، مثالی قاری اور مقدر / بالفعل موجود (Implied) قاری کے درمیان اپنے قائم کیے ہوئے فرق سے بحث کرتے ہوئے ایکو کہتا ہے کہ ایک متن کا مقصد مثالی قاری پیدا کرنا ہے جو اس کی اس طرح تعبیر کرتا ہے جس طرح پڑھنے کے لیے متن بنایا گیا ہے۔ اس میں کثرت معنی کا امکان بھی شامل ہے۔

نئی تنقید، تھیوری اور بطور خاص قاری اساس تنقید، عمل مطالعہ اور قاری سے اس کے تعلق کی تفصیل بیان کر لینے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ تھیوری اور ادب کو سخت

روایتی درجوں میں ادارہ جاتی کردار دیا جا رہا ہے، تو پھر اس میں مکالمہ یا ارتباط کہاں ہے؟ کیا تمام متون خود کو تھیوری کے نشتر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ نقطۂ ارتباط کیا ہے؟ اور اگر ہے تو ڈرامہ اپنے آپ کو قدر شناسی کے ان تمام رائج حکمت عملی کے حوالے کیوں نہیں کر دیتا جتنی آسانی سے شاعری یا ناول کرتے ہیں۔ اتفاقاً ٹینر (TANNER) خطبات کے ایک سلسلے کی مرتبہ اشاعت کے تعارف میں، جس میں خود اُمبرتو ایکو اہم شرکاء میں تھے، مرتب اسٹیفن کالونی (STEPHEN COLLINI) لکھتا ہے:

> ''کش مکش یہ ہے کہ روایتاً تسلیم شدہ ادب پاروں کا اب تک بہت گہرا مطالعہ ہو چکا ہے۔ ایک کامیاب اور بلند مرتبہ کیریئر شروع کرنے کے لیے کسی کو متوجہ کر سکنے والے نئے پن کی ضرورت ہوتی ہے، صرف و محض اہم ادب پاروں کی موجود تشریحات کی زیادہ قابل قبول اور ذہانت دارانہ توثیق کافی نہیں ہے۔ بہت سارا غیر تسلیم شدہ مواد ابھی تک بانجھ زمینوں میں تعبیر کی نئی فصل اُگانے کے لیے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔''

دانشورانہ تشریحات نیا فیشن بن گئی ہیں اور بلند مرتبت پیشہ ورانہ کیریئر کے آغاز کے لیے ضروری ہو گئی ہیں، اور تھیوری نے متن کے باہم آویزش کی لاتشکیل کا جو کام اپنے ذمہ لیا ہے وہ اسے جاری رکھے گی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں دانشوروں کے منضبط تشریحی حلقے اور ناشرین کے درمیان ساز باز کے سبب انگلینڈ میں تخلیقی فن کار بے حد پریشان تھے کیوں کہ یہ لوگ تخلیق کاروں کو ہدایت دیتے تھے کہ کس نوع کا ادب لکھنا اور پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس میں ادب کے تجربے کے لیے کیا جگہ بچتی ہے؟ لٹریچر جیسے موضوع کو ضابطہ بندی، روایتی اصولوں اور ہیئت اور تنظیم کے Codes میں محدود کرنے کی بے فائدہ کوششوں کا ادراک کرتے ہوئے میں ان علاقوں میں پناہ لیتی ہوں جہاں ادب کے ذائقہ سے بچا نہیں جا سکتا اور جہاں ردِّعمل کی مسرّت قائم رہتی ہے۔ ادب کے مداح کی حیثیت سے جو شاعری، مصوری، ڈرامہ، ناول کے دل و ذہن میں

محسوس تجربات کو عزیز رکھتا ہے ہم (آپ کو) اس کائنات کے مختلف علاقوں میں لے چلنا چاہتے ہیں۔

ا۔ فطرت سے دوستی کرتے ہوئے Emily Dickinson کو سُنیے۔

۲۔ کنگ ڈنکن کے قتل کے بعد اپنی بیوی اور اس کے شریکِ جرم کی موت کے بعد میکبتھ کی مکمل تنہائی دیکھیے۔

۳۔ وہ حصہ دیکھیے جہاں املی ڈکنسن اپنے ایک قریبی کی موت کا گواہ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے ہارڈی HARDY کے FAR FROM THE HADDING CROWD کی B.B.C کی رکارڈنگ اسی فیکلٹی لاؤنج میں سُنی تھی۔ یہ SPHARE کی میوزک کی نمائندگی کرنے والے مرکزی موسیقی کے پس منظر میں نارکامبے (NORCOMBE) کی پہاڑیوں کا بیان تھا۔ اسی نوع کا ایک لمحۂ مسرّت ہیمنگ وے (HEMINGWAY) کی OLD MAN AND THE SEA کی قرأت تھی۔ ادب کی مسرّت کی بازیافت کے لیے ہمیں قرأت سے احتراز کرتے ہوئے اس کی جگہ ایک دوسرے عمل (ACTIVITY) سماعت یا کان دھرنے کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ ہمیں خیال ہے کہ یہ ہم اس وقت تک ہی کرسکتے ہیں جب تک ایک نظریہ ساز کے ذہن کی دانشورانہ جنبش اس کو بھی تنقیدی محاورے میں تبدیل نہ کردے اور ہم کسی دوسرے لفظ یا کسی ترکیب کے لیے پھر ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے پھریں۔ بھری پیکر لفظوں کی تصویریں، ان کی تعبیریں، لطف و مزاح اور اس کی حساسیت ہمیں یقین دلاتی ہے کہ ادب نے انسانوں کو ترک نہیں کیا۔ بیکٹ (BECKETT) کے گوڈوت کے انتظار میں انسان کی غیر موجودگی کے لیے غیر معمولی فکرمندی اسٹیج پر اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اکثر غیر متوقع اور اچانک شناخت حافظے کے تاروں کو متحرک کردیتی ہے۔ ان میں ڈکنسن کی یہ پُر اصرار صلاحیت ہے کہ وہ اپنے قاری یا سامع میں ردِّعمل پیدا کرتا ہے۔ شاعر بالکل صحیح لمحے میں قاری کو اپنے کلام میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ کیا ہم رابرٹ فراسٹ

(ROBERT FROST) کو بھول سکتے ہیں۔ The woods are lonely
dark and deep/ But I have promises to keep یا جان
کیٹس کی ODE TO AUTUMN یا ورڈز ورتھ کی DAFFODILS کی
لفظی تصویریں۔

شاعری کی مثال:

I wandered lonely as a cloud
That floats on high over vales and hills
When all at once I saw a crowd
A host of golden daffodils.
Beside the lake
Beneath the trees
Fluttering and dancing in the breeze.

ایک مرتبہ جب میں ہارڈی پڑھا رہی تھی، ایک طالب علم رونے لگی کیوں کہ دوسرے بے صبر طالب علم نے ناول کا اختتام پہلے ہی بتا دیا، جب کہ اوّل الذکر بہت غور اور دلچسپی سے قصے کو سُن رہی تھی۔ ایک دوسرے واقعے میں MAYOR OF CASTER BRIDGE نے وہ ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں تناؤ اور اسرار پوری طرح نمایاں تھا۔ اتفاقاً وولٹیج بڑھ جانے کی وجہ سے کلاس روم کا بلب پھٹ گیا اور آدھی کلاس یہ سمجھ کر کمرے سے بھاگی کہ وہ پُر اسرار موسم کے دیوتا ناول کے صفحات سے نکل کر بالکل ان کے روبرو آ گئے ہیں۔

میں اکثر طلاب علموں سے پوچھتی ہوں کہ کیا وہ کچھ اور، کلاسک نہیں، بلکہ ہلکی پھلکی کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ ایسے ہی ہارپر لی (HARPERLEE) کی To kill a mocking bird، کے متعلق ایک سوال کی وجہ سے بچوں نے چندا کیا۔ پانچ کاپیاں خریدی گئیں اور پانچ بچوں کے ایک گروپ میں ایک ایک کاپی

تقسیم کی گئی۔ ہر گروپ ناول کا ایک حصہ پڑھتا اور اکسٹرا پیریڈ (Extra period) میں اسی کے متعلق بات کرتا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ یہ ناول ختم کرلیں گے تو میں یہ پانچوں ناول خرید لوں گی۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان میں سے کوئی واپس نہیں آیا۔

ادب کا روشن تجزیہ کثرت معنی، ترسیل اور تعلق خاطر کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمیں پہلے سے متعین قیاسات ومفروضات سے ذہن کو خالی کرکے ادب کی طرف لوٹنا چاہیے۔

اس مذاکرے کا ظاہری مدعا نہ صرف ادب کے، بلکہ انسانی جذبے کے وقار کی تنصیب ہے۔ میں یہ بھی چاہوں گی کہ خود احتسابی کے اس عمل میں زبان کے مسئلے کو بھی شامل کیا جائے۔ کمپیوٹر سے حاصل ہونے والی تمام سہولتوں کے ساتھ اس کا رجحان تخفیف کی طرف ہے۔ کمپیوٹر آنے والی نسلوں کو زبان اور معنی پیدا کرنے کی صلاحیت مسخ کرکے صرف حلق کی آوازوں کے استعمال پر مجبور کردے گا۔ ہم اگر اس کی تلافی (Repair) نہیں کرسکتے تو اس نقصان کو روک تو سکتے ہیں جو کمپیوٹر اور موبائل خبروں (Masseges) کی قربان گاہ پر زبان کو پہنچ رہا ہے۔ تب زبان جو تمام انسانوں کے لیے فطرت کا ایک تحفہ ہے، جو عزت و وقار کی بازیافت میں انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد سے کہیں زیادہ ہماری معاون ہوسکتی ہے۔

●

اگرچہ معافی کا خواستگار ہوں مگر سب سے پہلے تو یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ ادب کے حوالے سے مجھے جمالیاتی مسرّت کی اصطلاح خاصی گمراہ کن معلوم ہوتی ہے۔ ایک تو نہ جانے کیوں فرسودہ سی بھی محسوس ہوتی ہے، اور دوسرے اس کا کوئی تعلق ''حقیقت مطلق'' سے بھی ہو، تو ایسا مجھے کچھ دُور کی کوڑی لانے جیسا یا پھر تصوف کی دنیا میں چہل قدمی کرنے جیسا محسوس ہوتا ہے۔ جہاں تک ادب کے حوالے سے تزکیۂ نفس کی بات کی جاتی ہے تو تزکیۂ نفس تو آج کل ''ساس بھی کبھی بہو تھی'' جیسے سوپ اوپیرا کے ذریعے عورتیں کافی حاصل کر رہی ہیں اور ایک نئے تشدّد سے مالا مال ہو رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ تزکیۂ نفس اور کتھارسس وغیرہ کی اصطلاحات مجھے بڑے بے تکے انداز میں Charity جیسے لفظ سے مماثل محسوس ہوتی ہیں جو طبقاتی جدو جہد میں مساوات کا ایک بے ضرر سا فارمولہ پیش کرتی ہے۔

اب جہاں تک مسرّت کا سوال ہے تو میں جے. ایس. بل کے اُس پیمانے کا ذکر کرنا پسند کروں گا جو اُس نے مسرّت کی مقدار کو ناپنے کے لیے وضع کیا تھا۔ جے. ایس. بل کا خیال تھا کہ جس مسرّت میں شئیت زیادہ ہوتی ہے، اس کا وقفہ اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ جے. ایس. بل کی اس بات کو میں اس مثال کے ذریعے پیش کرنا چاہوں گا کہ یقین کریں کہ ''رس گلے'' کو دیکھتے ہی میرے منھ میں پانی بھر جاتا ہے۔ میں اس کو کھانے بلکہ نگل جانے کے لیے پاگل ہوا اُٹھتا ہوں مگر یہ ''رس گلہ'' حلق سے نیچے اُترنے کے بعد ہی میرے لیے اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں جتنے ''رس گلے''

کھائے ہیں اُن کے Contours کے بارے میں مَیں کچھ بھی بتانے سے قاصر ہوں مگر میں نے اپنی زندگی میں جتنی کتابیں پڑھی ہیں اُن کے بارے میں زیادہ نہیں تو دو چار باتیں کرنے کے لیے تو میں ہر وقت خوشی کے ساتھ تیار رہتا ہوں لیکن میں کسی بھی کتاب پر آج تک پاگلوں کی طرح نہیں جھپٹا۔

مل کی ایک اور بات دُہرانے کی ضرورت ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ ایک اپنے آپ میں مطمئن جانور بن جانے سے بہتر ہے ایک غیر مطمئن سقراط بن جانا۔

اس لیے میرے خیال میں جمالیات کے حوالے سے ادب کی بات کرتے ہوئے اب ہمیں بہت سہل پسندی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ''سوزن سوتا نگ'' نے اپنے آخری ایام میں اس خطرناک رجحان سے آگاہ کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا: ''میں یہ کہنے کو تیار نہیں کہ جو سکون مجھے شادراور ور میر وغیرہ کے فنی نمونوں کو دیکھنے سے ملتا ہے، وہ کسی بھی طرح اُس سکون کے مانند ہے جو مجھے کسی اچھی Baseball کی میچ یا جوتوں کی نمائش سے گزرتے وقت ملتا ہے'' سوزن سوتا نگ کو اس وضاحت کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی ہوگی کہ اپنی مشہور کتاب Against Inerpratative میں وہ لکھ چکی تھیں کہ ہمیں اپنے حواس خمسہ کو بہتر سے بہتر بنانا چاہیے، ہمیں زیادہ دیکھنا چاہیے، زیادہ سیکھنا چاہیے اور زیادہ محسوس کرنا چاہیے۔''

دراصل انسان کے معاشی مطالبے جتنے اہم ہوتے ہیں، روحانی مطالبے اُس سے کم اہم نہیں ہوتے۔ ادب میرا روحانی مطالبہ ہے۔ اگرچہ یہاں بھی بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کیوں کہ جس طرح معاشی مطالبوں نے انسان کے گھر کو ایک منافق بازار میں تبدیل کر دیا ہے، اسی طرح اُس کے روحانی مطالبوں پر بھی اگر بندش نہ لگائی جائے تو بڑی آسانی سے انسان ''غیر انسان'' یا ''فرشتے'' میں تبدیل ہو سکتا ہے جو میرے خیال میں انسانیت کی معراج نہیں ہے۔

اس لیے ادب میرا روحانی مطالبہ ہے تو سہی مگر اس سے پہلے مجھے یہ انکشاف ہونا بھی ضروری ہے کہ کیا واقعتاً میری کوئی روح ہے بھی؟ میں جسے روحانی مطالبہ سمجھ رہا

ہوں ممکن ہے کہ وہ صرف میرا جذباتی مطالبہ ہو، محض عمل اور ردِّ عمل کا ایک معمولی کھیل۔
اس لیے واقعی یہ سوال میرے لیے بہت اہم ہو جاتا ہے کہ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں۔
میں اس کا جواب صرف اپنی ذات کے حوالے سے ہی دے سکتا ہوں، کوئی ایسا فیصلہ
سنانے سے میں قاصر ہوں جس کا اطلاق اجتماعی طور پر ہوتا ہو۔

اپنی روح کو پہچاننے میں، اُس کی آواز سن پانے میں ایک زمانہ گزر جاتا ہے۔
یہ ایک ارتقا ہے، ہمارا جسم ایک شیر خوار بچّے سے گزرتا ہوا ایک کمزور ہڈیوں والے
بوڑھے تک آ پہنچتا ہے۔ ہماری روح بھی ساتھ ساتھ ارتقا پذیر تھی، وہ مختلف احساسات،
جذبات، خواہشات اور ردِّ عمل کے چھلکے اپنے اوپر سے اُتار کر پھینکتی جاتی ہے اور آہستہ
آہستہ ایک مقصود بالذات 'وجود' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس درمیان ہم سے بڑی
لغزشیں سرزد ہوتی ہیں، ہم روح کو سہل پسندی کے ساتھ کبھی کسی، اور کبھی کسی شے سے
وابستہ کرتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم واقعی بے بس ہیں، اس لیے روحانی مطالبے کا
لفظ استعمال کرتے ہوئے مجھے بے حد ہوشیار رہنا تھا۔

اب پابلو نرودا کی نظم Walking around کی یہ سطریں دیکھیے:

''میں نہیں بننا چاہتا، اتنے بدنصیبوں کا وارث''
''میں نہیں بننا چاہتا، صرف ایک جڑ یا مقبرہ''
''ایک ویران 'سرنگ' ایک لاشوں سے بھرا تہہ خانہ''
''درد سے مُردہ ہو گیا ہوا، سردی سے ٹھٹھرا ہوا''

آپ ان سطروں کو محض الفاظ نہیں کہہ سکتے، ان لفظوں میں وسطی امریکہ کے بے شمار
تاناشاہوں کی گولیوں سے مارے گئے انسانوں کی زندہ آوازیں ہیں۔ اس لیے ادب
صرف محسوسات کا معاملہ ہی نہیں ہے وہ بصیرت کا بھی ہے، دل کا ہی نہیں دماغ کا بھی
ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادب کا مطالعہ کر کے ہمیں جو سمجھ، فہم یا Understanding
حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور شے سے نہیں حاصل ہوتی۔ کافکا نے کہا تھا ''سنیما ہماری نظر
میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ مناظر آپ کے شعور میں بغیر اجازت لیے دندناتے ہوئے چلے

آتے ہیں۔ سنیما کا مطلب آنکھوں پر دُھندلا چشمہ چڑھانا ہوتا ہے جب کہ اس سے پیشتر ہماری آنکھیں شفاف تھیں۔''

اس طرح کافکا نے موسیقی کو بھی ایک زیادہ خطرناک مسرّت سے تشبیہ دی تھی کیوں کہ وہ شاعری کے مقابلے میں زیادہ نئی، باریک اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ موسیقی احساس کی سطح پر جیے جانے والی زندگی میں اضافہ کرتی ہے مگر اس کے برخلاف شاعری کا کام ایسی زندگی کو ایک ڈسپلن عطا کرنا اور اس کو ترقی دینا ہے۔

اس لیے کوئی دوسرا آرٹ بھی ادب کی جگہ نہیں لے سکتا۔ دلچسپ بات ہے کہ اگرچہ کافکا کی میز پر ہمیشہ اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا تھا مگر وہ خود اخبار پڑھنے کو جدید تہذیب کی ایک ناگزیر بُرائی مانتے تھے۔ وہ اخبار پڑھنے کو ایک قسم کی تمباکو نوشی کے مماثل سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ پریس کو اپنا دماغ زہریلا بنانے کی قیمت ادا کرنے جیسا ہے۔

یہی سبب ہے کہ ادب کا مطالعہ کرتے وقت میں اپنے جمالیاتی تقاضوں سے ڈرتا ہوں۔ اُن کے لیے تو میں موسیقی ہی سنتا ہوں۔ موسیقی میرے باطن کی ساری کشمکش کو تھوڑی دیر کے لیے تحلیل کردیتی ہے۔ شاید یہی روحانی مسرّت ہوتی مگر روحانی مطالبہ محض مسرّت کے لیے ایک پکار یا چیخ کا نام تو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جب میں شاعری پڑھتا ہوں تو اُس کی ابتدا ہی ایک کشمکش اور ایک تناؤ سے ہوتی ہے۔ ادب ڈسٹرب کرتا ہے یہی میرا روحانی مطالبہ ہے کہ میں اس کشمکش، اس تناؤ یا اُلجھن کا سامنا کروں۔ مجھے ادب پڑھ کر یہ گھاٹے کا سودا منظور ہے ورنہ کب کا رجنیش کے ''آنند'' کے فلسفے کی گود میں پناہ لے چکتا اور وہ نہیں تو بابا رام دیو کے کمرشل ''یوگا'' کے ذریعے ہی سکون اور صحت دونوں حاصل کرلیتا۔ مگر میں ایک بیمار اور ذہنی انتشار کا شکار انسان ہوں۔ یہ بُرائیاں میں نے ادب سے مول لی ہیں۔ یہی میرے روحانی مطالبے ہیں۔ میں انھیں پورا کرنے کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔ میں تو اس کے لیے مصوری کے نمونے تک دیکھنے نہیں جاتا۔ کیوں کہ بقول لیزاں ''آتماؤں کو Paint نہیں کیا جاتا۔

اہم صرف یہی نہیں ہے کہ ادب پڑھنے سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ادب پڑھنا میرے خیال میں ایک روحانی یا مذہبی تجربے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے، جو آپ کو اپنے گناہ یاد دلا دیتا ہے اور جس کی اہمیت اس امر میں بھی پوشیدہ ہے کہ وہ اس کائنات کی کتنی تاریک اور دُھند سے لپٹی اشیا کو روشن کر دیتا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہر پڑھنے والے کے اپنے تعصبات بھی ہوتے ہیں یہی چیز ہر فن کو اور خاص طور پر ادب کو انوکھا بناتی ہے۔ فلابیر نے ایک نوجوان ادیب کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اُسے لکھنا تب شروع کرنا چاہیے جب اُسے یہ دنیا خواب، سراب یا مایا نظر آنے لگے۔

اس لیے رد کرنے سے پہلے قبول کرنا ضروری ہے۔ رد کرنا انسان کا وہ حق ہے جسے بقول کامیو Declaration of the man Right میں شامل نہیں کیا گیا۔

مجھے بیس سال کی عمر میں یہ الہام نہیں ہوا تھا کہ مجھے دوستوافسکی کو پڑھنا چاہیے۔ گلشن نندہ کو نہیں۔ میرے ساتھ قبول کرنے اور رد کرنے کا ایک فطری ارتقا جاری تھا۔

اس وقت جب میں یہاں اس ہال میں یہ پیپر پڑھ رہا ہوں تو میں نے مائیک کو دیکھنا رد کیا ہے۔ اس ڈیسک کی لکڑی کو رد کیا ہے۔ سر کے اُوپر چھت کے پلاسٹر کو رد کیا ہے۔ اپنے جُوتے میں اُبھر آئی کیل کو رد کیا ہے۔ میں نے اپنے جسم کے مساموں سے پھوٹنے والے پسینے اور باہر چلنے والی ہوا دونوں کو رد کیا ہے۔ میں نے اپنی زبان کی لکنت کو رد کیا ہے اور یہاں تک کہ شاید سامعین کو بھی رد کیا ہے۔

مگر رد کرنے سے پہلے قبول کرنا ضروری ہے۔ قبول کرنے کے بعد ہی دنیا ایک مایا، ایک فریب یا ایک سراب بن سکتی ہے۔ ادب ہم تب ہی پڑھ سکتے ہیں بلکہ پڑھتے ہیں جب ہم نے غیر ادب، بھی پڑھا ہو۔ ایسی صورت میں ہی ادب ہمیں

بصیرت، فہم اور سمجھ عطا کرتا ہے مگر ادب پڑھنا صرف بصیرت حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں ہے۔ میرے لیے یہ ایک پُراسرار سفر کا نام بھی ہے۔ اس سفر میں بھی گھر نہیں آتا۔ سمیون ویل نے Waiting for God میں لکھا ہے: ''میں'' ہونا غلط ہے۔ ''ہم'' ہونا اُس سے بھی زیادہ غلط ہے۔ شہر میں لگتا ہے ہم اپنے گھر میں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جلاوطنی کو اپنا گھر مان سکیں۔''

ادب پڑھنا ایک مستقل جلاوطنی ہے۔ یقیناً کوئی ''گھر'' ہے جس کی طرف سفر جاری ہے مگر وہ گھر ابھی تک ویران ہے۔ لکھنے والے کے 'اکیلے پن' میں ہم ایک قاری کی حیثیت سے کبھی شرکت نہیں کر سکتے۔ ''مکمل سچ'' یقیناً ادیب کی تنہائی کی طرح ہی اُداس ہوگا۔ وہ روشن نہیں ہوگا۔ بصیرت روشنی ہے مگر مکمل سچ 'اندھیرا' ہے، بصیرت کی روشنی اس اندھیرے سچ کے بلیک ہول میں پہنچ کر جذب ہو جاتی ہے، مکمل سچ کو ساتھ لے کر واپس نہیں آتی۔ اس لیے وہ ہمیں ادب میں نہیں ملتا۔ وہ چھپ کر، بچ کر ایک کونے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

کامیو نے اپنی ڈائری Carneto میں لکھا ہے کہ کتابوں میں لکھے گئے لفظ ''تنہائی'' اور اُس کے بیان سے اصل تنہائی بہت دور ہے بلکہ بیگانی ہے۔ یہ بھی کامیو ہی کہنے کی ہمت کر سکتا تھا کہ لکھنے کا ارادہ بجائے خود ایک تنہائی ہے۔

لہٰذا میرے خیال میں ادب پڑھ کر ہمیں مکمل سچ کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ صرف اپنے اپنے مطالعوں کے آئینوں میں ہم اس کی موجودگی کا شائبہ پا سکتے ہیں۔

مجھے یہاں بے اختیار لارنس یاد آ گیا ہے۔ اپنے مضمون ''ناول کیوں اہمیت رکھتا ہے'' میں وہ لکھتا ہے: ''پس یہ دیکھتے ہوئے کہ میرا ہاتھ زندہ سلامت ہے اور زندہ ''میں'' ہے تو پھر جسم کے لیے بوتل یا جگ یا ٹین کے ڈبے یا مٹی کے کوزے کا تصور یا کوئی اور ایسا ہی احمقانہ تصور کہاں سے پیدا ہو گیا...... اور یہی وہ بات ہے جس کا علم ناول نگار کو حاصل ہوتا ہے اور اگر آپ ایک پادری ہوں یا فلسفی یا سائنس داں یا محض احمق تو یہی ایک بات آپ کو معلوم نہیں ہوگی۔''

لارنس دراصل صاف طور پر اُس Cartesian Dualign کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے جس کی شروعات ڈیکارٹس کے ذریعے منظم طور پر مغربی فلسفے کی تاریخ میں ہوئی تھی۔ مظہریات کے بانی ہسرل نے اُس زمانے میں "Fallacy of Matualism" کے حوالے سے اس Cartesian dualism پر گرفت کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جس کا علم ناول نگار کو ہے، اُس کا علم ہمیں بھی ناول پڑھ کر ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لارنس ''زندہ بشر'' کو اپنے جسم، اپنے ذہن اور روح اور جان سے برتر سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں ''زندہ بشر'' ناول کا موضوع ہے۔ لارنس کی بات سر آنکھوں پر، اس بات سے ہمارے پاس ادب، خاص طور پر ناول پڑھنے کا زبردست جواز آ گیا ہے، مگر افسوس کہ ''زندہ بشر'' ہی تو سب سے بڑا اسرار ہے۔ زندگی میں پوشیدہ اسرار اپنے آپ کو کبھی مکمل طور پر آشکار نہیں کرتے۔ وہ موت کے اندھیرے میں کنڈلی مار کر بیٹھ جانے کی خطرناک عادت کے شکار ہیں۔ محض ''زندہ بشر'' کی نمائندگی اندھیروں کی اُن تہوں کی نمائندگی نہیں ہے۔ سچ معدوم نہ ہو کر بھی معدوم ہے۔

یوں دیکھا جائے تو سچا ادب ہمیں اس لیے بھی اپنے پاس بلاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا آئینہ ہونے کے علاوہ ایک ایسی گھڑی کی مانند بھی ہوتا ہے جو کبھی کبھی اپنے عہد سے بہت تیز چلتی ہے اور ہمارا Timilaper ہو جاتا ہے۔ اس طرح ادب خود کو دوبارہ دریافت کرنے کا ایک اور موقع ہمیں دیتا ہے۔ پہلا موقع تو خود زندگی نے ہمیں دیا تھا۔

مگر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ ادب پر ہمیں ہمیشہ بہت زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح لفظ اگر راہ دکھاتا ہے تو غلط لفظ گمراہ بھی کرتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ادب بہر حال الفاظ سے تعمیر ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ 'لفظ' میں ہمارا ''میں'' پوشیدہ ہے۔ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کے لیے ہی لفظ پیدا ہوا ہے، مگر افسوس اس کی تعمیر میں ایک صورت خرابی کی ہے۔ لفظ کبھی کبھی ہمیں صرف ہمارا کارٹون دکھاتا ہے اور کبھی

ہماری پرچھائیں۔ کیوں کہ وہ کاغذ پر خواہش، آرزو، محبت، نفرت اور غصّے کے بوجھ سے لکھا جاتا ہے، لفظوں سے ہوشیار!

بہرحال جب میں ادب پڑھتا ہوں تو میرے اندر یہ احساس بھی جاگتا ہے کہ ابھی بہت کچھ ہے، کچھ خواب ہیں جن کو ہم بھول گئے ہیں یا انھیں نظر انداز کردیا ہے۔ وہ اچانک انھیں ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ میں ان بھولے ہوئے خوابوں کی خاطر شاعری، ناول اور افسانے کا رُخ کرتا ہوں، میں دنیا کی اصلیت کو سمجھنے کے لیے دنیا سے پُر ہوجانا چاہتا ہوں، میں اُس کیڑے کی طرح نہیں بننا چاہتا جو کسی پھل میں سوراخ کرکے اُس کے اندر ایک قیدی کی طرح جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ادب پڑھ کر ہی تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں فلاں کی طرح شاعری، یا فکشن انسان کی مکتی یا نروان کا وسیلہ نہیں۔ وہ ایک بددعا، ایک بدشگونی بھی ہے۔ ایک بڑے دکھ اور دکھ کے ارتقا سے تشکیل لیے گئے یہ تمام سچے ادبی فن پارے! والٹ بنجامن نے کتنی سچی مگر تکلیف دہ بات کہی تھی کہ شاعر کے پاس اُس پیغام کو سننے کے لیے صرف ایک کان ہوتا ہے جس کے لیے ادیب کے پاس اس کی موت کے بستر پر آخری سانس کے ساتھ کہہ پانے کے لیے وقت اور حوصلہ ہوتا ہے۔

مگر اب ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اطلاعات کا زمانہ ہے اس زمانے میں ادب پڑھ کر ہم ایک قسم کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ افسوس کہ ادب بھی کمپیوٹر کے مانیٹر پر جگمگاتا ہوا آنے لگا ہے۔ لفظ کے گرد نور کا ایستادہ ہے۔ ادب Vishal لفظ کی اتنی زائد روشنی برداشت نہیں کرسکتا۔ لفظ اتنی Pedendancy کے ساتھ کاغذ پر نہیں آتا۔ میں ادب کے الفاظ کاغذ پر ہی پڑھ پاتا ہوں شاید یہ میری آنکھوں کا کوئی پُراسرار روگ ہو۔ یوں تو مجھے احساس ہے کہ فالتو پن، Pedendancy سے قطعاً خالی الفاظ تولید ہے، میرے قلب تک ہی آنا چاہتے تھے، کاغذ پر نہیں، مگر ایسی شفاف روح نہیں میری۔ میری روح تو اپنی آلائشوں کا بوجھ لادے پھرتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ ہم جس زمانے میں رہ رہے ہیں اُس نے سچ کو تلاش کرنے کے تمام

راستوں کے پتھر ہٹا دیے ہیں مگر اُسے حاصل کرنے کے تمام امکانات کو ختم بھی کر دیا ہے۔

ہر راستے پر سیلز مین کھڑے نظر آتے ہیں، مگر ادب کوئی سڑک چھاپ اور لفنگے قسم کا سیلز مین نہیں۔ وہ آپ کو کبھی یہ نہیں بتائے گا کہ اُس کے پاس کیا ہے اور وہ آپ کو کیا دینا چاہتا ہے۔ شاید اُس کے پاس ایسی کوئی شے ہے بھی نہیں، جو پہلے ہی سے نہ ہو۔ جس طرح انسان پہلے مرتا ہے، پھر اپنی موت کو دیکھتا ہے اور پھر کہتا ہے "اچھا یہ سب کچھ بس یہی تھا۔"

تو پھر آخر ادب پڑھنے کے میرے روحانی مطالبے کے معنی کیا رہ جاتے ہیں؟ شاید یہی کہ ادب میرے ضمیر کو برابر جگائے رکھتا ہے۔ وہ اسے گہری نیند سونے نہیں دیتا۔ ادب ضمیر کے صدر دروازے پر لگاتار دستکیں دیتا رہتا ہے۔ وہ اُسے پریشان کر کے رکھ دیتا ہے اور تب آخر کار مجبور ہو کر ضمیر اپنی عدالت لگاتا ہے اور پھر ہم پر ایک کڑا مقدمہ دائر کرتا ہے۔ بے انصافی کے خلاف، بدعنوانی کے خلاف، استحصال کے خلاف، اور جھوٹ کے خلاف۔

یہی وہ پُراسرار سفر ہے جس میں کبھی گھر نہیں آتا مگر جس پر چلتے ہوئے میری روح کے تھکے ہوئے افسردہ پاؤں کی نجاست دُھلنے لگتی ہے۔ اُسی پر لپٹے ہوئے گندے چیتھڑے ایک ایک کر کے گرتے جاتے ہیں۔ یہی اُس کا مطالبہ تھا۔

ادب پڑھ کر میں اپنی روح کی تمام آلائشوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

●

وجود کی حیاتیاتی سطح کے اکثر مظاہرے ہمارے لیے اجنبی نہیں۔ مثلاً کھانا پینا، چلنا پھرنا، دیکھنا سُننا۔ یہ سب ہماری حیاتیاتی سطح کے عملی مظاہرے ہیں۔ لیکن ہم صرف دیکھتے نہیں، محسوس بھی کرتے ہیں بلکہ بہت سی باتیں تو ایسی ہیں جنھیں ہم محض محسوس کرتے ہیں، ہزار خواہش اور کاوش کے باوجود دیکھ نہیں سکتے۔ مسکراتی آنکھوں کے پیچھے چھپے ہوئے آنسو، جھرّیوں بھرے جسم کے دوشِ ناتواں پر رکھا ہوا ذمّے داری کا بوجھ، رشتوں کا تقدس اور کردار کا حسن ـــــ انھیں ہم محسوس ہی تو کر سکتے ہیں۔

دیکھنے اور محسوس کرنے کا یہ عمل ہر ایک کے لیے یکساں نہیں ہوتا۔ کسی کے لیے ''خونی کوٹھی'' کے اردگرد مٹّی میں دبی ہوئی چھوٹی بڑی ہڈیاں تفتیش کا موضوع بنتی ہیں، اور کسی کے لیے تشویش کا باعث! کوئی انھیں دیکھ کر پولیتھین میں سمیٹتا ہے اور فورنسک ٹیسٹ کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔ کوئی انھیں دیکھ کر لرز اُٹھتا ہے، الماری سے کتاب نکالتا ہے، ورق پلٹتا ہے، ''شہرِ افسوس'' پر ایک نظر ڈالتا ہے اور مر جاتا ہے۔

سو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب کیوں پڑھتے ہیں تو گویا دو مختلف رویّوں اور اُن کے ثمرات کو معرضِ بحث میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک کا تعلق مادّی سرگرمیوں سے ہے اور دوسرے کا رشتہ روحانی یا باطنی کیفیتوں سے!

مادّی سرگرمیاں اور اُن کے نتائج چوں کہ نظر کے سامنے ہوتے ہیں اس لیے بسا اوقات افادیت کو اُنھیں سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔

ایک عطار کی نگاہ میں پھول کا بہترین مصرف یہی ہے کہ اُس سے عطر نکالا جائے لیکن اگر شاعر کی نگاہ میں بھی پھول کا یہی مصرف ہوتا ہے تو لالہ وگل کو دیکھ کر خاک میں پنہاں ہو جانے والی صورتوں کا ماتم گسار کون ہوتا! اور ہونٹوں کو دیکھ کر ''پنکھڑی اک گلاب کی سی'' کہنے کے لیے الفاظ کہاں سے ملتے، اور ورڈز ورتھ کے ڈے فوڈِل —— وہ بھی تو ہماری دسترس میں آنے سے رہ جاتے! اُس نے پھولوں کو دیکھا، نگاہوں میں محفوظ کیا، تنہائی کا ساتھی بنایا اور لفظوں میں سمیٹ کر ہمارے حوالے کردیا۔ مسرّت کا جو احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تھا، ادب کی امانت بن کر ہزاروں میں تقسیم ہوگیا۔ زمین وزماں سے پرے، زبان کے جھگڑوں سے بے نیاز، عمر، نسل اور رنگ کی تفریق سے بے پرواڈے فوڈِل ہمارے حافظے میں آج بھی محفوظ ہے —— سعدی کی گلستاں کی طرح، رومی کی مثنوی کی طرح، حافظ کے دیوان کی طرح، شیکسپیر کے ڈراموں کی طرح، میر کے چمن کی طرح، غالب کے صریرِ خامہ کی طرح!

باطنی اور مادّی سطح پر لطف وانبساط کی کشید میں یہی بنیادی فرق ہے۔ مادّی مسرّتیں عارضی ہوتی ہیں لیکن دکھائی دیتی ہیں۔ باطنی انبساط دائمی ہوتا ہے، مگر نظر نہیں آتا۔

آرام دِہ گاڑی، ایئر کنڈیشنڈ مکان، بے لگام اقتدار اور بے پناہ دولت کی اہمیت سے کسے انکار ہے لیکن بات بس اتنی ہے کہ دولت بستر دیتی ہے، نیند نہیں۔ بلکہ بعض اوقات آرام دِہ بستر دے کر نیند چھین لیتی ہے اور خواب چُرا لیتی ہے۔

ادب بستر نہیں دیتا لیکن دنیا بھر کے خواب چن چن کر پلکوں پہ سجا دیتا ہے۔ بستر ہمارے لیے ضروری ہے لیکن خواب اس سے زیادہ ضروری!

سو ہم ادب اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ ہمارے خواب ہمارے پاس رہیں!

خواب آور گولیوں کے منفی اثرات سے ہم بھی واقف ہیں۔ ادب بھی ہم پر اپنے اثرات مرتّب کرتا ہے لیکن یہ اثرات منفی نہیں، مثبت ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ آدمی کو اندر سے بدل دیتے ہیں، اس طرح کہ خود تبدیل ہونے والے کو بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنا بدل گیا ہے۔

ہماری باطنی دنیا سے جڑی ہوئی تمام سرگرمیاں کم و بیش اسی نوع کی ہوتی ہیں اور اپنی تفہیم کے لیے مخصوص اندازِ نظر کا تقاضا کرتی ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ تعینِ قدر کا معیار اشیا کی ماہیت نہیں، ہمارا رویّہ ہے جو ہم اُن کے ساتھ رَوا رکھتے ہیں۔

ہماری یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر اس سال حج بیت اللہ سے واپس آئے تو اُن کی کچھ بدلی ہوئی سی، روشن، آسودہ اور مطمئن آنکھوں کو دیکھ کر خیال آیا: انھوں نے اس سے پہلے بھی اللہ کے گھر کی زیارت کی تھی۔ لیکن تب، کم از کم مجھے تو کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

تب اور اب کے اس فرق کی یہی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ تبدیلی عمل کی سطح پر نہیں، احساس کی سطح پر رونما ہوئی ہے۔

معاف کیجیے، ہم مابعد الطّبیعیات کی قلمرو میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں واپس اپنی دنیا کی طرف لوٹنا چاہیے جہاں دانش مندوں نے اس تجویز کو اپنی منظوری دی ہے کہ کسے کس طرح زندہ رہنا ہے، اس کا فیصلہ اُسے نہیں، وہائٹ ہاؤس کو کرنا ہے۔ اور کب اور کہاں کسے مر جانا چاہیے، اس مسئلے پر بھی، اُسے نہیں سُپر پاور کو غور کرنا ہے۔

لاشوں کی خرید و فروخت کے اس گھٹے ہوئے ماحول میں اگر آزادی کی سانس لینے کے لیے تھوڑی سی کھلی فضا میسّر نہ ہو تو آدمی سچ مچ مر جائے!

ادب ہمیں مرنے سے بچا لیتا ہے اور تخیل، جذبے، احساس اور فکر کی ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

لفظوں کی یہ وہ کائنات ہے جہاں دوسروں کو قیامت تک سلامت رہنے کی دعا دی جاتی ہے اور قیامت کبھی نہ آئے اس کی آرزو کی جاتی ہے۔ جہاں عشق کی ایک جست میں زمین و آسمان کو سمیٹ لینے کی جرأت تقسیم کی جاتی ہے اور آرزوؤں کی وسعت، تمناؤں کی بے کرانی اور حیات کی رنگا رنگی تحفتاً پیش کی جاتی ہے۔ جہاں بادِ صبا کا کوئی جھونکا دفعتاً باغ کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جہاں پتی سے اس کے دکھ مانگنے کے

لیے اندو موجود ہے۔ جہاں فسادیوں کا راستہ روکنے کے لیے موزیل کھڑی ہے اور جہاں مکان کی نیرا تنہا ہونے کے باوجود تنہا نظر نہیں آتی، اُس کے ساتھ اس کے عزائم ہیں!

اس زندگی سے بھرپور، انوکھی اور بوقلموں دنیا کی شہریت ایک بار نصیب ہو جائے تو ساری زندگی اس کی سیر میں گزر جاتی ہے اور طبیعت سیر نہیں ہوتی! یہاں خوب صورتی بھی ہے اور بدصورتی بھی، ایثار بھی ہے اور جبر بھی، مرسال کی بے حسی بھی ہے اور جذبوں کی تمکنت بھی، کالیداس کا میگھ دوت، شکنتلا کی معصومیت، قلوپطرہ کا حسنِ خود آگاہ، بروٹس کا خنجر، گولیور کی دنیا، روسو کے اعترافات، کافکا کی کائنات، ٹالسٹائی کا فن، افراسیاب کا دربار، امیر حمزہ کی شجاعت، عمرو کی عیاری، جذبۂ رفاقت، بخل اور دولت طلبی، خوجی کی شیخی، امراؤ جان کا لکھنؤ، ہوری کا گاؤں، دیپالی سرکار اور اوما دی کی دھرتی، اینمل فارم کے ''معزز'' شہری، شمن کی کجی، طلعت کا کرب، نعیم کا تلون، عذرا کی تنہائی، سیتا میرچندانی کا مقدر! کتنے دکھ، کتنے سکھ، کیسے کیسے تجربات و احساسات، مکان و مکیں کو گرفت میں لینے کی کتنی ساری کوششیں! یہ ادب ہی تو ہے جس کے طفیل ہم ایک زندگی میں ہزار زندگی کر لیتے ہیں۔

بچپن میں جب پہلی بار کھلونا بک ڈپو سے شائع ہونے والی کہانی کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا تو ایسا مزا آیا کہ کتاب ہاتھ میں ہوتی تو پھر کھانے کو جی چاہتا نہ کھیلنے کو۔ کہانی ختم ہوتی تو احساس ہوتا کاش تخیل کی یہ دنیا کبھی درہم برہم نہ ہوتی۔

اُن ہی ایام میں سحرالبیان، گلزارِ نسیم اور داستان امیر حمزہ کے منتخب حصے دادی، پھوپھی اور خالہ کی زبانی سُنتے سُنتے سو جانے کا چسکا لگا۔ پھر گھر کی لائبریری میں موجود عربی، فارسی کی ناقابلِ فہم، قدیم اور ضخیم کتابوں کو بہ صد حسرت چھو کر رکھ دینے، اور اُردو کے نئے اور پُرانے رسائل، ادبی اور مذہبی کتابوں سے سیراب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اُن ہی دِنوں، چپکے سے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ جو کچھ سامنے ہے، جتنا کچھ ہم دیکھ سکتے ہیں، جس قدر ہم سمیٹ سکتے ہیں، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، سو ساری دُنیا مل بھی گئی تو کیا! طلب کی کوئی انتہا نہیں اور محرومی کے احساس سے بڑا کوئی عذاب نہیں!

کتابوں نے یہ ذہن بھی دیا کہ دنیا وہی نہیں ہے جو ہمارے سامنے ہے، دنیا وہ بھی ہے جسے ہم دیکھ نہیں سکتے اور جسے دیکھ نہیں سکتے، کچھ ضروری نہیں کہ اُس کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔ تجربے حسّی بھی ہو سکتے ہیں اور وِجدانی بھی —— مُشاہدہ سچا بھی ہو سکتا ہے، فریب نظر بھی! علم وہی نہیں ہے جو ہم جانتے ہیں، علم وہ بھی ہے جو دوسرے جانتے ہیں اور ہم نہیں جانتے۔

بچپن کے ایک سبق کا تاثر آج بھی لوحِ دل پر محفوظ ہے۔ سرورکائنات علیہ الصلوٰۃ و التسلیم نے صحابۂ کرام سے دریافت فرمایا: وہ کون سا درخت ہے، جس پر کبھی خزاں کا گزر نہیں ہوتا۔

صحابہ خاموش رہے۔ حضور نے یاد دلایا، وہ کھجور کا درخت ہے۔ اور تب سننے والوں نے محسوس کیا، یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی!

گھر لوٹ کر حضرت عمرؓ سے ان کے بیٹے نے کہا—

''مجھے تو اسی وقت کھجور کے درخت کا خیال آیا تھا لیکن میں چپ رہا!''

''چپ کیوں رہے''؟ حضرت عمرؓ نے کہا— ''بتا دیتے تو مجھے کتنی خوشی ہوتی!''

بیٹے نے عرض کیا —— ''بزرگوں کی خاموشی پر اپنے اظہار کو فوقیت دینا میں نے مناسب نہیں جانا۔''

فرزند دل بند کا جواب سن کر باپ کی آنکھیں نم ہو گئیں، فرمایا۔

''جتنی خوشی مجھ اُس وقت ہوتی۔ اُس سے زیادہ مسرّت اب ہو رہی ہے۔''

سو مطالعے کے توسط سے ہی ہم نے یہ جانا کہ مسرّت کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے۔

تلاشِ مسرّت میں کچھ اور ورق پلٹنے کی سعادت نصیب ہوئی تو اندازہ ہوا، مسرّت کی بے شمار صورتوں کی شناخت اور احساسات کی تہوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا کس قدر مشکل کام ہے۔

کتنی تمنائیں، کتنے جذبے، ایک دوسرے کو کاٹتے اور ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہوئے کتنے احساسات، اور کتنے ایسے سوالات جن کے جواب سامنے ہوتے ہیں لیکن ہماری گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ اور ایسے کتنے لمحے ہماری گرفت میں ہوتے ہیں جب سربلندیاں ہمارے اظہار کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہیں، اور ہم نشۂ وجود سے سرشار، چپ چاپ اپنے آپ کو سمیٹنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ آگہی اذنِ گفتار مانگتی ہے۔ لیکن انکسار کہتا ہے، علم کے بے کراں سمندر کے سامنے کھڑے ہو کر اگر تم نے ساحل پر پڑی بے شمار سیپیوں میں سے کچھ صدف چن بھی لیے تو تم کیا اور تمھاری یہ صدف کیا۔ ذرا ضبط سے کام لو اور سوچو اُن کے بارے میں، جنھوں نے خالی سیپیوں کی جگہ موتیوں سے اپنے دامن بھرے اور ایک لمحے کے لیے کسی سے یہ نہیں کہا، دیکھو ہم نے کتنے موتی چن لیے۔ وہ خاموش رہے، کیوں کہ جانتے تھے، اُن سے زیادہ موتی چننے والے ابھی موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ادب کا مطالعہ خاموشی کا یہ درس، ضبط کا یہ احساس، توازن کی یہ کیفیت عطا کرتا ہے۔

سو ہم ادب اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ لذتِ خاموشی سے ہم کنار ہو سکیں اور کنجِ تنہائی میں اپنے آپ کو دریافت کر سکیں اور ہو سکے تو دنیا کے مقابل خود کو رکھ کر یہ دیکھ سکیں کہ ہم کہاں ہیں اور اہلِ جہاں کدھر ہیں!

آج جب کہ یہ مذموم خواہش سر اٹھا کر باتیں کر رہی ہے کہ دنیا صرف ہماری ہے، دوسروں کو اس میں سانس لینے کی اجازت نہیں، اس خطرناک صورت حال میں ادب ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ زندگی کا حسن ساری دنیا سمیٹ لینے میں نہیں ہے، اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنے میں ہے۔

سو ہم ادب اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ مشینوں کے درمیان آدمی ہونے کا احساس برقرار رہے۔

پروفیسر شمیم حنفی اپنے مضامین میں علاقائی زبانوں کے ادیبوں کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ اردگرد کا یہ حوالہ محض اظہارِ معلومات نہیں ہے، اظہارِ رفاقت بھی ہے۔ اوروں کا حوالہ دے کر ہم اپنے آپ کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ اس دنیا میں صرف ہم نہیں ہیں، دوسرے بھی ہیں۔ سو ہم ادب اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ کچھ نئے اور اچھے دوست بنا سکیں اور انھیں اُن کے پورے وجود کے ساتھ قبول کر سکیں۔

مطالعے کی میز پر، ہم، ہم نہیں رہتے۔ ''تو'' اور ''میں'' اور وہ اور ''سب'' بن جاتے ہیں۔ سب کو خوش آمدید کہنے کا یہ جذبہ ادب کی عطائے خاص ہے۔

اس لیے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ عالم گیر ذہنی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے، جذبوں کی تہذیب، تفہیم اور تجزیے کے لیے، خستگی کی داد پانے کی توقع میں خستگانِ تیغِ ستم سے مل کر اپنے جذبات کی کتھارسس کے لیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عرفانِ ذات اور انکشافِ ذات کے لیے ہم ادب پڑھتے ہیں۔

مختلف موقعوں پر ادب کے مطالعے کی نوعیت اور ہمارے انتخابات مختلف ہو سکتے ہیں۔ کبھی ہم ادب پڑھتے ہیں محض ذہنی رفاقت اور حصولِ مسرّت کے لیے کبھی بصیرت کی چاہ میں اور کبھی مسرّت اور بصیرت دونوں کی تلاش میں۔ آرزو اپنی دسترس میں ہے، سو ہم کرتے ہیں کرتے رہیں گے۔ حصول اپنے بس میں نہیں قبول اپنی دسترس میں نہیں۔ سو اُس کی فکر بھی نہیں!

●

ڈاکٹر دردانہ قاسمی

ہر لکھی ہوئی تحریر ادب ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ شاید اسی وجہ سے عام معنوں میں ہر طرح کی تحریر کو خواہ وہ مقالہ ہو، فکشن ہو، شاعری ہو یا کسی اور موضوع پر لکھی ہوئی تحریر، ان کو انگریزی میں Literature کے ضمن میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ مگر جب خالص ادب کی بات کی جاتی ہے تو خالص ادب میں صرف ان تحریروں کو شمار کیا جاتا ہے جن کو یا تو تخلیقی تحریروں کا نام دیا جا سکتا ہے، یا پھر کچھ ایسی اصناف میں ادب کو سمیٹ لیا جاتا ہے جن میں سپاٹ انداز سے کام نہ لیا گیا ہو اور جن کو مرتب کرنے یا ادبی شکل دینے میں ادیب نے اپنے تخیل اور بالواسطہ اندازِ بیان کا سہارا لیا ہو۔

میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں، تو میرے گھر میں لکھنے پڑھنے کا ایسا ماحول تھا جیسے میں نے کسی گھر میں نہیں، بلکہ مکتب یا درس گاہ میں پرورش پائی ہو۔ والد صاحب جغرافیہ اور تعلیمات کے اُستاذ، دادا صاحب عربی کے پروفیسر، دو بڑے بھائی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم اور دور اور قریب کے سارے عزیز و اقارب کسی نہ کسی شکل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک۔ ایسے ماحول میں لکھی ہوئی تحریروں اور کتابوں سے رابطہ قائم ہو جانا بالکل فطری تھا۔ مگر اتفاق یہ تھا کہ شعر و شاعری یا خالص ادب کا ذکر ہمارے گھر میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوتا تھا کہ کبھی کبھی مثال کے طور پر یا

مصنّف کا عنوان: "ادب کی قرأت اور لطف اندوزی"

کہاوت کے انداز میں کوئی نہ کوئی، ایک آدھ شعر ضرور پڑھ دیا کرتا تھا۔ میں نے اسکول کی ابتدائی کلاسوں میں شاعری کے ہلکے پھلکے نمونے پڑھے تھے۔ شفیع الدین نیر کی کتابوں سے لے کر ''ہوائی جہاز''، ''رنگ برنگے غبارے''، ''آدمی نامہ'' اور ''بنجارہ نامہ'' جیسی طویل نظموں تک کی بہت سی چیزیں آج بھی زبانی یاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول پہنچتے پہنچتے بہت سے افسانوں اور انشائیوں سے باخبر ہوگئی۔

میری والدہ لکھنؤ کے زمین دارانہ پس منظر سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ کرامت حسین گرلز کالج کی تعلیم یافتہ تھیں۔ اس لیے روایت میں ان کو پرانی کتابوں خصوصاً مقبول عام ناولوں اور افسانوں سے دلچسپی ملی تھی۔ اس لیے بعض مقبول مصنفین اور مصنفات مثلاً اے۔ آر۔ خاتون، رضیہ بٹ، راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کی افسانوی تحریروں سے میری بھی آشنائی ہوگئی۔ پڑھنے کو تو میں نے کہانی کے شوق میں ایسی تحریریں پڑھ ڈالیں مگر نہ تو مجھے اس وقت ایسے ناموں کی کسی کمی کا احساس ہوپاتا تھا اور نہ ان میں حد سے بڑھی ہوئی رومانیت کا۔ وقت کے ساتھ جب میں باقاعدہ ادب کی طالب علم بن گئی تو مجھے اپنے اساتذہ کے طفیل اچھے ادب، برے ادب، اور اعلیٰ ادب، ادنیٰ ادب کا اندازہ ہونا شروع ہوا اور اس طرح آگے کی راہیں ہموار ہوئیں۔

اس سلسلے میں شاید اس بات کا تذکرہ غیر ضروری نہ تصور کیا جائے کہ مجھ میں شعر و ادب سے ابتدائی دلچسپی کیسے پیدا ہوئی؟ میرے دادا سید محمد بدر الدین علوی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے جو ۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ ان کے بڑے صاحب زادے، یعنی میرے والد ڈاکٹر سید محمد ضیاء الدین علوی، ان کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے والد جغرافیہ میں پی ایچ ڈی، اور اسی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے کام میں مصروف تھے۔ دادا صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنے لکھنے پڑھنے کے سلسلے کو قائم رکھا تھا، چنانچہ انھوں نے عربی کے ممتاز شاعر ''بشار بن برد'' پر کتاب لکھنے کا خاکہ تیار کیا۔ بینائی کی کمزوری اور صحت اچھی نہ ہونے کے باعث یہ طے کیا گیا کہ کسی منشی کا تقرر کیا جائے اور لکھوانے کا کام اس کے سپرد کر دیا جائے۔ بڑی تگ و دو

کے بعد ان کو ایک طالب علم مل گیا جوان کے ساتھ تین چار گھنٹے بیٹھ کر ان کے کام میں مدد کیا کرتا۔ میرے دادا میری والدہ کی دور اندیشی، اور ان کے حسنِ انتظام کے بہت قائل تھے اور اکثر اپنے معاملات میں میری والدہ سے رائے مشورہ ضرور لیا کرتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد اچانک وہ منشی حضرت غائب ہو گئے اور اپنی غیر ذمہ داری کے سبب میرے دادا کو اُلجھنوں میں ڈال گئے۔ ایک دن میرے دادا میری والدہ سے اپنی پریشانی کا ذکر کر رہے تھے اور اس منشی (طالب علم) کے غیر ذمہ دارانہ رویّہ پر بہت دکھی تھے۔ میں اپنی امّی کے پاس کھڑی تھی اور بہت غور سے ان کی باتیں سُن رہی تھی جو اس وقت ہماری سمجھ سے باہر تھیں۔ لیکن ہم تو صرف اتنا جانتے تھے کہ بزرگوں کا کس طرح خیال رکھا جاتا ہے اور کیسے دوڑ دوڑ کر ان کا کام کیا جاتا ہے؟ اور جواب میں دعائیں اور شاباشی وصول کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس سعادت مندی کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے بھی دادا صاحب سے کہہ دیا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے یہ تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ اُس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن بعد میں ہم دادا صاحب کے پاس طلب کر لیے گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا کام کر سکتی ہو، میں نے جواب دیا جو کام آپ بتائیں گے اور مجھ سے جتنا ہو سکے گا ضرور کروں گی۔ اس کے بعد دادا صاحب نے کچھ کام آزمائش کے لیے دیا۔ غرض میں نے دادا صاحب کے سمجھانے کے بعد بڑی ہوشیاری سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت مجھے ادب کا پہلا سبق یہ ملا کہ ادب کیا ہے اور پُرانے ادیبوں اور شاعروں کی اہمیت بعد کے زمانے میں کس طرح بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت دادا صاحب نے مجھے بتایا کہ ''بشار بن بُرد'' کون تھے اور عربی شاعری میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ اور اگر ایسے کسی شاعر یا ادیب کے حالات اور اشعار مختلف کتابوں اور تذکروں میں بکھرے پڑے ہیں تو ان کو کس طرح یکجا کیا جا سکتا ہے۔ شعر و ادب کے اس پہلے سبق سے میں نے سمجھنا شروع کیا کہ ادبی تحریریں عام تحریروں سے الگ کیسے ہوتی ہیں۔ حالاں کہ زیادہ تر کتابیں عربی میں تھیں لیکن میں ''بشار بن بُرد'' کے نام کی نشاندہی تو کر ہی سکتی تھی۔

میرا کام یہ طے پایا کہ موٹی موٹی کتابوں اور دیوانوں میں جہاں جہاں ''بشار بن بُرد'' کا نام یا ان کا ذکر آئے تو میں اس کو نوٹ کرتی رہوں۔ نوٹ کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے پہلے کتاب کا نام، پھر لکھنے والے کا نام پھر یہ کہ وہ کس صفحے اور کس سطر میں آیا ہے۔ اس کی فہرست تیار کروں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ چند روز میں ہی اتنے حوالے جمع ہو گئے کہ جب دادا صاحب نے اس کو دیکھنا شروع کیا تو ان کا کام جیسے آسان ہو گیا اور انھوں نے اپنے کام کا سلسلہ آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ میری بنائی ہوئی فہرست سے دادا صاحب کو کتنی آسانی ہو رہی تھی اس کا اندازہ کرنے کی مجھ میں اس وقت قطعی صلاحیت نہ تھی۔ دادا صاحب کے کام کی رفتار آگے بڑھنے سے مجھے بھی یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ بکھرے ہوئے مواد کو ایک جگہ جمع کرنے سے دادا صاحب کو کتنی آسانی ہوئی۔ اکثر وہ میری ہمت افزائی کرتے۔ یہ کام کم و بیش تین سال تک چلا۔ کبھی درمیان میں منقطع سا ہو جاتا اور کبھی پھر شروع ہو جاتا۔ بہت تلاش کے بعد دادا صاحب کو ایک منشی مل گیا۔ لیکن میرے کام اور اوقات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ شام کو پابندی سے ایک دو گھنٹہ کام ضرور کرتی۔ کتابوں کے سامنے گردن جھکائے جھکائے اکثر تھک جاتی اور دادا صاحب سے کہتی کہ ہم تھک گئے ہیں۔ اب نہیں بیٹھا جاتا۔ جواب میں دادا صاحب کہتے جہاں تک کام ہوا ہے وہیں روک دو اور کوئی نشانی لگا دو اور اس طرح ہم کو چھٹی مل جاتی اور ہم خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہو جاتے۔ پابندی کے ساتھ بیٹھنا کبھی کبھی بہت بُرا لگتا۔ سارے بھائی بہن فرصت سے ہیں اور میں اکیلی کام کر رہی ہوں۔ مگر خیر ہماری محنت رنگ لائی اور کچھ ہی عرصے کے بعد دادا صاحب کی کتاب کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کے بعد ان کو کتاب چھپوانے کی فکر لاحق ہوئی کیوں کہ اس وقت کتاب چھپوانا آسان کام نہ تھا۔ کتاب کا مسودہ بیروت بھیجا گیا اور کافی انتظار کے بعد یہ اطلاع ملی کہ کتاب کو چھاپنے کے لیے منظور کر لیا گیا، یعنی اب وہ کتاب بیروت سے چھپے گی۔ میرے دادا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے اپنے پاس بلایا اور خوب شاباشی دی اور ساتھ میں انعام بھی دیا۔ خاندان کے لوگوں کے سامنے خوشی خوشی بتاتے

کہ میری کتاب کی تیاری میں اس بچّی نے کتنی مدد کی ہے۔ غرض اپریل ۱۹۶۵ء میں کتاب کے چھپنے کی اطلاع مل گئی۔ میرے دادا کتاب دیکھنے کے لیے سخت بے چین تھے۔ مگر افسوس زندگی نے ان کا ساتھ نہیں دیا، کتاب ان کے پاس پہنچ بھی نہ پائی کہ ۱۶ رمئی ۱۹۶۵ء کو وہ اس دارفانی سے رخصت ہو گئے۔

دادا صاحب کی یہ تربیت رنگ لائی اور وہیں سے مجھ میں ایک قسم کی خود اعتمادی اور مستقل مزاجی پیدا ہوگئی اور ایک طرح سے پتہ مار کر کام کرنے کا گویا ہنر آ گیا۔ اس طرح ادب کو پڑھنے، سمجھنے، اور اس پر غور کرنے کی عادت سی بن گئی اور نہ جانے کب اور کیسے ادب کی دنیا میں داخل ہوگئی اور اب میں اس قابل تھی کہ ادبی کتابوں کو سمجھنے اور ان میں لطف بھی لینے لگی۔

ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر پر رہتے یا اکثر اپنے نانیہال لکھنؤ چلے جاتے جہاں میرے کزنز چھٹی ہوتے ہی بے صبری سے میرا انتظار کرتے اور سب کے ہاتھوں میں فرمائش کی طرح طرح کی کتابیں ہوتیں۔ دن کے کھانے کے بعد بچّوں کے کمرے میں سب ایک جگہ جمع ہو کر کہانی سُننے کے لیے بے چین رہتے۔ اس وقت گویا ان سارے بچّوں کی لگام میرے ہاتھ میں ہوتی۔ میں جس سے جو کام کہتی وہ فٹافٹ شروع ہو جاتے۔ کتاب میرے ہاتھ میں ہوتی اور سب بھائی بہن میرے آس پاس، اور اس میں ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی کہ میں دردانہ باجی کے بالکل قریب رہوں۔ اس طرح کتابیں پڑھنے، سُننے اور سُنانے کے عمل نے تیزی اختیار کر لی۔ میں نے اپنے بزرگوں میں نانی نانا، دادا، دادی میں سے صرف دادا کو دیکھا تھا، اس لیے بزرگوں سے کہانی سُننے کے عمل سے میں محروم تھی۔ اس کی کمی کا ہمیشہ احساس رہا، لیکن میرے اس کہانی سنانے کی رفتار نے میرے اردگرد کے چھوٹے بھائی، بہن اور اب بچّوں کی ماشاءاللہ ایک ٹیم تیار کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر عمر کے بچّے مجھ سے بہت جلد قریب ہو جاتے ہیں۔

میں نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں کب اور کیسے شروع کیں۔ یہ تو مجھے یاد نہیں ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میری والدہ بتایا کرتی تھیں کہ میری دادیہال میں لڑکیوں کی

تعلیم اس وقت بالکل رائج نہ تھی۔ لڑکیوں کو گھریلو تعلیم کے بعد خانہ داری میں مصروف کردیا جاتا تھا۔ میری پھوپھیوں نے بھی گھر میں تیاری کر کے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ میرے گھرانے میں لڑکیوں کی پیدائش باعث رحمت سمجھی جاتی تھی اور انھیں بہت پیار دیا جاتا تھا۔ لیکن اسکول بھیج کر تعلیم حاصل کرانے کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ لیکن میری والدہ چونکہ خود پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ کلکٹر کی بیٹی، زمانہ دیکھے ہوئے تھیں اور اس کے اُتار چڑھاؤ سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے ان کو میری اور بڑی بہن کی تعلیم کی فکر لاحق ہوئی، لیکن دادا بالکل مخالف۔ ہوش سنبھالتے ہی ہم دونوں بہنوں کو اُسی روایتی تعلیم میں مصروف کردیا گیا۔ بڑے بھائیوں کو پڑھانے ماسٹر صاحب آتے۔ ان کے پاس بیٹھ کر تھوڑا حساب کتاب کرلیا، پھر ایک مولوی صاحب آتے ان سے قرآن شریف پڑھ لیا بس اتنا کافی تھا۔ لیکن میری والدہ برابر متفکر رہتیں کہ لڑکیوں کو بھی اسکول جانا چاہیے۔ دادا اس کے لیے تیار نہیں کہ لڑکیاں اسکول جائیں۔ غرض امّی کی کوشش اور بار بار کے اصرار پر دادا صاحب نے اجازت دے دی۔ اس طرح ہم لوگوں کو اسکول جانے کا موقع مل گیا اور ہم دونوں بہنوں کا داخلہ عبداللہ گرلز اسکول کی دوسری جماعت میں کرادیا گیا اور ہم لوگ پابندی سے اسکول جانے لگے اور کامیابی سے آگے بڑھنے لگے۔

میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جس نے پی ایچ ڈی کی اور درس و تدریس کے کام کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ظاہر ہے میں نے جس ماحول اور جس خاندان میں آنکھیں کھولیں وہاں لڑکیوں کے لیے سائنس اور حساب پڑھنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا ورنہ آج صورت حال بدلی ہوئی ہوتی۔ بہرکیف انٹر کرنے کے بعد، میں باقاعدہ طور پر ادب کی طالب علم بن گئی۔ ادب کا پڑھنا اور سمجھنا اب ہماری ضرورت، ہمارا شوق اور ہماری دلچسپی بن گیا۔ درس و تدریس کے ناتے ادب کا علم حاصل کرنا اب ہماری سب سے بڑی ضرورت بن گیا کیوں کہ اب ہمارے سامنے ایک نئی نسل تیار کھڑی ہے جس کو اپنے علم کے ذریعے آگے بڑھانے کی اب ہماری ذمہ داری بن چکی ہے۔

میں نے بی۔اے سے ہی اُردو ادب میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ بی۔اے آنرز اور پھر ایم۔اے بھی اُردو ادب میں کیا۔ چوں کہ مجھے فکشن میں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی تحریروں کے موضوع کا انتخاب کرنے کے بعد میں نے اپنی پوری توجہ تحقیق میں صرف کر دی اور بالآخر وہ دن آ گیا جب میں نے اپنا تحقیقی مقالہ ڈگری کے لیے داخل کر دیا اور خدا کا فضل و کرم تھا کہ مجھے اس میں کامیابی بھی مل گئی۔

میں کبھی کبھی ماضی کے دھند لکے میں جھانکتی ہوں اور اپنی پڑھی ہوئی چیزوں کا لطف لینے کا تجزیہ کرتی ہوں تو مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ ابتدا میں، میں نے رومانی ناولوں کے علاوہ جاسوسی ناول بھی پڑھے ہیں۔ جاسوسی ناول میں دلچسپی کا جو عنصر ہوتا ہے وہ یقیناً اپنی طرف کھینچتا ہے مگر خطرات میں کود جانا اور جان تک کو جوکھم میں ڈال لینے کی جس طرح کی کہانیاں جاسوسی ناول میں بیان ہوتی ہیں، ان سے لطف لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں —— شاید لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو اس طرح کا ایڈونچر زیادہ پسند آتا ہوگا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میرے بڑے بھائی کو نہ جانے کہاں سے جاسوسی ناولیں پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ وہ ابن صفی کے جاسوسی ناول بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ میں اکثر دیکھتی کہ وہ کوئی کتاب لیے بیٹھے ہیں اور بسا اوقات کچھ مسکرا مسکرا کر پڑھ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ کورس کی کتابیں پڑھنے میں ان کو اتنی مسکراہٹ کیوں آتی ہے۔ ایک دن اتفاق سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ایسے ناولوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ناول ہم لوگوں سے چھپا کر لکڑی کے صندوق میں رکھتے اور کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے۔ ایک دن ان کا ایک جاسوسی ناول میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے اُسے چھپا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا، غرض کئی ناول پڑھ ڈالے مگر رفتار بڑی دھیمی تھی اور میں ڈری ہوئی رہتی تھی۔ سردی کی راتوں میں بستر میں گھس کر ایک ناول پڑھ رہی تھی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ جتنا آگے بڑھتی خوف کا احساس اتنا زیادہ

ہوتا گیا بالآخر ناول بند کر کے سوگئی۔ رات میں ڈراؤنے خواب دیکھے اور کچھ عجیب سی وحشت طاری ہونے لگی۔ جب صبح سو کر اٹھی تو پتہ چلا کہ ہمارے آؤٹ ہاؤس سے ہمارے ملازم کو چوری کے الزام میں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس اتفاقی واقعے کو میں نے اپنے ناول والے خوف سے جوڑ لیا اور کچھ زیادہ خوف زدہ ہوگئی۔ وہ دن تھا اور آج کا دن، پھر کبھی کسی جاسوسی ناول کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ اس کے بعد ادبی چیزوں کو پڑھنے کا شوق اور زیادہ ہوگیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ ہمارے گھر پاکستان کے کئی ادبی ڈائجسٹ پابندی سے آنے لگے۔ چنانچہ میں نے اس میں شامل سماجی اور رومانی تحریروں میں پناہ ڈھونڈھ لی اور مجھے ان میں لطف آنے لگا۔

مجھے شروع سے رات میں جلدی بلکہ بہت جلدی سونے کی عادت تھی۔ اس لیے میں پڑھنے لکھنے کا کام دن میں ہی پورا کر لیا کرتی تھی۔ کبھی کسی گوشے کی تلاش میں، کبھی کسی تنہا کمرے میں بیٹھ کر اپنا کام ختم کرنے کی جلدی اور کبھی کبھی بھری دوپہر میں چھت پر جا کر اپنے شوق کی کتابوں کو پڑھنے لگتی۔ گرمیوں کی دوپہر میں جب گھر کے سارے لوگ آرام سے سوتے تو میں دوپہر کی سخت دھوپ میں چھت پر جا کر کوئی نہ کوئی سایہ دار گوشہ نکال کر اپنے لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتی۔ ایک روز ابا کی نظر مجھ پر پڑ گئی کہ میں دھوپ کے وقت چھت پر سے آرہی ہوں۔ کہنے لگے اتنی دھوپ میں چھت پر کیوں گئی تھیں۔ ''خبردار کچا آم مت کھانا''۔ میں نے کہا ابا! ہم وہاں پڑھ رہے تھے۔ آم کے پیڑ کی وجہ سے پوری چھت پر سایہ رہتا ہے۔ دھوپ کا نام بھی نہیں ہوتا۔ دھیرے دھیرے سب کو معلوم ہوگیا کہ میں دن ہی میں موقع نکال کر اپنی پڑھائی لکھائی پوری کر لیتی ہوں۔ ایسی باتوں سے میری امی بہت خوش ہوتیں اور میری ہمت افزائی کرتیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ پہلے نصابی کتابوں کے ذریعے اور پھر رفتہ رفتہ ادب سے اپنی لطف اندوزی کی وجہ سے، ادب پڑھنا میرا شوق بن گیا۔ مگر جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ خواتین کے لیے کسی بھی ذہنی مشغلے اور ذوق وشوق کے مطابق زندگی گزارنا

کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا کہ چاہنے کے باوجود ادب پڑھنے کے لیے اتنا وقت نہیں لگا پاتی جتنا تقاضا میرا ذوق یا میرا ذہن کرتا۔

طالب علمی کا زمانہ ہو یا درس و تدریس کا پیشہ، میرا اوڑھنا بچھونا چوں کہ ادب قرار پایا اس لیے ادبی تحریروں کو پڑھنا میرا ذوق بھی بن گیا اور میری ضرورت بھی۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو جنونی حد تک ادب کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اور ادب کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے۔ مجھے کہانیوں نے ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کیا اور اُردو کے بہترین ناول نگار اور افسانہ نگار خواہ وہ یلدرم، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی ہوں یا قرۃ العین حیدر اور ان کے معاصر دوسرے فکشن لکھنے والے، ان سب کی زیادہ تر تحریریں میں نے پڑھ ڈالیں۔ اس ضمن میں اپنی ایک دشواری کا ذکر کرنا یہاں غیر ضروری نہ ہوگا کہ ابتدا میں ناول اور افسانے میں کہانی بیان کرنے کا وہ نیا انداز جو سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، اور راجندر سنگھ بیدی کے یہاں ملتا ہے، مجھے کچھ غیر مانوس لگتا تھا مگر رفتہ رفتہ میری واقفیت ان سارے اسالیب اور طریقوں سے ہوگئی جو نئی کہانی کے اسالیب ہیں۔ شروع میں مجھے کہانی بیان کرنے کی نئی نئی تکنیک کچھ عجیب سی لگتی تھیں مگر بعد میں اندازہ ہوتا گیا کہ نئی تکنیک سے تو ادیب بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنی تحریر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

دیگر ذمہ داریوں میں مصروفیت کی وجہ سے اب صرف منتخب تحریریں اور ادبی نمونے پڑھنے کا مشغلہ رہتا ہے۔ درس و تدریس کے لیے پڑھنے اور طالبات کو پڑھانے کے عمل میں ادب پڑھنے کا عمل ایک دوہرا عمل بن جاتا ہے۔ جو چیز پسند نہیں آتی یا جو مصنف اپنی طول بیانی کے سبب قاری کا وقت ضائع کرتا ہے اگر اس سے ایک بار طبیعت مکدر ہو جاتی ہے تو اس کی طرف عموماً دوبارہ توجہ مبذول نہیں ہو پاتی۔ ادب کا پڑھنا میرے لیے اپنے آپ کی تربیت کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی دنیا کو نئے سرے سے دریافت کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے جب تک ہوش و حواس قائم ہیں اور اپنے ذوق و شوق کی تکمیل ممکن ہے پڑھنے کے عمل کو جاری رکھنا ہے۔ میں ہمیشہ دعا کرتی ہوں کہ علم کسی نہ کسی روپ میں ہمیشہ میرے لیے علم نافع ثابت ہوتا رہے۔

ادب اس وقت تک عام تحریروں کی طرح ایک تحریر ہوتا ہے جب تک انسان اس کی لذت سے آشنا اور اس کے سحر میں گرفتار نہیں ہوتا۔ ادب کا چسکا خواہ اپنے آپ لگے یا کسی پیشہ ورانہ مجبوری کی وجہ سے، مگر وہ چسکا رفتہ رفتہ نشہ سا بن جاتا ہے۔ میں نے جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا کہ میرے گھر میں شاعری کا کوئی ماحول نہ تھا مگر جب وقت کے ساتھ ساتھ درسی طور پر شاعری پڑھی اور اس سے زیادہ ایک استاذ کی حیثیت سے شاعری پڑھانے لگی تو ایسا لگا کہ فکشن تو کئی صفحات کے بعد اپنا اثر دکھانا شروع کرتا ہے جب کہ شاعری کی اثر انگیزی بہت جلد بلکہ لمحوں میں شروع ہو جاتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ شاعری جتنی جلد اپنا اثر دکھاتی ہے اتنی جلدی اس کا اثر زائل نہیں ہوتا۔ بلکہ کئی کئی دنوں تک بعض موقعوں پر ذہن میں مصرعے گونجتے رہتے ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ اس بات کو اس سے بہتر انداز میں تو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے کالج میں ادب پڑھانے کے دوران اکثر محسوس ہوتا ہے کہ ادب پڑھ کر جس لطف اور جس انبساط سے دوچار ہوئی تھی کبھی کبھی پڑھانے کے دوران طالبات بھی اس لطف و انبساط میں پوری طرح شامل ہو جاتی ہیں۔ مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ شاعری ہو یا افسانہ، یا کوئی اور ادبی صنف اگر پوری طرح کھو کر اور متن میں ڈوب کر اس سے لطف لینے اور اس لطف کو طالبات کے ذہنوں تک منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کر لی جائے تو اس انبساط کا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے ایسا ہر تدریس اور ہر کلاس میں ممکن نہیں ہے۔ اس کیفیت کے لیے پڑھانے والے اور پڑھنے والے دونوں کا موڈ اور دونوں کا ذوق پوری طرح سرگرم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی تکلف نہیں کہ ایک عام طالب علم سے ادب کے ایک باذوق قاری بننے تک کا میرا سفر بڑی حد تک ادب کی تدریس کی بدولت بھی ہے۔ اس لیے اب ایسا لگتا ہے کہ ادب کی تدریس میرا پیشہ ہی نہیں، میرا ذوق، میری لگن اور میری مسرّت و شادمانی بھی ہے۔

●

ڈاکٹر نیلم فرزانہ

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ میرے لیے یہ ایک ایسا ہی سوال ہے کہ جیسے ہم کھانا کیوں کھاتے ہیں؟ ہم سوتے کیوں ہیں؟ آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ کھانا اور سونا تو ہر ایک ہے لیکن ادب ہر ایک نہیں پڑھتا۔ بالکل بجا فرمایا آپ نے، ادب ہر ایک نہیں پڑھتا۔ لیکن جناب ہر آدمی ایک طرح کا کھانا نہیں کھاتا، ایک جیسی نیند نہیں سوتا لیکن ہر ایک کا کھانا اور سونا کم و بیش ایک جیسے نتائج سامنے لاتا ہے یعنی جسم اور دماغ زندہ رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح ادب کا مطالعہ ایک ایسا فعل ہے جو میں سمجھتی ہوں قلب و ذہن کو زندگی عطا کرتا ہے۔ اور ہم صرف جاندار نہ رہ کر انسان کہلانے کا حق حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف ادب پڑھنے والے ہی انسان ہوتے ہیں۔ آدمی کی مخلوق میں انسان اور بھی ہوتے ہیں وہ ادب کے بجائے کسی دوسرے فنِ شریف سے شغف رکھتے ہیں جو ان کے دل میں سوز و گداز پیدا کرتا ہے۔

بہر حال ہم جیسے ادب کے طالب علم کے لیے تو شاعری اور فکشن ہی ہمارے قلب و ذہن کی زندگی کا سامان ہیں۔ یہاں ذرا رک کر میں آپ کو اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں کہ ہم عورتوں کو یہ غذا بھی کھانے اور نیند کی طرح پیٹ بھر کے نہیں ملتی۔ شاید ازل نے ہمارے ذمے کچھ اور کام بھی لگا رکھے ہیں۔ میں جو یہ چار سطریں آپ کے سامنے لے کر حاضر ہوئی ہوں جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ سامعین میں چند ہم جنسوں کے علاوہ باقی یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ذرا سی دیر کی یکسوئی کے لیے

ہمیں اپنے بدن کی طرح لمحے بھی چرانے پڑتے ہیں۔ خیر شکوہ برطرف۔ آپ یہی الزام دھریں گے کہ۔

یہ سب نا آشنائے لذّت پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

تو شکوہ چھوڑ کر ہم اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔ مذاکرہ کا موضوع کہ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ میرے سامنے آیا تو میں نے ذرا سی بے ضرر ترمیم کے ساتھ قبول کیا کہ ادب پڑھنا ہمیں کیوں اچھا لگتا ہے؟ دل نے چپکے سے اپنی معصوم بچّی زبان میں کہا۔ اس میں اثر ہے۔ اس اثر کو پہلی بار میں نے آٹھ سال کی عمر میں محسوس کیا تھا۔

جاڑے کے دن تھے، دروازے پر ایک پرندہ بیچنے والا آیا تھا۔ میں نے اس سے پنجرہ سمیت ایک تیتر خریدا۔ اس تیتر کو سردی سے بچانے کے لیے میں اس کے پنجرہ پر ایک موٹا کپڑا ڈال دیتی تھی لیکن میں جب بھی اس پردے کو ہٹا کر اس کی خیریت دریافت کرنا چاہتی وہ زور زور سے پھڑ پھڑانا شروع کر دیتا اور میں گھبرا کر اسے پھر کپڑے سے ڈھک دیتی۔ میں سمجھتی تھی، اسے سردی لگتی ہے۔

انھیں دنوں ہمارے گھر میں ریڈیو پاکستان بہت چاؤ سے سنا جاتا تھا۔ ہندستان پاکستان کی جنگ چل رہی تھی اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ صحیح خبریں صرف پاکستان ریڈیو سے آیا کرتی ہیں۔ ایک دن صبح صبح خبر کے بعد ریڈیو پر ایک نغمہ بج رہا تھا:

آزاد مجھ کو کر دیے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اس دن جب میں اسکول گئی تو تیتر کو ایک رومال میں باندھ اپنے ساتھ لے گئی۔ میرے اسکول کے بازو میں ایک گرجا تھا اسکول اور گرجا کے درمیان بس ایک دیوار تھی اور یہاں جنگل کی طرح بہت سارے درخت تھے۔ میں نے تیتر کی رہائی کے لیے اسی مقام کو منتخب کیا تھا۔ جب میں نے رومال کھول کر اس تیتر کو اُڑانا چاہا وہ زمین پر گر گیا میں نے اسے زمین پر سے اُٹھایا اور درخت کی ایک شاخ کی طرف اچھالا اس کوشش میں

اس نے میرا ساتھ دیا۔ درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ گر گیا۔ اب کی بار وہ دوسری طرف یعنی گرجا کی باؤنڈری میں گرا تھا اب میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی کہ اسکول سے باہر جانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں بہت دیر تک کھڑی اس کے شاخ پر بیٹھنے کا انتظار کرتی رہی لیکن میرا انتظار بے سود رہا۔ شاید اس کی قوت پرواز ختم ہو چکی تھی۔ یا پھر اس نے اُڑنے کی کوشش کی ہوگی یا کسی شکم پرست کا نوالہ بن گیا ہو؟ کون جانے۔

تیتر کی رہائی کا پروانہ لانے والی اس نظم کے واسطے سے میرا تعارف اقبال سے ہوا۔ اپنے گھر میں مجھے ''بانگ درا'' مل گئی۔ یہ کتاب میری آپا کی ملکیت تھی اور ان کی تنبیہ تھی کہ میری کتابیں مت چھونا، پھٹ جائیں گی۔ اس لیے میں نے اس کتاب کو چوری چوری پڑھنا شروع کر دیا پھر تو شاعری مجھے کھلونے کی طرح عزیز ہو گئی۔ بانگِ درا کی ابتدائی نظمیں، اپنے اور اپنی دوسری بہنوں کے کورس کی ساری نظمیں اور غزلیں میں کتاب ہاتھ لگتے ہی ازبر کر لیتی تھی۔ نہیں وہ ازبر ہو جاتی تھیں کیوں کہ میں انھیں پڑھتی نہیں محسوس کرتی تھی ایک بار نہیں بار بار۔ کب وہ میرے حافظے کا حصہ بن جاتیں پتہ نہیں چلتا۔

اسکول کے بعد تاریخ اور فلسفہ کے ساتھ ادب ہمیشہ میرے نصاب کا حصہ رہا میری اپنی پسند کے سبب انٹر اور بی۔اے میں شاعری کے ساتھ فکشن پڑھنے کا موقع ملا۔ پریم چند کا 'نرملا' انٹرمیڈیٹ کے کورس میں شامل تھا۔ یہ سماج کے ظلم کا شکار ایک لڑکی کی دردناک کہانی تھی۔ پھر بحسنِ اتفاق کہیں سے ہندی میں مجھے دیوداس مل گیا۔ اس ناول کی کہانی بھی حیرت انگیز طور سے نرملا سے ملتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا کہ کیا ناولوں میں مظلوم عورتوں کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ شاعری کے تعلق سے بھی کچھ انکشافات سامنے آئے۔ کورس میں پڑھی جانے والی میر اور غالب کی غزلوں میں بھی اکثر عورتوں کی باتیں تھیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

؎ کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر

تو کیا ادب میں عورتوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کلامِ اقبال کھنگالنا شروع کیا۔ ایک بات بتاتی چلوں کہ میں اس وقت اپنے تمام تصورات کے لیے سند اقبال سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہ ایک عجیب سی عقیدت اور محبت تھی۔ میری تلاش رائیگاں نہ گئی، سند مل ہی گئی۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوز دروں

اور میں نے مان لیا کہ شاعری ہو یا فکشن ہمارے ذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ میرے اس خیال کی تائید ہم جماعت لڑکیوں نے بھی کی۔ جن کے بستے میں تاریخ، جغرافیہ اور حساب کی کتابوں کے ساتھ رضیہ بٹ، اے۔ آر خاتون، عفت موہانی، گلشن نندہ، عادل رشید، نسیم انہونوی کا کوئی نہ کوئی ناول ضرور موجود ہوتا تھا جو ایک دوسرے سے بدل بدل کر پڑھا جاتا تھا یا پھر بیسویں صدی اور شمع کی کہانیاں۔ اب میں سوچتی ہوں کہ یہ تحریریں چاہے اعلیٰ ادب میں شمار نہ کی جاتی ہوں زبان کو صحیح پڑھنے اور صحیح املا لکھنے کی تربیت ضرور کرتی تھیں۔ میں نے اپنے دور کی طالبات میں چاہے ان کا خاص مضمون اُردو نہ بھی ہو ہمیشہ یہ پایا کہ ان کی تحریر اور تقریر میں زبان اور املا کی غلطیاں نہ کے برابر تھیں۔ آج صورت حال بے حد تشویشناک ہے۔ آپ نے بھی یقیناً اندازہ لگایا ہوگا کیوں کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اس دشت میں ہر سال نئے دیوانوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے اکثر سے پوچھا کہ بھئی آپ اُردو ادب کیوں پڑھ رہی ہیں؟

جی ہم نے مانگا نہیں تھا ہمیں تو مل گیا۔

بھئی کیوں مل گیا۔

وہ اس لیے کہ ہماری age % ذرا کم تھی کسی اور مضمون کے بجائے اُردو میں داخلہ مل گیا۔

بے چاری مظلوم اُردو۔ لیکن ہمیں بعد میں معلوم ہوا بے چاری اُردو سے زیادہ مظلوم ایک بے چارہ بھی ہے، بے چارہ فلسفہ۔ جب age ٪ ذرا اور کم ہو تو فلسفہ میں داخلہ مل جاتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ یہ وہ کلجگ ہے جس کے لیے پیش گوئی کی گئی تھی کہ ''ہنس چنے گا دانہ دنکا کوا موتی کھائے گا''۔

یہ میں کن راستوں پر آ گئی۔ اس خطرناک موضوع پر اظہارِ خیال سے بہتر ہے کہ میں اپنی جون میں واپس چلوں۔ ہاں تو پھر میرے ذہن کی کائنات میں شاعری اور فکشن، فکشن اور شاعری کی سرحدیں ٹکرانے لگیں۔ شاعری دل کی سہیلی تھی۔ فکشن نے بڑی عمر کے معشوق کی طرح سر پر دستِ شفقت رکھا۔ پی ایچ. ڈی کے لیے جو موضوع مجھے دیا گیا وہ تھا ''اہم خواتین ناول نگار''۔ ایک اور انکشاف کہ ہم تخلیق کا موضوع ہی نہیں خود تخلیق کار بھی ہیں۔ ایسے تخلیق کار جو ادب کی تاریخ بناتے ہیں، پھر کیا تھا۔ گرمی کی تپتی ہوئی دوپہروں کا سناٹا اور ہاتھ میں 'آگ کا دریا'۔ پوچھیے مت، وہ کیسی عجیب دنیا تھی۔ اس آگ سے دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ ''چمپا'' جانے کب شعور کے راستے لاشعور میں داخل ہو کر میرے خوابوں کا حصہ بن گئی۔ اور بھی کئی کردار میرے اپنے ہو گئے۔ سیتاؤں کا ہرن میں نے دیکھا ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹیز میں ثریا حسین سے ملی ہوں۔ گوتم نیلمبر اور ریحان الدین احمد کو راج سنگھاسن پر بٹھایا ہے۔ کمال کی جلاوطنی میں اس کی ہمسفر رہی ہوں۔ آنگنوں میں عالیہ اور چھمی سے باتیں کی ہیں۔ حسرتوں سے داغ داغ کبریٰ کو دل میں اتارا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ مل کر کائنات کے بدلتے ہوئے موسموں کا نظارہ کیا ہے۔ شہروں اور قصبوں میں گھومی ہوں۔ سندر بن کی خاک چھانی ہے۔ میگھنا کی مہیب لہروں پر ناؤ میں بیٹھی ہوں۔ وقت کی سرحدوں کو لانگ کر ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کی تباہ کاریوں کے درمیان خود کو کھڑا پایا ہے۔ کیسے کہہ دوں ادب کچھ اور ہے زندگی کچھ اور۔

سچ تو یہ کہ فکشن کے مطالعہ نے ہی شاید مجھے شاعری پڑھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کیا ہے۔ اکثر نظمیں پڑھتے ہوئے چاہے وہ فیض کی ہوں یا اختر الایمان کی، راشد کی

ہوں یا میرا جی کی، میری نگاہیں ان میں کرداروں اور فضاؤں کے پیکر تراش لیتی ہیں اور ہم زندگی کا ڈرامہ دیکھنے لگتے ہیں بلکہ غزلوں کے بھی بہت سے اشعار مجھے کہانیاں سناتے ہیں۔ اس طرح میری راتیں مختصر ہو جاتی ہیں۔

میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ ادب کی دستک بھی محبت کی طرح دل کے دروازے پر ہوتی ہے۔ اس آواز پر اگر دیدۂ دل وا ہو جائے تو پھر یہ مہمان ہمارے لیے مسرّت اور بصیرت کی روشنی کا تحفہ لے کر آتا ہے۔ شاید یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ہمیں زندگی سے کوئی شکایت نہیں رہتی اور زندہ رہنے کا جواز مل جاتا ہے کہ بس۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

●

اقبال حسین صدیقی

زیرِ نظر موضوع ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں'' کے سلسلے میں ادب کی ماہیت اور پڑھنے کے مقصد کے متعلق بہت سی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ادب پڑھنا اور پڑھانا ہمارے پروفیشن کا حصہ ہے۔ نصاب میں شامل ادب پاروں اور فن پاروں کی اہمیت سے انکار دن کو دن کہنے سے انکار کے مترادف ہے۔ نصابات میں وہی فن پارے شامل کیے جاتے ہیں جو اس ادب کے نمائندہ اور شاہکار ہوتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مجھے نصاب میں شامل ادب پاروں سے روشنی ملی ہے۔ البتہ اپنے مطالعہ کو محض نصاب تک محدود رکھنا بہت بڑے نقصان کا سبب ہوتا ہے۔ ادب میں تازہ رجحانات اور نت نئی جہتوں سے واقف اسی صورت میں ہوا جا سکتا ہے، جب ہمارا مطالعہ مسلسل جاری رہے اور قدیم ادب کے ساتھ ساتھ عصری ادب کو پڑھنے کا ذوق اور شوق ہو۔ مسلسل اور متواتر پڑھتے رہنے سے اچھے اور بُرے، معیاری اور غیر معیاری ادب کی پہچان بھی ہوتی ہے۔ میرے ادبی ذوق کی تربیت باہر سے نہیں بلکہ صرف ادب کے مطالعہ سے ہوئی ہے۔ میں نے اپنے مطالعہ کے دوران پروفیسر آل احمد سرور کے اس جملہ کو ہمیشہ درست پایا کہ ''ادب ذہنی مسرّت وبصیرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔'' میرے خیال میں ادب پڑھنے کا کوئی ایک سبب نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی Specific مقصد ہو سکتا ہے، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ وجہ بھی بدلتی ہے اور مقصد بھی بدلتا ہے۔ ادب اطلاع فراہم کرتا ہے، لیکن یہ

اطلاع اخباری اطلاع سے الگ اس لیے ہوتی ہے کہ اخباری اطلاع تو ایک بار پڑھنے کے بعد اکثر اپنی معنویت ختم کر دیتی ہے، جب کہ ادب کے ذریعہ ہم جن چیزوں سے باخبر ہوتے ہیں ان کی معنویت اور اس کی جہتیں وقت کی تبدیلی کے ساتھ مزید روشن اور واضح ہوتی ہیں۔ اس لیے میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ادب پڑھنے کے اسباب وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ذہنی تربیت اور استعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ فن پارہ کی تفہیم اور تعبیر و تشریح کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ برسوں قبل میں نے آسکر وائلڈ کی کہانی ''بلبل اور گلاب'' پڑھی تھی اور آج جب بھی اس کو پڑھتا ہوں اور پڑھنے کے بعد جو کچھ محسوس کرتا ہوں، دونوں میں کافی فرق ہے۔ میں نے غالبؔ کی غزلوں یا اقبالؔ کی نظموں کا مطالعہ جس طرح طالب علمی کے زمانے میں کیا تھا اور اس وقت جن کیفیتوں کا احساس ہوا تھا، آج اس سے محظوظ ہونے کی وجہ بالکل مختلف ہے۔ ادب کا کام مصلح کا نہیں ہے اور نہ ہی صرف حصولِ مسرّت ادب پڑھنے کا جواز بن سکتا ہے، اس کے تو دوسرے بہت سے ذرائع بھی ہیں۔ میں ادب اس لیے پڑھتا ہوں کہ اس سے مسرّت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔

میرے نزدیک ادب ایک بہتر انسان پیدا کرنے کا آلہ ہے۔ ذاتی طور پر میرا تجربہ یہ ہے کہ میں ایک اچھا فن پارہ یا کتاب پڑھ کر خود کو پہلے سے بہتر پاتا ہوں، اس لیے میں اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم ہوں کہ ادب خیر و شر میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ البتہ ہر ادب کو پڑھنے کے بعد مجھ پر الگ کیفیات و اثرات مرتب ہوتے ہیں، چنانچہ Wasteland پڑھنے اور آئنسٹائن کی تھیوری آف ریلیٹیوٹی (Relativity) پڑھتے وقت الگ الگ طرح کی کیفیتوں سے دوچار ہونا فطری بات ہے۔ اسی طرح اقبالؔ کی نظم ''مسجد قرطبہ'' اور انیسؔ کے مرثیے کے مطالعے سے لذّت و انبساط اور روحانی تسکین حاصل کرنے کا مجھے مختلف تجربہ ہوا ہے۔ لیکن اس بدلتے ہوئے تناظر میں جہاں ہر چیز غیر متوقع گئی ہیں، پُرانی قدریں پامال ہوتی جارہی ہیں، زندگی کے نئے پیمانے بن اور بگڑ رہے ہیں، Globlization اور اس نتیجہ

میں بنتا ہوا نیا معاشرہ، بین الاقوامی دہشت گردی اور ایک ملک کا دوسرے ملک پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے جارحیت کا ایک نیا رویّہ اور اس کے نتیجہ میں اسلحوں کی ذخیرہ اندوزی کے رجحان نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے۔ دوسروں کو کم تر اور خود کو برتر سمجھنے کا یہ رجحان مریضانہ اور خطرناک بھی ہے۔ ایسے میں ادب کی تخلیق اور مطالعہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور ادب کا رول بھی وسیع تر ہو جاتا ہے۔

چوں کہ انسانی شعور و ادراک کا بہترین اظہار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے اور تہذیبِ عالم کے لیے انسانی عقل و دانش کے پاس اس سے بہتر کوئی اور تحفہ نہیں۔ تہذیبی عظمت کی پرکھ اس کے فنونِ لطیفہ ہی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ گویا بہتر مستقبل کی تعمیر، اچھے معاشرے کی تشکیل اور بشر دوست ماحول قائم کرنے کے لیے اور نئے مادہ پرستانہ رویّہ کے نتیجہ میں تباہ ہوتے ہوئے انسانی اقدار کو بچانے کے لیے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ میرے ادب پڑھنے کا یہی سبب ہے اور یہی جواز بھی۔

●

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ یہ سوال انفرادی نوعیت کا بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ انفرادی طور پر اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے ادب کے مطالعے سے فطری طور پر دلچسپی رہی ہے اور ادب پڑھنے میں جو مزہ آتا ہے وہ علوم وفنون یا دنیا کی کسی اور کتاب کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ پہلے میں ادب کا طالب علم تھا، اس لیے اسے پڑھتا تھا اور اب ادب کے شعبے میں استاد ہوں اس لیے درس و تدریس کی ضرورتوں نے مجھے ادب کے مطالعے کا پابند کر رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پابندی میں بھی میرے فطری میلان، آزادیِ انتخاب اور دلچسپی ہی کا عمل دخل رہا ہے، لیکن اس سوال کا جواب محض اتنی سی بات سے مکمل نہیں ہوتا اور ادب پڑھنے کے انفرادی اور شخصی اسباب وعوامل تک ہی اگر ہم اپنی گفتگو کو محدود کرلیں تو اس سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیوں کہ مطالعۂ ادب کے ذاتی اسباب کے کوئی خاص معنی بھی نہیں ہیں اور اگر ہوں گے بھی تو دوسروں کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور ایسی گفتگو میں بہرحال ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کہیں تعلّی آمیز سوانحی رنگ نہ اختیار کرلے۔ غالبؔ کو اپنے شعروں کے انتخاب کے باعث دل کا معاملہ کھل جانے اور رسوا ہوجانے کا خیال درپیش تھا، لہٰذا مجھے ابھی ایسا کوئی انتخاب یہاں پیش نہیں کرنا ہے۔

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ یہ ایک اجتماعی سوال ہے اور اس میں یہ سوال بھی پوشیدہ ہے کہ ادب پڑھنے کا کیا جواز ہے؟ سائنس اور تکنالوجی کی ترقی نے تمام سماجی

علوم کی معنویت پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ سائنسی ترقی نے ہماری زندگی میں بہت سی آسانیاں فراہم کر دی ہیں لیکن اس کی لعنتوں نے زندگی کو اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترقی معکوس کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے ٹھیک ہی کہا تھا:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

مادّیت اور صارفیت کے رجحان نے معاشرے کے زاویۂ نظر کو تبدیل کر دیا ہے اور ہم تمام اشیا کو افادی نقطۂ نظر سے ہی دیکھنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک رجحان ہے جو بالآخر معاشرے کو خوف ناک صورت حال سے دوچار کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ادب کی ماہیت پر غور کرنا اور اس کی معنویت پر اصرار کرنا آج ہمارے لیے زیادہ ضروری ہے۔

ادب کی اہمیت اس کی قدامت سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں غالباً سب سے پہلے جو کچھ لکھا گیا وہ ادب ہی تھا خواہ موضوع اور معیار کے لحاظ سے اس کی جو بھی حیثیت رہی ہو۔ فلپ سڈنی نے شاعری کے جواز سے متعلق اپنے ایک مضمون میں ان لوگوں کو ناشکرا قرار دیا ہے جو عالم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور شاعری کے خلاف ہیں، کیوں کہ سڈنی کے بقول وہ اس چیز کو بگاڑ رہے ہیں جس نے بہترین قوموں اور بہترین زبانوں کو جہالت کے مقابلے میں سب سے پہلے روشنی عطا کی ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ یونان کے فلسفی بھی دنیا کے سامنے شاعروں ہی کے روپ میں آئے اور افلاطون کی تصانیف میں بھی بنیادی اور مرکزی چیز فلسفہ ضرور ہے لیکن اس کا مزاج شاعری سے ہی رنگ و نور حاصل کرتا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مورخ اگرچہ وقوع پذیر حقائق کو بیان کرتا ہے لیکن وہ بھی اپنا اندازِ فکر اور آہنگ شاعروں سے ہی لیتا ہے۔

ادب انسانی تخیّل کو مہمیز کرتا ہے اور بہت سی سائنسی ایجادات بھی اسی تخیّل کا ثمرہ ہیں، اس لحاظ سے سائنس کو ادب پر نہیں بلکہ ادب کو سائنس پر فوقیت حاصل ہے۔

ادب محض ہمارے لیے ضیافت طبع ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ ہماری زندگی میں ترتیب و تنظیم، اعتدال، میانہ روی، ضبط و تحمل، انسانی دردمندی اور ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ادب کا مطالعہ ہمیں اپنی بہت سی محرومیوں، مجبوریوں، نامرادیوں اور ناآسودگیوں پر قابو پانے یا انھیں کم کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت اور ترسیل و ابلاغ کی صلاحیت اسی کے وسیلے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمیں ذہنی اور جذباتی سطح پر زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ہماری زبان اور تہذیب کو بھی تحفظ اور زندگی عطا کرتا ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جن قوموں کی زبان اور تہذیب مر جاتی ہے وہ قومیں زندہ رہتے ہوئے بھی مُردوں کی فہرست میں شامل ہو جاتی ہیں اور جن قوموں کی زبان اور تہذیب زندہ رہتی ہے وہ کبھی مرتی نہیں ہیں۔

رابرٹ فراسٹ نے شاعری کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ شاعری مسرّت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت پر ختم ہوتی ہے۔ ("Poetry begins in delight and ends in Wisdom") یہ قول سرور صاحب کے ذریعہ اُردو میں بہت عام ہو گیا۔ فراسٹ کا یہ قول گرچہ شاعری سے متعلق تھا لیکن اس کا اطلاق بحیثیت مجموعی سارے ادب پر ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص مسرّت کا خواہش مند ہوتا ہے اور زندگی کے معاملات و مسائل کو سلجھانے میں بصیرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ادب کے مطالعے کا جواز بھی یہی ہے کہ اچھا ادب ہمیں مسرّت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ادب کا تعلق انسانی زندگی سے نہیں ہے اور یہ انسان کو بہتر بنانے میں بھی معاون نہیں ہوتا بلکہ ادب تو محض دماغی ورزش کا نام ہے۔ اگر اس قول کی صحت پر تھوڑی دیر کے لیے ہم یقین کر لیں تو بھی زندگی سے ادب کا ایک تعلق بہر حال قائم رہتا ہے کیوں کہ ذہنی مشق و ممارست سے بہر کیف اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ زندگی کے پیچ در پیچ معاملات کو سلجھاتے رہنے کی ہمارے ذہن کو عادت پڑ جاتی ہے اور ہماری عقل بہت سی مشکل گتھیوں اور گرہوں کو اپنے ناخنِ تدبیر سے کھول دیتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ادب انسان کو اچھا بنانے میں

معاون ہوتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال دراصل ہمیں اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ یقیناً بہت سے ادب کے شائقین اور ادبی تخلیق کار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا شمار اچھے لوگوں میں نہیں ہوسکتا لیکن اس میں قصور ادب کا نہیں بلکہ خود ہمارا ہے۔ (ع میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا)۔ ادب دراصل اپنے خالق اور قاری دونوں سے سچی وابستگی اور Commitment کا مطالبہ کرتا ہے۔ رشید صاحب زندگی بھر اس بات پر مُصر رہے کہ کوئی نامعقول شخص اچھا ادیب نہیں بن سکتا۔ اس قول کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب سے شغف رکھنے والا شخص خواہ ادیب ہو یا قاری، اوروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ معقول آدمی ہوگا اور آدمیت کا مسئلہ آج ساری دنیا کو شدت سے درپیش ہے اس لیے ادب کا مطالعہ بیش از بیش ضروری ہے۔

●

ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی

جن چیزوں سے ہم بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اکثر وہی ہمارے گلے پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ہم جو بھی کرتے ہیں مجبوری میں کرتے ہیں۔ ادب ہمیں گھٹی میں پلایا گیا تھا۔ مگر دنیا نے ہمیشہ غیر ادبی کام ہمارے سپرد کیے، اور شاید اسی لیے ہم ذوق وشوق سے کوئی کام نہیں کر پائے۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد سوچا تھا کہ اب کوئی ایسا کام کریں گے جس میں پڑھنا لکھنا نہ پڑے مگر دوستوں کی چارہ سازی ایسی کہ پھر گھیر گھار کر وہیں لا کھڑا کیا جہاں سے بھاگے تھے۔ اب سارے کام مجبوراً کرنے پڑتے ہیں، ایسے ایسے کام کہ جن کو کرنے کے بعد مسرت تو کجا افسوس بھی نہیں ہوتا۔ شاعری چوں کہ میرا شوق ہے اس لیے احتیاط سے کرتا ہوں اور کم کرتا ہوں۔ لیکن مجبوری کے کام خوب خوب کرتا ہوں۔ اب یہی دیکھئے کہ مجھے نثر لکھنا نہیں آتا —— مگر لکھ رہا ہوں —— کیوں اور کس لیے —— نہیں معلوم؟ شاید نظم کے بجائے نثر میں ہی رسوا ہونے کی عجلت ہے۔ یا صدر شعبہ کے حکم کی تعمیل۔ بہر حال Professional مجبوریوں نے ہمیں بے بس کر دیا ہے۔

ادب کے ایک استاد کو یہ اقرار کر لینے میں کوئی جھجھک نہیں ہونی چاہیے کہ وہ ادب کا مطالعہ Class room teaching کے لیے کرتا ہے۔ بالکل ایک وکیل کی طرح۔ عدالت جانے سے پہلے جیسے وہ مقدمہ کی تیاری کرتا ہے۔ ادب کے استاد کی

مصنف کا عنوانِ: میں خالی ہوں مجھ کو کوئی کام دے "

ادب سے نسبت شاید اس لیے ہے کہ وہ وکیل نہیں ہے۔ ہندی کے مشہور مزاح نگار ہری شنکر پرسائی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”پروفیسر ہونے کے باوجود ہمارے دل میں تھانے دار بننے کی خواہش ہے۔“ اب جب کہ ادب کا سارا کاروبار یونیورسیٹیوں تک محدود ہو گیا ہے اور ہمارے مسلم الثبوت پروفیسر ادیب تھانے داری کی طرف بہ حسرت و یاس دیکھ رہے ہوں تو مجھ جیسے ادب کے ادنیٰ طالب علم کے لیے اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ روئے سخن کسی کی طرف نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے پروفیسر ادیب کلاس روم کی تیاری کے لیے جو پڑھتے ہیں، اسے اپنے مطالعہ میں شمار کرتے ہیں اور اس کے نوٹس کو نہ صرف یہ کہ اپنا کام سمجھتے ہیں بلکہ نہایت دیدہ دلیری سے رسائل میں شائع بھی کرا دیتے ہیں کہ یہی ان کا Published Work ہوتا ہے۔

ہمارا حال بھی اس سے کچھ جدا نہیں، کہ ہم بھی ایک Ambitious مدرس ہیں۔ ہمارے رَت جگے گواہ ہیں کہ اس کام کو کرنے کے لیے ہم نے کیسی کیسی راتیں سیاہ کر دی ہیں اور کتنا خونِ جگر جلایا ہے۔ مدرس کے فیض سے اب ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو سیمناروں اور اکیڈمیوں کی برکت سے تنقید نگاروں کا بہت پہلے ہو چکا ہے۔

ہمارے یہاں مطالعے کو ریاضی کی مشق سمجھا جاتا ہے۔ اس کام میں ذوق نام کی شے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ البتہ افادیت کے پہلو کو ضرور ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سو بچپن سے ہی روزانہ ایک صفحہ یا ایک خط لکھنے اور پڑھنے کی مشق کرتے وقت اس کے افادی پہلو ہم پر روشن ہونے لگتے ہیں۔ اسی افادیت کے پیشِ نظر ہمارے یہاں چند قصے بھی اُردو غزل کی تلمیحات کی طرح مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ جوش صاحب بلا ناغہ ہر شام شراب نوشی کے ساتھ چند شعر ضرور کہتے تھے۔ یا یہ کہ شیخ علی حزیں کی زندگی میں صرف دو راتوں کے علاوہ کوئی شب ایسی نہیں گزری جو مطالعے کے بغیر بسر ہوئی ہو۔ یہ باتیں سُننے میں بہت بھلی لگتی ہیں۔ Apeal بھی کرتی ہیں۔ یہ لوگ تو خیر بڑے لوگ تھے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ یہ عمل اس قدر Mechanical بھی ہو سکتا ہے کہ جب چاہا Switch on کیا اور ادب کا کام شروع ہو گیا۔ ادب کا کام کوئی بنیے بقال کا کام نہیں کہ ہر صبح پابندی

وقت کے ساتھ دوکان سجانا چاہیے کہ ان کے نزدیک ادب ایک ایسی Industry ہے جس کا استعمال کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ایسے ادب پیشہ اور Glamour کی دنیا میں رہنے والے لوگوں کے پاس ادب کے مطالعہ کا جواز اور اس سوال کا جواب بھی موجود رہتا ہے کہ آخر ادب کا مطالعہ ان پر کیوں واجب ہوا۔ لیکن میرے پاس ادب کے مطالعہ کا نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ اس سوال کا جواب کہ میں ادب کیوں پڑھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اپنے بارے میں بہت کم جانتا ہوں اور اگر لکھوں گا تو شاید صداقت پر مبنی نہ ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مجھ جیسا بیکار آدمی چوں کہ کوئی دوسرا کام کر بھی نہیں سکتا تھا اس لیے ادب پڑھتا ہے یا یوں سمجھیے کہ اس میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے اندر ادب کا ذوق پیدا کر کے مجھ جیسے ایک بے کار آدمی کو کام فراہم کر دیا ہے۔ بس اسی لیے ادب پڑھتا ہوں ــــــ شعر لکھتا ہوں۔

اس سچ کو ظاہر کرنے کے لیے برسوں پہلے میں نے ایک شعر کہا تھا، آپ بھی سُن لیجیے۔

سچ ہے کہ مجھے کوئی ہُنر ہی نہیں آتا　　　جز مشق سخن کار دگر ہی نہیں آتا

اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میری زندگی سے ادب نکل جائے تو شاید میرا وجود ہی باقی نہ رہے۔ تمام دوستیاں اور دشمنیاں ادب کے وسیلے سے ہی تو ہیں، رنج و راحت، رشتے ناطے، گھر آنگن، دین و دنیا اور خود اپنے آپ کو، ادب میں ہی تلاش کرتا ہوں۔ میرے پاس کوئی دوسری جائے پناہ بھی تو نہیں۔

اس بے کاری اور بے ہنری کے عالم میں، اس عطائے خداوندی کے سہارے من پسند ادب کا نہات بے ترتیبی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں، کیوں کہ نماز شوق اسی طرح ادا کی جاتی ہے۔ ہر طرح کی تحریر اور ہر طرح کا ادب پڑھتا ہوں، جو آسانی سے سمجھ میں آجائے اور دل کو لبھائے۔ تھیوریز اور نظریات سے گریز کرتا ہوں کہ ''نماز ایک کی ہے کفر دوسرے کے لیے''۔ پھر اس میں جھگڑے زیادہ ہیں،

ادب کم، سو خالص ادب پڑھتا ہوں کہ اس میں کوئی لاگ لپٹ نہیں ہوتی۔ براہ راست ہمارے دکھ درد اس کے ہم رکاب ہو جاتے ہیں۔ اکثر فتنہ و فساد، محاذ آرائی، معرکوں ہجووں، اور نفسیات پر مبنی ادب نہایت دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ صرف اتنا ہی نہیں اس قسم کے ادب کو باجماعت پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ لطف اور عبرت خوب حاصل کر سکوں۔

ادب کے مطالعے میں میری کچھ ترجیحات بھی ہیں۔ سارے کا سارا ادب نہیں پڑھتا۔ کچھ رد بھی کر دیتا ہوں مثلاً غزل پڑھتا ہوں، رباعی اور قطعات بالکل نہیں پڑھتا۔ غزل اس لیے پڑھتا ہوں کہ اپنی روایت اور تہذیب سے وابستہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے استعاروں کے ذریعہ اپنے ماضی اور اس کے وسیلے سے اپنے آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ رباعی اور قطعے اس لیے نہیں پڑھتا کہ یہ مفید ادب ہے، اس میں ادب کم اور پتے کی باتیں زیادہ ہوتی ہے۔ داستانیں، منظوم داستانیں، کہانیاں اور ناول کثرت کے ساتھ پڑھتا ہوں کہ ان میں ہماری زندگی کے قصے حکایتیں، محاورے اور ہماری وہ لفظیات مل جاتی ہے جس سے ہمیں اپنا وجود بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے گم شدہ قریے، دیہات، قصبے اور شہر کہیں نہ کہیں اب بھی ہمارے اندر موجود ہیں۔ اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے دکھوں، غموں اور خوابوں کی تعبیروں سے چشم پوشی کرنے اور خود سے فرار حاصل کرنے کے لیے بھی ادب میں پناہ لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ پوسٹ ماڈرن زمانہ ہے۔ قیامت کا عہد ہے یہ۔ نہ ادب اپنے مقام پر ہے، نہ ادیب اور ادب کا پڑھنے والا مایوس۔ ہر چیز الٹ پلٹ ہو گئی ہے۔ جو گھاس کوڑا جمع ہو رہا ہے سب ادب ہے۔ بہت پہلے انتظار حسین نے لکھا تھا کہ "جب تہذیب کی سطح نیچے آتی ہے تو سب لوگ بے مقام ہو جاتے ہیں۔ پھر کسی کو اپنے مقام کا احساس نہیں ہوتا، اپنے مقام سے اکھڑ کر لوگ بھیڑ بن جاتے ہیں۔" پتہ نہیں انتظار حسین نے یہ بات کس پس منظر میں کہی تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب ادب کے مہذب

کاروبار میں تربیت یافتہ اور مہذب خواص کے بجائے غیر تربیت یافتہ عوام کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے، تو تہذیب اپنی سطح سے نیچے آ جاتی ہے۔ ادب جمہور کے لیے نہیں ہوتا اور نہ ادب میں جمہوریت کا کوئی مقام ہے۔ میر نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ میرے شعر خواص پسند ہیں۔ میر نے تو اپنے قاری کی نشان دہی کر دی تھی، سوان کا کام آسان ہو گیا تھا۔ مگر ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ ہمارے عہد کے ادب کا فیصلہ بازار کے ہاتھ میں ہے۔ اب ادب کا مطالعہ قدر و قیمت کے اعتبار سے نہیں بازار بھاؤ سے کیا جاتا ہے۔ بازار نے ہماری آنکھیں خیرہ کر دی ہیں۔ سو اب ہم قرۃ العین حیدر کے بجائے ارن دھتی رائے اور انیتا دیسائی کو پڑھتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم مفید کام کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ جو اکادمیاں اور سمینار ادب کے بازار کا بھاؤ طے کرتے ہیں، وہی ہمیں لکھنے پڑھنے کا کام بھی فراہم کرتے ہیں۔

یہاں تک تو گوارہ تھا۔ اب Electronic Media نے ایسا وپھوٹ کیا ہے کہ تہذیب کی سطح مزید نیچے گر گئی ہے۔ چند برس پہلے Journalistic تحریریں لکھنے والوں نے افواہ اڑائی تھی یہ نثر کا زمانہ ہے۔ اب Electronic Media کہتی ہے کہ پیپسی کولا کے اشتہار کا عہد ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس عہد میں ہمارے پاس پڑھنے کے لیے کیا ہے۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ اخبار اور اشتہار پڑھیں۔ مگر کیا کیا جائے۔ لوگوں نے اس عہد میں بھی پڑھنے کا کام نکال لیا ہے۔ تھیوری پڑھتے ہیں، اور اسے ادب سمجھتے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ تھیوریز پرانی ہو جائیں اور ہمارا عہد المیہ بن کر ہماری روح کا حصہ بن جائے۔ مشاعروں، سمیناروں اور اکادمیوں کی دھند چھٹ جائے۔ جذبات کا وفور اور اس کا استحصال کم ہو جائے اور ادب کے سارے پروگرام ٹھپ پڑ جائیں تو شاید ہم اپنے آپے میں آ جائیں۔

شاید میں اپنے مرکز سے ہٹ گیا ہوں اس لیے کہ کوئی چیز اپنے مرکز پر نہیں ہے پھر کوئی اپنے بارے میں بتا بھی کیا سکتا ہے۔ میری حالت تو اس نطلے اور آوارہ شخص

کی طرح ہے جو اِدھر اُدھر تا کتا جھانکتا پھرتا ہے۔ مگر مجھ میں تو اتنی بھی جرأت نہیں۔ کھیل کود کی جبلّت تو بچپن میں ہی دبا دی گئی تھی، سو اس محرومی کو پر کرنے کے لیے ادب کی کتابوں میں کودتا پھرتا ہوں، تا کتا جھانکتا رہتا ہوں کہ شاید یہیں سے کوئی مسیح نفس، کوئی چہرہ طلوع ہو اور مجھے نہال کر دے۔ میرے ساتھ اگر میری محرومیاں نہ ہوتیں تو ممکن ہے کوئی دوسرا کام کر رہا ہوتا۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی کام تو سب کو چاہیے۔

نہیں دشت و صحرا در و بام دے
میں خالی ہوں، مجھ کو کوئی کام دے

●

کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ یہ ننگ اسلاف صوبۂ بہار کی مشہور خانقاہ، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ کے غلاموں میں شامل ہے گو بیعت کا شرف کبھی حاصل نہ ہو سکا۔

اس حقیر نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو اس کے چاروں طرف شعروادب اور علم و عرفان کا چرچا تھا۔ والد صاحب گورنمنٹ طبّی کالج پٹنہ کے اُن پروفیسروں میں تھے جن کے شاگردوں نے بہار اور یوپی کے مختلف اضلاع میں اپنی خدمات کا دائرہ پھیلا رکھا تھا۔ خانوادۂ مجیبی کے پیرزادے اکثر اکتساب فیض کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ شعرا و ادبا کی محفلیں الگ تھیں۔ 'ماسوا' کے شاعر ظہیر صدیقی ہم لوگوں کے گھر کے سامنے ہی رہتے تھے۔ شمیم فاروقی آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں شاید پروگرام اکزیکیوٹو تھے۔ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا تھا۔ والد صاحب کی کتابیں ''تسہیل الدراری'' اور ''تاریخ اطبائے بہار'' کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی۔ دوسری جلد زیر طبع تھی۔ ''مولانا رسول نما بنارسی اور اُن کے معاصر علما'' اور ''امور طبعیہ'' کی تصنیف کا کام جاری تھا۔ گھر میں ماہ نامہ جامعہ دہلی، معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، شاعر بمبئی، اشرفیہ مبارک پور، زبان وادب پٹنہ اور المجیب پھلواری شریف، جیسے رسائل آتے رہتے تھے۔ تاریخ، تفسیر، فقہ، حدیث، فلسفہ، تنقید اور دوسرے علوم وفنون کی کتابیں والد صاحب کے شلف میں

بھری پڑی تھیں۔ اب اتنے دنوں بعد ان سب کے نام تو یاد نہیں بس شعر العجم، مقدمۂ تاریخ ابن خلدون، سیرت پیر مجیب، دیوان غالب، اسرار خودی، رموز بے خودی، تفسیر کشاف اور تفسیر ابن کثیر اور کلیات فرد یاد رہ گئی ہیں۔ ہر شام پٹنے کی مشہور کتابوں کی دُکان اور اہل علم و ادب کے مراکز کتاب منزل اور بک امپوریم پر والد صاحب کے ساتھ جانے کا موقع ملتا۔ ان دکانوں سے ملحق رحمانیہ ہوٹل میں شعرا و ادبا کی محفلیں جمتیں اور میں حیرت و استعجاب سے ان بزرگوں کے منھ تکا کرتا۔ اُسی زمانے میں کلیم عاجز کا شعری مجموعہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' شائع ہوا تھا۔ ان کے شعر پڑھنے بلکہ گنگنانے کے انداز اور ان کے اس شعر کا بہت شہرہ تھا:

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ تو معاملہ ہی عجب ہوا
میں غزل سُناؤں ہوں اس لیے کہ زمانہ مجھ کو بھلا نہ دے

غلام سرور صاحب روزنامہ سنگم میں اپنے مشہور کالم لکھ رہے تھے، عظیم آباد ایکسپریس نکل رہا تھا۔ رضوان احمد کی صحافت زوروں پر تھی۔ یہ دونوں اخبارات ہمارے محلّے سے ہی نکلتے تھے۔ عابد رضا بیدار خدا بخش خاں لائبریری کے ڈائرکٹر تھے۔ وہاں جانے کی ہمت تو نہ ہوتی تھی، لیکن جمعہ کے دن نماز کے لیے ملنے والے پاس کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر گورنمنٹ اُردو لائبریری پٹنہ کے چکر لگا لیا کرتا۔ وہاں رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ فکشن کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، جن کو کبھی کبھی الٹ پلٹ لیا کرتا۔ بیتاب صدیقی جنھیں میں پیار سے بیتاب چچا کہا کرتا تھا انجمن ترقی اُردو بہار کے جنرل سکریٹری اور والد صاحب کے طالب علمی کے زمانے کے دوستوں میں تھے۔ انھیں کے تعلق سے والد صاحب نے تاریخ اطبائے بہار، جلد اوّل میں یہ شعر لکھا تھا۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بہ صحرا رفت و من در کوچہ ہا رُسوا شدیم

خدا بخش لائبریری کے سیمناروں اور آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کے پروگراموں میں اکثر والد صاحب کی شرکت ہوتی۔ کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کے نام بھی اُسی زمانے میں

کان میں پڑے۔ پروفیسر سیّد حسن عسکری حیات تھے لیکن ان کے دیدار کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

ہائی اسکول میں پہنچا تو شامل نصاب کتاب ''پانچ صحیفے'' میں ''داراشکوہ'' کا ایک طویل اقتباس پڑھنے کا موقع ملا جس کا یہ ڈائیلاگ اُسی زمانے کا یاد کیا ہوا آج تک ذہن میں نقش ہے۔

''مابدولت نے دشمنوں کی تعداد کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں جانا۔ بائیس ہزار شاہانہ فوج کی قاہرانہ آمد کا غلغلہ سن کر پچاس ہزار باغی فوجی میدان جنگ سے اس طرح نیست و نابود ہو جائیں گے جس طرح آندھی خس و خاشاک کو اُڑا دیتی ہے۔''

بچپن سے پٹنے کے بارے میں داغؔ دہلوی کا یہ شعر سُنتا رہا۔

عظیم آباد میں ہم منتظرِ ساون کے بیٹھے ہیں
ذرا چھینٹے پڑیں تو داغؔ کلکتے چلے جائیں

جوشؔ اور مجازؔ کی پٹنہ آمد کی کہانیاں اور پھر جمیل مظہری کے اس شعر سے یادوں کے چراغ روشن ہیں۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اور بشیر چچا یعنی شاداں فاروقی مصنف بزم شمال کا یہ شعر بھی اُسی زمانہ سے یادوں میں محفوظ ہے۔

بڑی تھی کروفر لیکن مآل زندگی یہ ہے
چلا جاتا ہے لاشہ دوش پر آہستہ آہستہ

اس پس منظر کے ذکر کے بعد شاید یہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ میں ادب کیوں پڑھتا ہوں؟ اس پس منظر کے کسی شخص کے لیے یہ کوئی شعوری فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ سو میں نے بھی شعوری طور پر ادب پڑھنا شروع نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے

کب، کہاں، کیسے اور کیوں ادب پڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک غیر شعوری عمل تھا جو میرے ماحول کے زیرِ اثر مجھ سے سرزد ہوا اور ہوتا گیا۔

علی گڑھ پہنچا اور پہلے ہی سال تیس سال پہلے کے جواں سال ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی اور ڈاکٹر خورشید احمد سے اُردو شعر و ادب کا درس لینے کا موقع ملا۔ پھر پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شہریار اور پروفیسر قاضی عبدالستار کی جوتیاں سیدھی کرتے کرتے تھوڑا بہت قلم پکڑنا سیکھ گیا۔ سو اپنے پس منظر اور ان بزرگوں کے فیضان نظر سے اچھا بُرا جو کچھ بن سکا آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔

۱۲ر اگست ۱۹۸۳ء کی تاریخ تھی جب اس بزم وفا میں داخلہ لینے کی تیاری کرتے ہوئے میں نے والد صاحب سے پوچھا تھا کہ اسی سال ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ کس بھروسے پر مجھے علی گڑھ بھیج رہے ہیں۔ اُن کا جواب تھا ''میں کب بھیج رہا ہوں؟ جو بھیج رہا ہے وہی انتظام بھی کرے گا۔ تم جاؤ اور اس کی فکر نہ کرو۔'' چنانچہ دنیا نے دیکھا اور میں نے تجربہ کیا کہ واقعی کارساز ما بہ فکر کار ما۔ پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر اصغر عباس اور پروفیسر کبیر احمد جائسی میرے لیے فرشتۂ رحمت بن گئے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے فارسی کے ایک شاعر نسبتی تھانیسری کے دیوان کی تدوین کی ذمہ داری نواب رحمت اللہ خاں صاحب شروانی کے سپرد کی تو اس فقیر کو ان کا معاون بنا دیا۔ تین نسخوں کی مدد سے تدوین کا یہ کام کیا جانا تھا۔ وہ کام تو تکمیل نہ ہو سکا لیکن اس بہانے مجھے نواب صاحب کے شعری و ادبی ذوق اور ان کے بیش بہا علمی و ادبی سرمایہ سے استفادے کا موقع ضرور مل گیا۔ نواب صاحب کی ہی محفلوں میں رشید صاحب کے نام اور کام اور علی گڑھ سے ان کی محبت سے واقف ہوا اور پھر ان کی ایک ایک تحریر تلاش کر کے پڑھ ڈالی۔ یوں یہ پوری دنیا مجھ پر کھلتی گئی۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب کے ذریعہ سرور صاحب کی خدمت میں حاضری، ان کی تحریریں صاف کرنے، اور ان سے اکتسابِ فیض کا بھی موقع ملا۔

یہ ایم۔اے سال اوّل کا زمانہ تھا۔ میرٹ اسکالرشپ کا ٹسٹ ہوا۔ میں نے ایک سوال کا غلط جواب دیا تھا۔ سوال تھا ''زیور کا ڈبہ کس کا افسانہ ہے''؟ میں نے جواب دیا تھا۔ ''عصمت چغتائی کا'' اسکالرشپ تو مل گئی۔ لیکن دوسرے دن جو گوش مالی ہوئی وہ اب تک یاد ہے ''آپ کو اتنی سی بات نہیں معلوم ہے کہ زیور کا ڈبہ کس کا افسانہ ہے، بس زیور، کپڑے اور عورتوں کا ذکر دیکھا اور عصمت چغتائی لکھ دیا۔ آپ بھی یہ کریں گے تو دوسرے کیا کریں گے۔'' یہ تھے استاد محترم پروفیسر شہریار۔ اس ایک غلطی نے مستقبل میں میرے مطالعے کی راہ ہموار کردی۔ ان کی نگرانی میں علی گڑھ میگزین مرتّب کرنے کا موقع ملا تو یہ سفر تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار، عظیم بیگ چغتائی، حکیم احمد شجاع، مجنوں گورکھپوری، رشید جہاں، اختر انصاری، احمد علی، منٹو، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، ابراہیم جلیس، تسنیم سلیم چھتاری، قرۃ العین حیدر، سلمیٰ صدیقی، قاضی عبدالستار، محمد عمر میمن، صلاح الدین پرویز، غضنفر علی، طارق چھتاری، غیاث الرحمٰن، پیغام آفاقی، سیّد محمد اشرف، ابن کنول، اور دوسرے بہت سے اچھے بُرے فن کاروں کی اچھی بُری تخلیقات پڑھنے کا موقع ملا اور اندازہ ہوا کہ ایک اچھا استاد اپنے شاگردوں کی تربیت کیسے کرتا ہے۔ شہریار صاحب نے یہ کام میرے سپرد نہ کیا ہوتا تو اتنے سارے فن کاروں کو اس انہماک سے کبھی نہ پڑھ پاتا۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کے ساتھ ریسرچ میں داخلہ لیا تو جو حال ہوا اس کا ذکر اپنے ایک حالیہ مضمون ''کروں گا ذکر تو خوشبو زباں سے آئے گی'' میں کر چکا ہوں۔ اس کا یہ اقتباس سن لیجیے:

''لگ بھگ ہر روز ہم چاروں (سیّد ظفر امام، محمد خالد سیف اللہ، رخسانہ عابدی اور یہ فقیر) استاد کے کمرے میں جمع ہوتے۔ استاد کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ رہے ہوتے۔ ہم لوگوں کے آتے ہی اس کا ذکر چھیڑ دیتے۔ ''میاں اب تک آپ نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ پڑھ لیجیے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔'' اور ہم لوگ چودہ طبق

روشن کرنے کے لیے بھاگم بھاگ لائبریری یا کتاب کی دوکانوں کا رُخ کرتے۔ رات رات بھر جاگ کر اور کھانا پینا چھوڑ کر کسی طرح اپنے چودہ طبق روشن کرتے اور خوش خوش استاد کی خدمت میں سرخرو ہونے کے لیے حاضر ہوتے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنے کارنامے کا ذکر کریں کسی دوسری کتاب یا مضمون کا ذکر ہو جاتا اور پھر وہی جملہ ''میاں پڑھ لیجیے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔'' پھر ہم بھاگتے ہوئے لائبریری یا کتاب کی دوکان کی طرف جاتے۔ رات رات بھر جاگ کر پڑھتے۔ لیکن پھر وہی ہوتا۔ ہر روز نئے سے نئے جلوے اور نئی سے نئی برق تجلی سے دوچار ہوتے رہتے۔ کہیں پر رک کر سوچنے کا مسئلہ ہی نہ تھا۔ سفر مدام سفر کی کیفیت تھی۔ اکثر فرماتے:

''میاں پانچ کتابیں پڑھ کر حفظ کر لینے سے بہتر ہے کہ پانچ ہزار کتابیں پڑھ کر بھول جایئے۔''

سو استاد کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے آج یہ بھی یاد نہیں کہ اُس دورِ جنوں میں ہم نے کون کون سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ شاعرِ بے مثال و فرشتہ خصال، بے نیازِ مال و منال، حضرت فرحت احساس صاحب قبلہ شہزادۂ بے نظیر کی طرح عاشق ایک پری تمثال کے ہوئے اور اُس کے جلوؤں کے رنگ سے روزنامہ قومی آواز دہلی کے سنڈے میگزین کے صفحات کو خوش جمال بنانے لگے تو ایک روز استاد کی گفتگو کا رُخ بدلا:

''میاں یہ جو آپ لوگ ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں اس In put کا کچھ Out put بھی تو ہونا چاہیے۔''

یوں روزنامہ قومی آواز، دہلی کے ہفتہ وار ضمیمہ میں چھپنے والی ان تحریروں کی ابتدا ہوئی جنھوں نے اس فقیر کو رسوا سر بازارے کے زمرے میں داخل کر دیا۔'' لگ بھگ ہر ہفتے کسی نہ کسی کتاب کو پڑھنا اور اس پر تبصرہ لکھنا ہوتا۔ اچھا بُرا جو کچھ لکھا پڑھنے والوں نے کبھی پسند کبھی ناپسند کیا۔ لیکن حاصلِ کلام صرف یہ ہے کہ اس ذریعے سے بھی بہت سی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔

دوستوں اور بزرگوں کو شکایت ہے کہ اب اس فقیر کے قلم کی وہ کاٹ باقی نہیں، لکھنے کی وہ رفتار جاتی رہی اور پڑھنے کا معاملہ اور بھی سست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام شکایتوں میں سے کوئی شکایت بے جا بھی نہیں ہے۔ بات بس اتنی ہے کہ اب لباس کی درز سے جھانکتا ہوا نسوانی جسم کا کوئی حصہ برانگیختہ نہیں کرتا، اشتعال نہیں دلاتا، آنکھوں کو جھکا دیتا ہے۔ یہی حال کتابوں کا ہے۔ نئی آنے والی کتابیں اب مجھے مشتعل نہیں کر رہی ہیں۔ پتہ نہیں اس میں میری کسی خامی کا دخل ہے یا اُن کی۔ سچ کہتا ہوں ——مدت ہوئی اچھی کوئی صورت نہیں دیکھی، کوئی اچھی کتاب نہیں پڑھی۔ بڑی مشکل سے ایک کتاب ملی ہے۔ کیا نام ہے اس کا——؟ ارے وہی شعر شور انگیز والے مصنف——ہاں ہاں—— شمس الرحمٰن فاروقی کی۔ آٹھ ساڑھے آٹھ سو صفحے کی —— کئی چاند تھے سرِ آسماں—— پتہ نہیں کیسے اس نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار کرلیا۔ پتہ ہی نہیں چلا آٹھ ساڑھے آٹھ سو صفحے کی کتاب کب اور کیسے ختم ہوگئی۔ اب دوسری بار پڑھ رہا ہوں تا کہ اس میں مستعمل نامانوس الفاظ کی فہرست بنا سکوں۔ یہ جی چاہتا ہے کہ ؎

بس وہ آجائے جسے دیکھ کے پاگل ہوجائیں۔
ہم جو بامعنی بنے پھرتے ہیں مہمل ہوجائیں——

اب آپ ہی بتایئے ایسا کوئی بار بار کب آتا ہے؟

خواتین وحضرات!

میں ایسا ادیب، ایسا عالم نہیں بننا چاہتا جو اپنے آپ کو خلاصۂ کائنات سمجھتا ہو، جس کا عُجب اُسے اپنی ناک سے آگے دیکھنے نہیں دیتا ہو، جس کی چشمِ تنگ کثرتِ نظارہ سے وانہ ہوگئی ہو۔ میں کسی مجبوری یا ضرورت سے کیے گئے مطالعے کو مطالعۂ ادب کے مرتبے کے منافی سمجھتا ہوں۔ کتابیں دنیا کی حسین سے حسین دوشیزہ سے زیادہ میری خوب صورت دوست ہیں اور دوستی اور خوش گپی، اور بلیک کافی میرے پسندیدہ اشواق——!

میری حقیر رائے میں اگر آپ کے مزاج میں خشونت اور یبوست نہیں ہے تو آپ کو دوستوں کا کبھی کال نہیں پڑے گا۔ بہ قول میر۔

ثمرۂ ناسازی طبع خشن تنہائی است

سو مجھے بھی دوستوں کا کال نہیں ہے۔ ان سب کے باوجود میری زندگی میں سے کوئی تحریر کچھ لمحے چُرالینا چاہتی ہے تو اُسے چوری کا ہنر جاننا ہوگا۔ کتاب اگر ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے تو میں اس کے سو صفحے بڑی مشکل سے حاتم کی قبر پر لات مار کر پڑھ لوں گا۔ بقیہ نو سو صفحے اگر اُس کتاب میں بوتہ ہے تو مجھ سے پڑھوالے۔ نہیں تو مجھے اسے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ جتنی کتابیں میں اب تک پڑھ سکا ہوں؛ خواہ وہ علی پور کا ایلی ہو یا الکھ نگری، شہاب نامہ ہو یا مفتیانے، لبیک ہو یا کاغذی پیرہن، گردش رنگ چمن ہو یا آخر شب کے ہم سفر، گیان سنگھ شاطر ہو یا طاؤس چمن کی مینا، ایڈیٹ ہو یا آننا کارینینا، فوائد الفواد ہو یا مثنوی مولانا روم مجھے حکیم طبیب صاحب نے کسی نسخہ میں نہیں لکھا کہ ان کو پڑھے بغیر آپ کا نزلہ درست نہیں ہوگا۔

آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ مجھے نزلہ اکثر انہی ''نازنینان حرم'' کے دو ڈھائی بجے رات کے بعد کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ اور دن کے مطالعے سے وہ سرشاری پیدا نہیں ہوتی جو ان کتابوں کے مطالعے کا حاصل ہے۔ میرے اکثر احباب کسی خاص کتاب کے تعلق سے مجھ سے سوال کرتے ہیں اور میں جواب میں مجاز کا ایک لطیفہ سنانے پر مجبور ہو جاتا ہوں:

ایک صاحب نے مجاز سے پوچھا: مجاز صاحب آپ کا سر بہت چھوٹا ہے اس کی کوئی وجہ؟ مجاز نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: جی ہاں! اس میں کوڑے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

مجھے اپنی اس کمزوری کا علم ہے۔ اس کمزوری کی وجہ سے میں بہت سی ایسی کتابیں نہیں پڑھ سکا، یا پڑھنا شروع کرنے کے باوجود درمیان میں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا جن کو پڑھ بہت سے احباب عالم و فاضل بن گئے۔

خواتین حضرات!

گاؤں گھر میں مشہور ہے کہ جب کسی گھر میں برتن بجنے لگیں تو سمجھ جاؤ کہ اس گھر میں لڑکی جوان ہو رہی ہے۔

یہی معاملہ ادبی تخلیق کا بھی ہے۔ اچھی تحریر مشتعل کرتی ہے، روک لیتی ہے، پڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ وہ ''بُری عورت کی کتھا'' نہیں ہوتی، وہ ''فرات'' نہیں ہوتی، وہ ''بیان'' نہیں ہوتی، وہ ''تجا'' نہیں ہوتی، وہ ''گئو دھول'' نہیں ہوتی، وہ ''گھومتی ندی'' نہیں ہوتی، وہ ''پاپ بیتی'' نہیں ہوتی وہ ''ہدایت نامہ شاعر'' ہوتی ہے، وہ ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' ہوتی ہے، وہ پیغمبرانِ سخن ہوتی ہے، وہ ''ستارہ یا بادبان'' ہوتی ہے، وہ ''انسان اور آدمی'' ہوتی ہے، وہ '' آشفتہ بیانی میری'' ہوتی ہے، گنجہائے گرانمایہ ہوتی ہے، شب گزیدہ ہوتی ہے، ''پیتل کا گھنٹہ'' ہوتی ہے، ''مکان'' ہوتی ہے، ''اس آباد خرابے میں'' ہوتی ہے، زر گزشت ہوتی ہے، آب گم ہوتی ہے، ''تصویریں اُجالوں کی'' اور ''مت سہل ہمیں جانو'' ہوتی ہے، تذکرہ ہوتی ہے، بستی ہوتی ہے، زہرا ہوتی ہے، راکنگ چیرا ہوتی ہے، وہ ایک لڑکا ہوتی ہے، وہ فائر ایریا ہوتی ہے، وہ مادام بواری ہوتی ہے، آنگن ہوتی ہے، زمین ہوتی ہے، دیواروں کے بیچ ہوتی ہے۔

اب تک آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں مطالعے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں:

۱۔ وہ جو عادتاً کیے جاتے ہیں۔

۲۔ وہ جو ضرورتاً کیے جاتے ہیں۔

۳۔ وہ جو عشقیہ سرشاری کی کیفیت میں کیے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے آج ہم یہاں جس مطالعے پر گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں وہ مطالعے کی یہی تیسری قسم ہے جو چھپ کر، دوسروں کی نظریں بچا کر، کھانا پینا چھوڑ کر، ضرورتوں اور حاجتوں کو پس پشت ڈال کر کیا جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پہلی اور دوسری قسم کے ساتھ ساتھ ان نازنینانِ حرم کے ساتھ میرا مدتوں یہ تیسری قسم کا رشتہ بھی رہا ہے۔ کبھی یونیورسٹی کینٹین کی کسی دور افتادہ سیٹ پر، کبھی نقوی پارک کے کسی گوشے میں، کبھی

۲۷ ریمیرس ہوسٹل کے جھلنگے کھاٹ پر، کبھی گیمس کمیٹی کی اوپر جانے والی سیڑھی پر، کبھی رات گئے سمینار لائبریری اور ریسرچ ڈویژن میں ان نازنینانِ حرم سے میرے راز و نیاز کے تعلقات رہے ہیں۔ اکثر تین تین چار چار بجے رات کو ہم آوارگان عشق مجاز کی نظم 'آوارہ' پڑھتے ہوئے یونیورسٹی کی سڑکوں پر اُس نامراد نوجوان کی تصویر پیش کرتے رہے ہیں جو اس نظم کا ہیرو ہے۔

آپ پوچھتے ہیں کہ انھوں نے مجھے کیا دیا تو عرض کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے آندھی کی زد میں شمعِ تمنا جلانے کا حوصلہ دیا، ہاتھوں کو تکیہ بنا کر بے نیازی اور بے فکری سے سو جانے اور کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرنے کا حوصلہ دیا، کم ظرفوں کے مقابلہ میں باظرف ہونے کا حوصلہ دیا، انھوں نے مجھے یہ سکھایا کہ ؂

زمیں شدیم چہ شد آسماں شدیم چہ شد
بہ چشم خلق سبک یا گراں شدیم چہ شد

انھوں نے مجھے یہ سکھایا ؂

مرد گرد ہر در کہ نانت دہند۔ در کعبہ زن تا امانت دہند

ان نازنینانِ حرم کی ناز پروری نے مجھے اس دنیا کی دنایت سے محفوظ رکھا، وہ تبسم عطا کیا جو کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ انھوں نے مجھے زیادہ پختہ، زیادہ Mature، زیادہ باشعور بنایا، مجھے کشادگی قلب ونظر عطا کی، میرے جذبات واحساسات کو زبان دی، اس دو دو چار کی دنیا سے مختلف انداز میں جینا سکھایا کہ بہ قول مہتاب حیدر نقوی ؂

نادان اگر ہم ہیں تو نادان رہیں گے

مجرد علم میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میرے بزرگوں نے ہمیشہ علم نافع اور عمل صالح کی دعا مانگی ہے۔ سو میں بھی اپنے رب سے علم نافع اور عمل صالح کی دعا مانگتا ہوں اور خیر کا طلب گار ہوں ورنہ بہ قول فرحت احساس ؂

اس شہر میں کس شخص کو جینے کی دعا دوں
جینا بھی تو سب کے لیے اچھا نہیں ہوتا

●

ڈاکٹر خالد حیدر

تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات وغیرہ شعبۂ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ مذکورہ مضمون کیوں پڑھتا ہے تو وہ شاید سوال کرنے والے کے ذہنی توازن پر شبہ کرنے لگے اور اتنا نہیں تو کم از کم وہ سائل کی طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھے کہ اس احمق کو اتنا بھی نہیں معلوم، اور از راہ ترحم یہ جواب دے کہ ''بھئی یہ تو میرا پروفیشن ہے میں یہ نہ پڑھوں تو اور کیا کروں؟'' ٹھیک اسی طرح اگر ہم ادب کو محض ایک شعبۂ علم تصور کریں جس کا تعلق زبان سے ہے تو ہمارا جواب بھی کچھ اس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے، لیکن مذاکرے کا یہ عنوان ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں'' محض ایک فرد سے منسلک سوال ہے یا یہ ایک اجتماعی سوال ہے، یقیناً یہ انفرادی نہیں ہے اور جب یہ انفرادی نہیں ہے تو اس سوال کو ہم یوں بھی پڑھ سکتے ہیں کہ لوگوں کو ادب کیوں پڑھنا چاہیے، یعنی ادب کے پڑھنے سے کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ اور اگر نہ پڑھا جائے تو اس سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں؟ اگر اس سوال کو اجتماعی سوال کے طور پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا جواب کچھ اس طرح دیا جا سکتا ہے۔

بشری علوم میں سب سے زیادہ اہمیت ادب کو حاصل ہے اس لیے کہ اس کا موضوع خود انسان ہے۔ جب کہ دوسرے علوم ان ہی حضرت انسان کے مظاہر ہیں۔ جب سیاست کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے سیاسیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے، معیشت کو سمجھنے میں معاشیات معاون ہوتا ہے، تاریخ کا علم انسان کے ماضی کے کارناموں سے

واقفیت کا سبب بنتا ہے تو انسان کی ماہیت، اس کی فطرت، اس کے جذبات کو سمجھنے کے لیے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہی ہے اگر ہم اسے جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا ہم واقعی اُس کو جاننے کے لیے ادب پڑھتے ہیں؟

چوں کہ منتظمین مذاکرہ کا حکم ہے کہ ادب کے مطالعہ کے ذاتی اسباب بیان کیے جائیں تو ذیل میں اس سوال کا جواب ذاتی سطح پر تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی، حالاں کہ بہ صورت اس تحریر میں واحد متکلم یعنی ''میں'' کو غالب کردے گی جو ہماری تہذیب میں مستحسن نہیں۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

میں ادب کیوں پڑھتا ہوں؟ اس کا جواب دینے کے لیے مختصراً یہ بھی بتانے کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میرے ادب پڑھنے کا آغاز کیوں کر ہوا۔ اس لیے کہ کوئی بھی شخص جو ادب نہیں پڑھتا وہ دوسری چیزیں چھوڑ کر اچانک یہ طے کرلے کہ اب وہ ادب پڑھے گا، ایسا عموماً نہیں ہوتا ہے۔ ادب کے مطالعہ کے لیے افتادِ طبع کے ساتھ ساتھ تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

میں نے خاندانی طور پر اُردو ماحول کے سنجیدہ بچّوں کی طرح اپنی ابتدائی طالب علمی کے دور سے ہی اُردو ادب کی ہلکی پھلکی کتابیں پڑھی تھیں جس میں مکتبۂ اسلامی کی کتابیں اور حالی، اقبال، اسماعیل میرٹھی وغیرہ کی نظمیں شامل تھیں اور یہ سلسلہ معیار تعلیم کے ساتھ بڑھتا گیا اور انٹرمیڈیٹ سائنس کے ساتھ کرنے کے باوجود اس زمانے تک مختلف ومتعدد ناول وافسانوں کی کتابیں اور مجموعے اور شمع اور بیسویں صدی جیسے رسالوں کے بہت سے افسانے پڑھ لیے تھے۔ رسالہ شاعر کی فائلیں بھی والد صاحب کے خزینے میں تھیں وہ بھی اپنی استعداد کی حد تک پڑھ لیا کرتا تھا، اسی طرح شعرو شاعری سے قرب کا موقع ملا تو سیکڑوں اشعار یاد بھی کرلیے تھے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی. اے میں تاریخ وسماجیات کے ساتھ اُردو مضمون بھی لیا اور تب سے براہ راست اُردو ادب پڑھنے کا وسیلہ ہاتھ آگیا اور میں ادب کا طالب علم بن گیا۔ اپنے ماضی کی اس مختصر داستان بیان کرنے کا مقصد محض یہ واضح کرنا ہے کہ ادب کا مطالعہ کسی مخصوص نقطۂ نظر،

کسی مخصوص نظریے، کسی مخصوص منصوبے کے تحت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ اپنی افتادِ طبع اور ذوق کی تربیت کے نتیجے میں ہی ممکن ہے۔ فرد کا بچپن، اس کا ماحول، اس کا معاشرہ اس کے مطالعے میں آنے والی تخلیقات ہی اسے ادب کی مختلف اصناف کا شعور اور ذوق بخشتی ہیں۔ شاید یہ ممکن نہ تھا کہ فکشن کے اس کثیر مطالعہ کے بعد میری دلچسپی اس سے نہ ہوتی۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا تھا کہ اگر ذہن موزوں ہوتا تو شاعری سے بھی ویسی ہی دلچسپی ہوتی جیسی کہ فکشن سے ہے۔

یہاں فلسفیانہ مباحث میں اُلجھ کر اس تحریر کو طول دینے کا موقع نہیں کہ فکشن کیوں بعض نقادوں کے نزدیک شاعری سے کم تر درجے کی صنف ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہنا ہے کہ اگر ارسطو المیہ کو تطہیرِ نفس کا ذریعہ سمجھتا ہے تو وہ المیہ کی شاعری نہیں اس کے واقعات کو ہی اس کا سبب سمجھتا ہے اور واقعات فکشن کا ناگزیر حصہ ہیں۔ اگر ہم ادب کے مطالعہ میں اس کی معنویت اور افادیت کا پہلو تلاش کرتے ہیں تو شاعری اور فکشن دونوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، حالاں کہ ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کی صورت حال کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ شمس الرحمٰن فاروقی (کی تقریر) کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''فن پارہ سے (فن کار سے نہیں) دوزانو ہو کر اس کے معنی کے تبادر کی بھیک مانگنی پڑتی ہے کبھی وہ مہربان ہو جاتا ہے تو کچھ عطا کر دیتا ہے، نہیں تو ہم سر پھوڑتے رہتے ہیں اور ہمیں کچھ نہیں ملتا۔''

ممکن ہے کہ فاروقی کی اس بات سے پورے طور پر اتفاق نہ کیا جائے، لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب کے مطالعے سے فوائد کے حصول کے لیے بھی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ برسوں ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی انسان کی شخصیت کی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ؎

خوشی ملی تو یہ عالم تھا بدحواسی کا
کہ دھیان ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ تبادلہ خیال میں یہ سوال مختلف لوگوں سے کیا گیا اور طرح طرح کے جوابات سامنے آئے۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ رات کو سونے سے پہلے ادب کا مطالعہ سکون بخشتا ہے۔ کسی نے یہ بتایا کہ کسی ادیب نے لکھا ہے کہ ادب کے مطالعہ نے اسے خودکشی سے روک دیا، کسی کے نزدیک دوران سفر وقت گزارنے کا بہترین ذریعہ ادبی کتابوں کا مطالعہ ہے۔

میں ادب کو نہ نیند کی گولی سمجھتا ہوں، نہ ڈپریشن کی دوا اور نہ وقت گزاری کا حل، میرے لیے ٹرین میں سفر کرتے ہوئے اپنے سے دور بھاگتے ہوئے کھیت، کھلیان اور ان میں کام کرتے ہوئے لوگ، پہاڑ، درخت، بہتے ہوئے نالے، دریا، کو دیکھنا، اپنے ہم سفروں کے طور طریقے ان کی بات چیت، ان کا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اُلجھنا، ان کی نفسیات کو سمجھنا زیادہ دلچسپی کا سبب ہوتا ہے اور اس کا شعور شاید مجھے مطالعہ ادب نے ہی بخشا ہے۔ فرد کی زندگی بہت مختصر ہے اور اس کی کائنات بے حد وسیع۔ شاید اپنے آپ کو سمجھنے کا وسیلہ، خود کو پہچاننے کا ذریعہ ادب کا مطالعہ ہی ہوسکتا ہے۔ میں بھی ادب کا مطالعہ اپنی تسکینِ ذوق، عرفان ذات و کائنات اور شخصیت کے ترفع کے لیے کرتا ہوں۔ اس لیے ادب کا مسلسل مطالعہ میری ذاتی ضرورت بن گئی ہے۔ البتہ ادب کا نظریاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ، پیشہ ورانہ کبھی مجبوری کے تحت کرنا پڑ جائے تو اور بات ہے لیکن حتی الامکان اس سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

●

ایک بزرگ کا واقعہ کہیں پڑھا تھا کہ ان کے آخری وقت میں روزے کے تعلق سے ان کے معمولات دریافت کیے گئے۔ جواب میں انھوں نے درجہ بدرجہ انبیائے سابقین کے روزوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ سائل بار بار کہتا حضرت! میں آپ کے روزے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور وہ بزرگ ہر بار کسی پیغمبر کا ذکر کر دیتے۔ سائل پھر عرض کرتا حضرت: آپ اپنے روزوں کے بارے میں ارشاد فرمائیں۔ بہت دقتوں سے سائل اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور ان بزرگ نے بتایا کہ میں صائم الدہر رہا ہوں۔ روز صبح میری بیٹی مجھے دوپہر کا کھانا دے کر رخصت کرتی، میں باہر نکل کر پہلے سائل، ضرورت مند کو وہ کھانا دے دیتا کہ نفل روزے کی نیت کر چکا ہوتا تھا، ہاں اگر کوئی دوپہر میں کھانے کے لیے کبھی مدعو کرتا تو اس کی دعوت قبول کر لیتا ورنہ شام کو افطار ہی کرتا۔

اس واقعے کو تمہید کے بطور عرض کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہماری تہذیب میں ایسے کسی سوال کے جواب کو نظر استحسان سے نہیں دیکھا جاتا جس سے جواب دینے والے کی زندگی کا کوئی امتیازی پہلو واضح ہوتا ہو۔ آج جو سوال درپیش ہے اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ اس سوال کے ممکنہ جوابات کچھ اس طرح ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ادب کے مطالعے سے ہمارا ذہنی افق وسیع ہوتا ہے۔

۲۔ ادب کا مطالعہ ہمارے احساس کو بیدار کرتا ہے۔

مصنف کا عنوان (۱): یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے "

۳۔ ادب کا مطالعہ ہمیں نیک و بد کی تمیز کراتا ہے۔

۴۔ ادب کے مطالعے سے ہم مہذب اور مرتب شخصیت کے مالک بنتے ہیں۔

۵۔ ادب کا مطالعہ ہمیں انسانوں ہی نہیں جانداروں کی زندگی کے سوز و ساز اور درد و داغ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

۶۔ ادب کا مطالعہ ہماری ذہن سازی اور مزاج سازی ہی نہیں کردار سازی کا بھی فریضہ انجام دیتا ہے۔

۷۔ ادب کا مطالعہ ہمیں حیات و کائنات کی ماہیت سے روشناس کراتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت کہ جب میں مطالعہ ادب کے اسباب کے تعلق سے غور کر رہا ہوں یہ خیال بھی آ رہا ہے کہ مجھے مذکورہ بالا ممکنہ جوابات کس نے سجھائے، کیا اسے الہام یا القا کا نام دوں۔ اس ذیلی سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ جوابات القا یا الہام قطعی نہیں ہیں کہ میں ایک عام آدمی ہوں اور القا و الہام غیر معمولی کیفیتیں۔ غیر معمولی کیفیتیں عام آدمی پر طاری نہیں ہوتیں۔ سوال ابھی بھی قائم ہے کہ یہ جواب مجھے کس نے سجھائے؟ میری سمجھ میں اس ذیلی سوال کا جواب یہ آتا ہے کہ میرے اس ماحول اور پس منظر نے جس میں میں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ گویا اس سوال کا معروضی جواب ممکن نہیں کیوں کہ جو میرا ماحول ہے، جو میرا پس منظر ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

پھر ایک اور مسئلہ ادب کی شناخت کا ہے۔ ادب ہے کیا؟ ہم خدا جانے کیا کیا چیزیں ادب سمجھ کر پڑھتے رہے اور اس بات سے واقف ہی نہیں ہو پائے کہ کون سی تحریر ادب کے زمرے میں آتی ہے اور کون سی نہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہم خود کو ادب فہم ہی نہیں بلکہ ادب پر اظہار خیال کرنے کی صلاحیت سے مالا مال بھی سمجھنے لگے اور بزعم خود ادیب اور صاحبِ قلم بھی بن گئے۔ لیکن مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا کہ ادب کیا ہے۔

یہاں تک کہ ادب ہی نے ہمیں خبر دی کہ ''چہل سال عمر عزیزت گذشت''۔
زندگی کے اس تجربے سے سب لوگ گزرے ہیں کہ نہیں، میں نہیں جانتا، لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ امتداد عمر کے ساتھ ساتھ مجھ پر وہ کیفیت گزری جسے اقبال نے قرآنی تلمیح کے حوالے سے کمال بلاغت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

شعر مذکور میں بیان کی جانے والی کیفیت کی طرح میں بھی جو پڑھتا اسی کو ادب سمجھتا اور اس میں زندگی کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ مطالعہ کے دوران میں ایک چیز ناپسندیدہ بھی ہوتی ہے یا کم از کم مجھے ہمیشہ محسوس ہوئی اور وہ ہے نصاب، اس بات کے ثبوت کے بطور خود میرا اکیڈمک ریکارڈ پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں آج بھی ان لوگوں پر رشک کرتا ہوں جو اپنا نصاب سنجیدگی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اعلیٰ درجوں میں امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اب جب کہ نصاب کے مطابق مطالعہ کی پابندی کے حدود سے باہر نکل چکا ہوں اس بات پر غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کسی طرح کے جبر کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ بات میرے لیے یوں بھی صحیح ہے کہ بچپن سے ہی دوسرے مضامین کے مقابلے ادب کا مطالعہ میرے لیے زیادہ کشش رکھتا تھا۔ ان مضامین اور ان چیزوں کے مقابلے جنھیں پڑھ کر میں اچھے نمبر لا سکتا تھا ادب پڑھنے میں میرا دل زیادہ لگتا تھا۔ امتحان کے زمانے میں بھی بجائے سائنس اور حساب کے میں غیر نصابی چیزیں اور خاص طور پر ادب زیادہ سنجیدگی سے پڑھتا۔

مجھے میری تہذیب، میرے ماحول اور میرے پس منظر نے یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا حاصل احساس لاحاصلی اور احساس زیاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مطالعہ ادب سب سے بہتر طریقہ سے قاری کو احساس زیاں کراتا ہے۔ احساس زیاں عرفانِ ذات کے حصول کی اولین منزل ہے، یہ بات بھی مطالعۂ ادب سے ہی واضح اور روشن ہوتی ہے۔

گویا مطالعہ ادب سے میرا آپ مجھ پر کھلتا جاتا ہے۔ مطالعہ کا یہ فائدہ ادب کے علاوہ کسی دوسری شاخ علم کے مطالعے سے شاید حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے تمام علوم وفنون کے ماہرین بھی ادب سے شغف رکھتے ہیں۔

اقبال کے مذکورہ بالا شعر کے مصداق میں اقبال کے ہی وسیلے سے ان کے مرشد اور اپنے زمانے بلکہ ہر زمانے کے بڑے ادب ساز مولانائے روم کے ادب سے متعارف ہوا۔ پیر رومی کے ادب نے مجھے سب زیادہ احساس زیاں کرایا اور ان کا یہ شعر مجھے ایک عجیب کیفیت سے دوچار کر گیا۔

ایها القوم الذی فی المدرسة

کلما حصلتموه ، وسوسة

پھر ان کا یہ مشورہ جس پر عمل کرنے کی ہمت تو آج تک نہ کر پایا لیکن دل کو لگا بہت کہ:

جملہ اوراق کتب در نار کن

سینہ را از نور حق گلزار کن

تا توبنی در علوم انبیا

بے کتاب و بے معین واوستا

آج جب مطالعہ ادب کے اسباب کے تعلق سے کیے گئے سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوں مجھ پر اپنی تنگ دامانی روشن ہوتی جارہی ہے اور میں خود کو اس سوال کا جواب دینے سے قاصر پاتا ہوں اور اعتراف عجز کے علاوہ کچھ بھی کہنے کی حالت میں خود کو نہیں پاتا۔ اس کیفیت کو خدائے سخن میر تقی میر نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔ میر کے اس شعر پر اپنی گفتگو ختم کر کے آپ کی زحمت تمام کرتا ہوں کہ۔

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے

وہ بھی ایک عمر میں ہوا معلوم

●

ڈاکٹر محمد علی جوہر

ادب، ہم اس لیے پڑھتے ہیں کہ ادب آدمی کو انسان بناتا ہے۔ ادب ہمیں مسرّت بھی دیتا ہے اور بصیرت بھی۔ ادب ہمارے جذبات کی تسکین کے ساتھ ان کی تطہیر بھی کرتا ہے۔ ادب ہماری زندگی کا ترجمان بھی ہے اور نقاد بھی۔ ادب دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے تو ادیب سیکولرزم کا سب سے بڑا علَم بردار۔ ادب کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے اور فنونِ لطیفہ سے انسان کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، اس لیے انسانوں کی اکثریت کا ادب دوست ہونا فطری بات ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی ادب میں ہوتی ہے اور اس طرح ادب ہمارے جذبوں کو زبان عطا کرتا ہے۔ ادب ہمیں ایک اور زندگی جینے اور اس حقیقی دنیا سے ماورا ایک ایسی متوازی دنیا میں پناہ لینے کا موقع فراہم کرتا ہے، جہاں نمرودِ وقت یا شدّادِ زمانہ کا کوئی حکم نافذ نہیں ہوتا۔

خالقِ کائنات نے اپنی بہترین تخلیق ''انسان'' میں خلاّقیت کا جوہر بھی شامل کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش سے آج تک عرضِ ہنر کے نئے نئے سانچے تیار کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی تیار کرتا رہے گا۔ فطرت اگر پہلی فن کار ہے تو یہ دنیا فطرت کی شاہکار تخلیق ہے۔ فطرت کی پیروی یا نقالی روزِ اوّل سے انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے، اور اسی رجحان نے دنیا کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اس حسین و دلچسپ اضافہ کا ایک نمونہ اقبالؔ کی نظم ''محاورہ مابین خدا و انسان'' میں انسان کے حسب ذیل جواب میں پیش کیا گیا ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم　　سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تو نے رات پیدا کی میں نے چراغ پیدا کیا۔ تو نے مٹی پیدا کی میں نے اس سے خوب صورت پیالے بنائے۔ تو نے بیابان، کہسار اور جنگل پیدا کیے۔ میں نے خیابان وگلزار اور باغ اگائے۔ میں وہ ہوں جو پتھر سے آئینہ پیدا کرتا ہوں۔ میں وہ ہوں جو زہر سے نوشینہ یعنی تریاقِ زہر تیار کرتا ہوں۔

اقبالؔ نے اپنی ایک اور نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور تخلیقی جوہر کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اس نظم کا آخری بند اس طرح ہے:

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے　　تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے　　محنت کش وخوں ریزو کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

انسانی ذہن وقلب میں پنہاں اسی تخلیقی جوہر کے عمدہ استعمال کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہم فنونِ لطیفہ کے بیش قیمت سرمایہ یعنی ادب وشاعری کو پڑھیں اس سے محظوظ ہوں، اپنے ذہن وفکر میں، اپنے طرزِ گفتار میں، اپنی تحریروں میں نکھار پیدا کریں، اپنے سماجی رویّوں میں تبدیلی اور بہتری لائیں۔ میں نے شعر وفکشن کے مطالعہ کے دوران شدّت سے یہ محسوس کیا ہے کہ غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر میرے اندر ادب کے اثرات رفتہ رفتہ داخل ہوتے جارہے ہیں۔ مجھ پر سماج کے افراد کی دورنگی، دوغلاپن، منافقت، تنگ نظری سب کچھ عیاں ہوتا جارہا ہے اور مجھے ان چیزوں سے خود بخود نفرت ہوتی جارہی ہے۔ ظاہر ہے ادب کوئی مبلغ یا مصلح نہیں ہوتا، لیکن اس میں پیش کردہ اعلیٰ وارفع خیالات وجذبات اور زبان وطرزِ اظہار تربیت یافتہ قاری پر گہرا اثر چھوڑتے ہی ہیں۔

میرے ادب پڑھنے کے اسباب میں اس بات کی بھی خاصی اہمیت ہے کہ ادب کے مطالعہ سے میری ذہنی الجھنیں دور ہوتی ہیں اور فکشن کے بعض کرداروں کو پڑھ کر میں تطہیر کے عمل سے گزرتا ہوں۔ فکشن چاہے کہانی ہو یا ناول، ان کے مکالمات سے میں نے متعدد مواقع پر گفتگو کے آداب سیکھے ہیں، اپنی زبان اور طرزِ اظہار کو سدھارا ہے، بہتر بنایا ہے۔ نثر میں تشبیہ و استعاروں اور معنی و بیان سے نزاکتیں سیکھی ہیں۔ غالب کے فلسفیانہ اشعار کو یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر سے سمجھا تو ذہن کے دریچے کھلے، ان کی فلسفیانہ موشگافیوں کے ساتھ ساتھ لفظوں کے معمولی سے الٹ پھیر سے معمائی نظام کا احساس ہوا۔ غالبؔ کے نظامِ شعری میں تشبیہات و استعارات کی پیچیدگی کے ساتھ سہلِ ممتنع کے بیسیوں اشعار نے ان کی شعری عظمت کا لوہا منوایا اور زمانۂ طالب علمی سے آج تک غالبؔ کو جتنی بار پڑھتا ہوں نئے مفاہیم کا ادراک ہوتا ہے، یوں غالب نے مجھے فلسفہ کے کچھ گر بھی سکھا دیے۔ پہلے اقبالؔ کی غزل کے اشعار کو اور ان کی نظموں کو بہت جھوم جھوم کر پڑھتا۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ، مسجد قرطبہ اور جبریل و ابلیس جیسی نظمیں پڑھتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ یہ میرے دل کی آوازیں ہیں، عمر و مطالعہ کی ترقی کے ساتھ ان پر سنجیدہ غور و خوض کیا تو ہزاروں مربع میل کے وسیع میدان میں اقبالؔ کو تنہا بہت بڑے قد کا دانشور پایا۔ اسلامی فلسفہ کا عظیم شاعر لیکن اجتہاد کا علم بردار، جو صحیح معنی میں اسلامی فکر کی نمائندگی کرتا ہے:

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب ضرورت ہے کہ ترا فیض ہو عام اے ساقی

فیضؔ، سردارؔ جعفری، مخدوم اور جوشؔ کے مطالعہ نے اپنے دور کے اُبھرتے ہوئے سماجیاتی نظام کی عمدہ تعبیرات بخشیں، ان میں سے کون ہے جو اشتراکی نظام کا علم بردار نہیں، لیکن مولانا اقبالؔ یعنی علامہ اقبالؔ کی کتابِ فکر و فن سب کی بغل میں دبی ہوئی نظر آتی ہے۔

نیا ادب نئے عالمی تناظر سے روشناس کراتا ہے۔ عہدِ حاضر کی کلفتیں، تنہائیاں، تیز رفتار زندگی، کمپیوٹرانہ مزاج، اقدار کی شکست و ریخت، خود غرضی، بے حسی اور

بے دردی کی ساری داستان اور روداد ہمارے ادبی سرمایہ کا بھرپور حصہ ہے۔ نئے صارفی نظام نے انسان کو بازار میں فروخت ہونے والی ایک شے بنا دیا ہے۔ اس لیے نئے ادب کے مطالعہ میں ہمارے دور کے یہ سارے احساسات اپنا عکس دکھا رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ شاعری ہو یا فکشن یا ڈرامہ جو خود فکشن ہی ہے، ان سب کا مطالعہ مجھ پر گہرا اثر چھوڑ رہا ہے اور میں مختلف وقتوں میں مختلف سادہ و پیچیدہ کیفیات سے گزر رہا ہوں۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس عہد میں یہ ظاہر کرنے اور اس خیال کو حاوی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ادب پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ فریبِ نظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے ادب کی معنویت قائم رہے گی، اور جب تک ادب کی معنویت قائم رہے گی ادب کے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ادب کا طرزِ گفتار سائنس دانوں کی سوچ اور طرزِ اظہار سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً غربت و افلاس سے تنگ آ کر ایک غیرت مند شخص زہر کھا کر خودکشی کر لیتا ہے تو سائنس یہ رپورٹ پیش کرتی ہے کہ ''اس شخص کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے۔'' اسی واقعے پر ایک ادیب کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ اس کی موت کا سبب زہر کے بجائے اس کی غریبی اور مفلسی بتاتا ہے۔ سائنسی فیصلے بصارت پر مبنی ہوتے ہیں تو ادبی فیصلے بصیرت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بصارت کے مقابلے بصیرت کا مقام بلند ہے۔ یعنی صاحبِ بصیرت اربابِ بصارت سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔

چنانچہ صارفیت زدہ ماحول، گمراہی اور ہٹ دھرمی کے اس خوف ناک دور میں جہاں مذہب و اقدار کے سارے حوالے بے معنی ہوتے جا رہے ہیں انسانی رشتوں کی بحالی اور انسانی قدروں کے تحفظ و بقا کے لیے اگر کسی طبقے کا کردار بامعنی نظر آتا ہے تو وہ شاعر و ادیب کا طبقہ ہے۔ آج متمدن دنیا کی ترقیٔ معکوس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم آج بھی دورِ ناشائستگی میں جی رہے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو یہی زمانہ صحیح

معنوں میں شعر و ادب کے فروغ کا زمانہ ہے۔ چوں کہ ادیب معاشرے کا ضمیر بھی ہوتا ہے اور روحِ عصر کا ترجمان بھی، لہٰذا اس پُر آشوب دور کے اخلاقی اور تمدنی بحران سے باہر نکلنے کے لیے کوئی راہ کہیں کھلتی ہے تو وہ شعر و ادب کی دنیا کے اندر ہی کھلتی ہے۔ میں اپنی ذات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ ادب کے مطالعے کا ہی فیضان ہے کہ ہم انسانیت کے اس درد کے رشتے پر گفتگو کر رہے ہیں جو اہلِ ادب کو وراثت میں ملا ہے۔

●

کہا جاتا ہے کہ کافکا کی تحریر پڑھ کر ہمیں دنیا بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن دستوئسکی کو پڑھ کر دنیا کے بجائے ہم خود کو بدلا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ان دو بڑے مصنفوں کی تحریروں کو پڑھ کر دو مختلف قسم کے تاثرات کیوں قائم ہوتے ہیں۔ کیا ادب میں واقعی ایسی کوئی قوت ہوتی ہے جو ہمارے سوچنے اور محسوس کرنے کے عوامل کو اس حد تک متاثر کر سکتی ہے؟ یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ تبدیلی کا یہ عمل اگر واقع ہوتا ہے تو اس کی نوعیت شعوری ہے یا لاشعوری؟ کیوں کہ بظاہر تو ہم اس توقع کے ساتھ ادب نہیں پڑھتے کہ یہ ہمارے ادراک اور احساس کا نقشہ بدل دے گا۔ ادب لفظوں کو جوڑنے کا فن ہے اور انسان کے پاس اپنے اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ زبان ہے۔ بظاہر الفاظ صدیوں پُرانے اور گھسے پٹے سہی لیکن ان میں زبردست تحرّک اور زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چوں کہ ادب کا میڈیم زبان ہے اس لیے ادب دوسرے فنون لطیفہ سے مختلف ہے۔ ادب میں زبان کا بنیادی کردار Self reflexive ہے یعنی زبان اشیاء کی نمائندگی کرنے کے بجائے خود اپنے طرز وجود اور متن کی تعمیر کے وسائل کو نمایاں کرتی ہے۔ فی زمانہ زبان کی ماہیت اور طرزِ عمل پر جو بحثیں ہوئی ہیں، انھوں نے پڑھنے والے کے ذہن میں سو طرح کے شکوک پیدا کر دیے ہیں۔ گویا ادب پڑھنا کسی چھلاوے یا الیوژن کا پیچھا کرنا ہے، لیکن

یہ تو ماننا پڑے گا کہ جو ایک بار اس تعاقب میں نکل پڑے وہ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھتا۔ شاید اُسے یہ خوف پریشان کرتا ہے کہ کہیں وہ پتھر کا نہ ہو جائے۔ آمدم برسرِ مطلب۔ سوالیہ عنوان کا نہایت مختصر اور شاید معقول جواب یہ ہو سکتا ہے کہ پڑھنا ہمارے لیے ایک عادت بن گئی ہے۔ مگر یہ عادت کیوں کر بنی؟ تو جہاں تک مجھے یاد ہے مطالعہ کا شوق مجھے بچپن سے تھا اور یہ شاید اس وجہ سے کہ میرے گھر میں ادب کا چرچا تھا۔ علی گڑھ کا ذکر بھی رہتا تھا۔ والد محترم فرنگی محل کے مدرسہ کے فارغ التحصیل، عالم اور مقرر تھے۔ اُس وقت کے تمام ادبی رسائل ہمارے گھر آتے تھے اور دوسروں کی دیکھا دیکھی، میں بھی پڑھتی تھی حالاں کہ میری امّی اکثر کہا کرتیں کہ ابھی تم بہت چھوٹی ہو، اپنے کورس کی کتابوں کو پڑھو، پھر انھیں بھی پڑھ لینا۔ گریجویشن کے زمانے میں یہ شوق اور بھی بڑھ گیا۔ اور میں اس پر غور کرنے لگی کہ ایک ہی گھر اور ماحول میں رہ کر اکبری علم سے بے بہرہ تو اصغری زیورِ علم و ہنر سے آراستہ کیوں کر ہے۔ حسن آرا انتہائی بے باک ہے تو حمیدہ کی معصومیت اس قدر پُرکشش کیوں ہے۔ نذیر احمد کے ان کرداروں میں نعیمہ خودسر ہونے کے باوجود اپنی باتوں اور حرکتوں سے کیوں دل موہ لیتی ہے۔ ''فردوسِ بریں'' میں زمرد کا کردار اپنی عقل مندی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے پسند آیا تو تاتاری شہزادی بلغان خان کا کردار باعمل اور بے خوف عورت کی شکل میں ذہن پر چھا گیا۔ راشد الخیری کی نسیمہ اور صالحہ کے ساتھ رسوا کی خانم اور امیرن جیسے کرداروں سے بھی واقفیت ہوئی۔ مطالعہ کی اس منزل پر زیادہ تر واسطہ کرداروں سے رہتا تھا۔ پسند ناپسند اور سفید و سیاہ جیسے خانوں میں کرداروں کی تقسیم ایک فطری عمل تھا جس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ ادراک بعد میں ہوا کہ فکشن کے کردار محض ایک وسیلہ ہیں جن کا ایک مخصوص رول ہے۔ انھیں اُس طرح نہیں دیکھنا چاہیے جس طرح ہم اپنے آس پاس کے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ جیسے جیسے شعور بڑھا مطالعے کا معیار بدلتا گیا، انسانی روابط اور معاشرتی مسائل کے کئی گوشے ادب کے ذریعہ توجہ کا مرکز بننے لگے۔ یہ احساس ہونے لگا کہ ادب ایک ایسا فن ہے جس میں مرکزیت انسان کو

حاصل ہے۔ انسان کے نفس اور انسانوں کے روابط کا بیان ہمیشہ ادب میں نمایاں رہا ہے اور رہے گا۔ یوں فطرت اور خدا بھی ادب کے موضوع ہیں لیکن نفسِ انسانی ایک مرکز کے طور پر ادب میں قائم رہتا ہے۔ ادب چاہے جس زبان میں لکھا جائے اور خواہ کسی بھی معاشرے اور تہذیب کی نمائندگی کر رہا ہو ہمیں متاثر کرتا ہے۔ ہم مختلف زبانوں کے تراجم پڑھتے ہیں اور ایسی تحریریں بھی پڑھتے ہیں جن کا ہمارے عہد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہم کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ادب وہ تحریر ہے جو ہم کو چشم زدن میں ان دیکھے لوگوں اور ان دیکھے زمانوں کا معاصر بنا دیتی ہے۔

ادب ہمارے اندر ایک تجسّس پیدا کرتا ہے اور پڑھنے والا کرداروں اور اُن کی تقدیر سے اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی سطح پر وابستہ کر لیتا ہے، اس حد تک کہ وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اپنی محدود دنیا کی قید سے نکلنے اور چشمِ تنگ کو کثرت نظارہ سے وا کرنے کا ایک وسیلہ ادب بھی ہے۔ لیکن پڑھنے والے کی یہ آزادی ایک دودھاری تلوار ہے۔ اس میں پڑھنے والے کے لیے حقیقت کا سامنا کرنے اور حقیقت سے فرار اختیار کرنے کے امکانات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔

اس بات سے شاید کوئی انکار نہ کرے کہ ادب قارئین پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ انسانی احساس فکر اور تجربہ کی وسعت اور گہرائی کا جیسا بیان ہمیں ادب میں ملتا ہے دوسرے علوم میں نظر نہیں آتا، شاید اس لیے کہ علوم واضح مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ کہانیاں ہمیں ایک ہی زندگی میں ایک سے زیادہ زندگیاں جینے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ان میں ہم زندگی کی وہ شکلیں دیکھتے ہیں جو شاید کسی اور طرح سے ہمارے تجربہ میں نہیں آتیں۔ میں نے اپنے مطالعہ کے دوران بارہا غور کیا کہ منٹو کے افسانوں میں کیسے کیسے لوگ نظر آتے ہیں، نہایت فعّال اور زندہ لوگ، مگر زندگی کے مانوس سانچوں کے عین مطابق نہیں، کہیں اُن سے زیادہ کہیں اُن سے کم۔ منٹو کے یہاں جسم انسان کی روح تک پہنچنے اور باطن کو سمجھنے کا وسیلہ ہے۔ منٹو نے طوائف کو زندگی کا استعارہ بنا دیا ہے۔ سوگندھی کو ہتک کا جو احساس ہوتا ہے وہ عام زندگی میں ہونے

والے ہتک کے احساس سے کہیں بڑھ کر اور مختلف ہے۔ یوں کہانیوں کے کردار حقیقی مردوں اور عورتوں سے زیادہ قد آور اور زیادہ طاقت ور ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں اہم سوال یہ ہے کہ فن Larger than life کیسے ہو جاتا ہے؟ تو وہ اس طرح کہ اُس کا سفر زمان و مکان کا احاطہ کرتے ہوئے بھی ان قیود سے ایک سطح پر آزاد ہوتا ہے اور اپنے ایجاد کیے ہوئے تناظر میں حیات کی نئی معنویتیں دریافت کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک فرد کی سچائی انسانی سچائی میں ڈھل جاتی ہے اور یہ سچائی کسی تہذیبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی حوالے کے بغیر بھی ہم سے اپنا اثبات کراتی ہے اور ایک باطنی رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ کئی مقامات پر ہم ان کرداروں اور ان کی صورت حال سے اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ اُن کے تجربے اور احساس کی گواہی دینے لگتے ہیں۔ میرے لیے ادب انسانی احساس کو پرت در پرت کھولنے کی آرزو کا سفر ہے۔ حیات اور کائنات کے مخفی گوشوں اور "اندیشہ ہائے دور دراز" میں سامنے آنے والی گتھیاں سلجھانے میں مجھے ادب سے ہمیشہ مدد ملی ہے۔ ادب میں سوال بھی ہوتے ہیں اور جواب بھی لیکن کسی مسئلہ کا حتمی حل یا کوئی مربوط نظریہ پیش کرنا ادب کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ادب کی کشش اُس کی آزادہ روی میں ہے۔ ایک ہی شعر میں لطف اور عرفان کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ بات منطقی اعتبار سے صحیح ہے یا نہیں شعر میں اس سے مطلب نہیں ہوتا۔ دیکھا یہ جاتا کہ شعر ہمیں کہاں تک متوجہ اور متاثر کر سکتا ہے۔ تجربہ پیچیدہ بھی ہو سکتا ہے اور سادہ بھی۔ ادب میں بات تجربہ کی قدر و قیمت کی نہیں ہوتی۔ ادب میں تجربہ ہمیں ایک لسانی تشکیل کے طور پر ملتا ہے۔ لہٰذا جو بھی تجزیہ ہوگا وہ اس لسانی تشکیل کا ہوگا تجربہ کا نہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادب انسان کے عام تصورات کی حدود سے آگے بھی جاتا ہے اور حقائق کی نامعلوم حدود میں بھی دراندازہو سکتا ہے۔ ایک سطح پر ادب تہذیب کی روح کی تلاش ہے اور یہ بات میں نے قرۃ العین حیدر کے فکشن میں سب سے زیادہ پائی ہے۔ اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ محبت،

نفرت، عداوت، خوف وترحم، غم وغصہ، خوشی، فکر وتردّد وغیرہ وغیرہ زندگی کے ایسے عناصر ہیں جو ہر عہد کے انسان کا مقدر رہے ہیں اور ادب کے موضوعات زندگی کے انھیں احساسات سے منور رہیں، اور میرے احساسات کو ہر اچھے ادب پارے اور تخلیقی فن پارے سے، جس میں یہ عناصر موجود ہوں، روشنی ملی ہے اور ادب کے مطالعے سے حاصل ہونے والا ذہنی انبساط کا یہ سرمایہ مجھے مسلسل ادب پڑھنے اور پڑھتے رہنے پر مجبور کرتا ہے اور اس طرح ادب انبساط دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں حقیقت کے روبرو بھی کرتا ہے۔ مسائل سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیتا ہے، زندگی کی بوالعجبی اور ستم ظریفی کا تجربہ ہمیں جس طرح ادب میں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔

●

ڈاکٹر راشد انور راشد

جس طرح یہ سوال بے حد اہم لیکن قدرے مشکل ہے کہ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں، اسی طرح بنیادی سوال سے متعلق یہ پہلو بھی یکساں اہمیت کا حامل ہے کہ ہم ادب ہی کیوں پڑھتے ہیں؟ یہ دونوں سوال دراصل ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں اور گفتگو کی کوئی بھی نہج اختیار کی جائے، پہلے سوال سے دوسرے سوال کو کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ذہن میں بہ یک وقت کئی سوالات اُبھرتے ہیں جن کے تشفّی بخش جوابات حاصل کرنے میں ہمیں دشواری پیش آتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ لطف اندوزی اور ذہنی سرشاری کے لیے ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو فطری طور پر یہ سوال ذہن میں اُبھرے گا کہ یہ مقاصد تو غیر ادبی تحریروں کو پڑھ کر بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ پھر ادب کو ہی مطالعے کے لیے منتخب کرنے کا جواز کیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ وقت گزارنے کے لیے، اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ منطق خود ہمیں متاثر نہیں کر پائے گی کیوں کہ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں، اس میں وقت گزارنے اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے ہزار طریقے موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زندگی کی تلخیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، تو پھر یہ بامعنی خیال بھی ہمیں ذہنی آزمائشوں میں مبتلا رکھتا ہے کہ اس مقصد کے حصول میں ادب کے بجائے دوسرے وسائل ہمارے لیے زیادہ معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور پھر حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض معاملات میں ذہنی سکون بخشنے کے بجائے ادب

ہماری بے چینیوں میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر، مطالعے کے نام پر ادب کے دامن میں ہی پناہ لینا ہماری مجبوری کیوں ہے، یہ سوال اپنی جگہ تشنہ ہی رہتا ہے۔ ہر چند کہ لطف اندوز ہونے، اپنے آپ کو مصروف رکھنے اور زندگی کی تلخیوں سے نجات کے متعلق جو باتیں سامنے آئیں وہ بھی مطالعۂ ادب کے ضمن میں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں، لیکن ادب سے رغبت اور شغف کے سلسلے میں ان باتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں اہم محرک کی حیثیت رکھتی ہیں، البتہ انھیں بیان کرنا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ زندگی میں مختلف مرحلوں پر ہم بعض چیزوں کی ضرورت محسوس تو کرتے ہیں لیکن اسباب بیان کرنے میں ہمیں دُشواری پیش آتی ہے۔ مطالعۂ ادب کے اسباب بیان کرنے کا معاملہ بھی میرے نزدیک کچھ ایسا ہی ہے۔

سب سے پہلے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ہمیں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ ہم میں سے بیش تر لوگ ادب کا مطالعہ بہ حالت مجبوری کرتے ہیں۔ یعنی درس و تدریس کے بجائے اگر ہم کسی دوسرے شعبے سے وابستہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ ہماری ترجیحات مختلف ہوتیں۔ جہاں تک ترجیحات کا معاملہ ہے تو پڑھنے پڑھانے کے ماحول سے متعلق ہونے کے باوجود مطالعۂ ادب کی حیثیت ہمارے نزدیک ثانوی ہوتی ہے۔ نصاب میں شامل کتابیں اگرچہ ادب کی اہم اور بنیادی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن محض انھیں کتابوں کا مطالعہ کرکے ہم ادب کے سنجیدہ قاری ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔

جس طرح ادب تخلیق کرنا ایک پیچیدہ عمل ہے، اسی طرح مطالعۂ ادب کا معاملہ بھی کم پیچیدہ نہیں۔ بلکہ بعض معاملات میں یہ ہمارے لیے زیادہ دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ جس طرح کچھ لکھنے سے پہلے ایک تخلیق کار کے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح ہونی چاہیے کہ اسے کیا نہیں لکھنا ہے، اسی طرح مطالعۂ ادب کے سلسلے میں انتخاب کا معاملہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ادب پڑھنے کے سلسلے میں ہم انتخاب کے مرحلے سے تو یقیناً گزرتے ہیں، لیکن پڑھنے کے مخصوص عمل کے اسباب بیان کرنے کی

دشواری اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ بہر حال موضوع کی مناسبت سے چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گا۔

میں ادب کا مطالعہ اپنے آپ کو ازسرِ نو دریافت کرنے کے لیے کرتا ہوں۔ بیش تر اوقات، انسان اپنے آپ سے پوری طرح واقف نہیں ہو پاتا۔ زندگی کی مصروفیتوں میں وہ ہر لمحہ اس قدر اُلجھتا چلا جاتا ہے کہ اسے اپنے اندر جھانکنے کی مہلت نہیں مل پاتی۔ وہ چاہ کر بھی اپنا محاسبہ نہیں کر پاتا۔ اپنی ذات، اپنی شخصیت کی باطنی تہوں سے وہ ایک عرصے تک انجان رہتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ادب کے بہترین نمونے، انسان کی خود سے معرفت کرانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں نے مطالعۂ ادب کے بعد اپنے اندر ہمیشہ ہی خود اعتمادی محسوس کی ہے۔ ادب کے بہترین نمونے مجھے زندگی کو جوش و خروش کے ساتھ جینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ادب نے ہمیشہ ہی میری اُمنگوں، خواہشوں اور حوصلوں میں خوش گوار اضافہ کیا ہے اور زندگی کے مشکل مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ ادب کا مطالعہ مجھے یہ سکھاتا ہے کہ مجھے کس طرح سوچنا چاہیے، کن خوابوں کو آنکھوں میں بسانا چاہیے اور کس طرح انھیں خوب صورت تعبیر سے ہمکنار کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہنا چاہیے۔

بحیثیت انسان میں اپنی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ زندگی کے سفر میں ہمیں قدم قدم پر زندہ رہنے کے قرض چکانے پڑتے ہیں اور اس عمل میں کب ہم بے حسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں، خود ہمیں بھی اس کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ ہم اپنی ''انا'' کو بالائے طاق رکھ کر نام نہاد کامیابی کا طوق گلے میں لٹکا کر پھولے نہیں سماتے۔ اپنے ضمیر کا سودا کرنے میں ہمیں کوئی تکلّف محسوس نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ترقی کی اندھی دوڑ میں شامل ہونے کے دوران کب ذہنی اور اخلاقی زوال کی گہری کھائی ہماری تقدیر بن چکی ہے۔ ارتقا کے نام پر انسان اپنی تباہی کی راہیں خود ہموار کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی پوری زندگی لاسمتیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک صرف ادب ہی اس سنگین صورتِ حال سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

ادب کے بہترین نمونوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے تطہیرِ نفس کے مرحلے سے گزرنے کی بارہا سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ادب نے میرے سوئے ہوئے ضمیر کو ہمیشہ ہی جنجھوڑا ہے۔ ادب نے ہمیشہ ہی میرے اندر یہ حوصلہ پیدا کیا ہے کہ ہزار مجبوریوں کے باوجود زندگی سر اُٹھا کر جینے سے عبارت ہے۔ ادب نے ہمیشہ مجھے یہی سکھایا ہے کہ اپنی خودداری کے ساتھ دوسروں کی عزّت نفس کا خیال رکھنا ہی اصل انسانیت ہے۔ ادب کے ذریعے ہی مجھے اس بات سے آگاہی ہو پائی ہے کہ سچّی خوشی دراصل دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے، زندگی میں کئی مقامات ایسے آئے ہیں جب میں نے اپنا محاسبہ کر کے اپنی خامیوں کو دور کیا ہے۔ مجھے اپنی اصلاح کے لیے ہمیشہ ہی ادب کی غیر معمولی قوت نے مجبور کیا ہے۔ زندگی کا بہتر شعور مجھے ادب کے ذریعے ہی حاصل ہوا ہے۔ میرے ذہن کی تربیت میں ادب نے ہمیشہ ہی ایک مثبت رول ادا کیا ہے۔

ادب کا مطالعہ میں اپنی ذات کے حوالے سے دنیا کو سمجھنے کے لیے کرتا ہوں۔ بعض اشعار پڑھ کر مجھے شدّت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ میرے اندر کا کرب الفاظ کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ درد کی وہ مخصوص کیفیت طویل عرصے تک مجھے اندر سے بے چین رکھتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس حصار سے باہر نہیں نکل پاتا۔ بعض افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر میں نے ہمیشہ یہ بات محسوس کی ہے کہ فن پارے میں پیش کی گئی دنیا اور اس زندگی کی مختلف جہتیں بہت حد تک دیکھی ہوئی ہونے کے باوجود میری نگاہوں کے تجسّس میں اضافہ کر رہی ہیں، مجھے غور و فکر کے لیے اُکسا رہی ہیں۔ شعر میں، افسانے یا ناول میں بیان کیے گئے تخلیق کار کے مشاہدات و تجربات میں مجھے اکثر و بیشتر خود اپنے محسوسات کا گمان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن پارے کا مطالعہ کرنے کے دوران مختلف کرداروں میں مجھے خود اپنی ذات کا شائبہ ہوتا ہے۔ ان کرداروں کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے مجھے میری اپنی ذات، نئے زاویوں سے منکشف ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس انکشاف کی بدولت دنیا کو سمجھنے کی راہیں بہت حد تک

ہموار ہونے لگتی ہیں۔ مختلف کرداروں کی باطنی نفسیات سے آگاہی کے بعد ہمارے آس پاس کی دنیا پھر ویسی نہیں رہتی جیسی مطالعے سے قبل تھی۔ ہمارے محسوسات میں خاصہ تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم چیزوں کو مختلف سیاق وسباق میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی ذات کے حوالے سے، دنیا کو سمجھنے کی کوشش ہمیشہ میرے لیے کارگر ثابت ہوئی ہے۔

ادب کا مطالعہ مجھے اخلاقی سطح پر بلند ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ مادّہ پرستی کے دور میں اخلاقی قدروں کا زوال جس تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے، اس سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ زندگی کی تمام تر کوششیں ذاتی مفادات سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ اپنے مفاد کے لیے ہم زندگی کی بہترین قدروں اور اصولوں کو قربان کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ ہوس کے بڑھتے ہوئے رجحان نے نیک ارادوں پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ ذہنی انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے، تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے منظرنامے میں غور وفکر کی صلاحیتوں سے دنیا محروم ہوتی جا رہی ہے۔ شدید بحران کے ایسے دور میں خطرہ تو یہی ستاتا ہے کہ اب سب کچھ بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گا، لیکن ایسے نازک دور میں بھی زندگی کی لے تھمی نہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی نہ کسی سطح پر ہمارے اندر کا انسان اب بھی زندہ ہے جو ذہنی طور پر مزید آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے قدم قدم پر ہمیں لعنت ملامت کرتا ہے۔ میں نے جب بھی ایسے ادب کا مطالعہ کیا ہے جس میں زندگی کی نام نہاد آسایشوں سے بے زاری، انسان کے قلندرانہ وصف کو نمایاں کرتی ہے، اس نوع کے ادب نے غیر معمولی طور پر مجھے ذہنی آسودگی سے ہمکنار کیا ہے۔ ویسی صورت میں کچھ نہ ہونے کے باوجود زندگی کو شانِ بے نیازی کے ساتھ جینے کی خواہش سر اُبھارتی ہے، اور تنگ دامانی بھی شانِ خسروی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر تو ذہن و دل کے ہر گوشے سے یہی صدا اُبھرتی ہے:

کوئی سلطان نہیں میرے سوا، میرا شریک
مسندِ خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

معتبر دستاویز کی حیثیت سے میں ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ادب یقیناً اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ جس زمانے میں ادب تخلیق کیا جاتا ہے، وہ دور اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے آگے روشن ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ تجربات و مشاہدات کے علاوہ قوتِ متخیلہ کا خاطر خواہ استعمال بھی ایک تخلیق کار اپنی تحریروں میں کرتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے عہد کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا کا کھلی نگاہوں سے جائزہ لیتا ہے اور اپنی تحریر کے ذریعے اسے بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس معاملے میں اس کی حیثیت اور اہمیت ایک مورخ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مورخ کی تحریر تعصبات سے قطعی پاک نہیں ہو سکتی۔ کسی نہ کسی حوالے سے اس کی ذاتی ترجیحات اس تحریر میں ضرور شامل ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے بیان کی صداقت پر حرف آتا ہے۔ اس کے برعکس ایک تخلیق کار اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے محسوسات کی ترجمانی کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس کے ذہن پر کوئی خارجی قوت اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ اپنی داخلی کیفیات کو پوری شدّت کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اس کی تحریر اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کو فن کاری کے ساتھ نمایاں کرتی ہے۔ تاریخ کی بہ نسبت ادب، زندگی کی جزئیات کو زیادہ باریکی کے ساتھ پیش کرتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے عہد کی سچی تصویر معلوم ہوتا ہے اور منطقی اعتبار سے اس کی صداقت ہمیں زیادہ قابلِ قبول محسوس ہوتی ہے۔

میرے نزدیک ادب کی حیثیت ایک ایسے سنگم کی ہے جس میں محسوسات کے مختلف دھارے ہمہ وقت شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس خوبی نے مجھے ہمیشہ ہی ادب کی جانب مائل کیا ہے۔ تاریخ، سیاسیات، سماجیات، معاشیات، عمرانیات، جغرافیہ، فلسفہ۔ غرض کہ کتنے ہی علوم، ادب میں بہ یک وقت اپنی موجودگی کا احساس کراتے ہیں۔ ادب کے قابلِ قدر نمونوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے ذریعے جہاں ایک طرف بہتر

تاریخی شعور سے ہمیں آگاہی ہوگی تو دوسری طرف سیاسیات کے بنیادی اصول، زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اپنے لازمی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے محسوس ہوں گے۔ سماج اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہوا فن پارہ جہاں سماجیات کی مختلف جہتوں کو نشان زد کرے گا وہیں معاشیات کے انوکھے پہلو زندگی کی سمت و رفتار متعیّن کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ اسی طرح عمرانیات، جغرافیہ اور فلسفے سے متعلق بنیادی نکات زندگی کے پیچیدہ فلسفوں کی تفہیم میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔ گویا کہ اچھا ادب، محسوسات کا خوب صورت سنگم ہونے کی بنا پر محض تخلیق کار کا ذاتی تجربہ نہیں رہ جاتا، جس کی بنا پر اس میں آفاقیت کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں اور وہ ادب نہ صرف اپنے عہد میں مقبول ہوتا ہے بلکہ بعد کے زمانے میں بھی اس کی اہمیت و افادیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

میں ادب پڑھتا ہوں کہ کیوں کہ ادب وژن میں اضافہ کرتا ہے۔ میں اپنے سوچنے، سمجھنے کے رویّے میں زیادہ منطقی اور مدلل ہونے کے لیے ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ہم کسی بھی زبان میں لکھے گئے ادب کا مطالعہ کریں، ہمیں یہ بات مشترکہ طور پر دیکھنے کو ملے گی کہ تخلیق کار ایک خاص نوع کا ذہنی معیار قائم رکھتے ہوئے اپنے پڑھنے والے سے ہم کلام ہے۔ ہر چند کہ وہ علمیت کا غیر ضروری اظہار کرنے، مبہم علامتوں اور ادق اصطلاحوں کا استعمال کرنے سے حتی الامکان گریز کرتا ہے، لیکن تخلیقی مرحلے سے گزرنے کے دوران وہ پڑھنے والے کے ذہنی معیار پر پورا اُترنے کے بجائے شعوری طور پر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ خود قاری اپنی ذہنی سطح بلند کر کے اس کی تحریر کو پڑھنے کی سعی کرے۔ گویا کہ اچھا ادب پڑھنے کے دوران ہماری ذہنی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ وہ پڑھنے والے کے ذہن میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اسے نئے نئے پہلوؤں پر غور و خوض کے لیے مجبور کرتا ہے، جس کی بنا پر اس کے سوچنے سمجھنے کے رویّے میں غیر معمولی تبدیلی آتی ہے اور ذہنی سطح کے بلند ہونے سے امکانات کے نت نئے دریچے وا ہونے لگتے ہیں۔

میں زبان و بیان کی جادوئی کشش سے مرعوب ہو کر ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ادب کے ہُنر میں سب سے اہم مقام زبان کو حاصل ہے۔ یہ ادب کا بنیادی جزو ہے۔ ایک قوم صرف زبان کے ذریعے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک داستان کی شکل میں پرو سکتی ہے۔ زبان کی حیثیت جادو کے اس کرشمے کی ہے جس کے ذریعے انسان اپنے ہر خیال کو ظاہر کر سکتا ہے۔ ادب کا مطالعہ پڑھنے والے کو زبان و بیان کی ہُنر مندیوں اور نزاکتوں سے واقف کراتا ہے۔ ادب کے بہترین نمونوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں استعمال کی گئی زبان کا جادو ایک عرصے تک پڑھنے والے کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں جب زبان کے اس تخلیقی شعور کا استعمال کرتا ہے تو سُننے والوں کے ذہن و دل پر انمٹ نقوش ثبت ہو جاتے ہیں۔ ادب کا مطالعہ کرنے والا شخص دوسروں کے مقابلے میں کسی بھی موضوع پر اپنی گفتگو زیادہ مؤثر طریقے سے جاری رکھ سکتا ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے شخص کی پُرلطف باتیں کسی بھی محفل کو زعفران زار بنا سکتی ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنے کا ہُنر اُسے ان لوگوں کے درمیان یقیناً ممتاز رکھتا ہے جو ادب کے مطالعے سے شغف نہیں رکھتے۔

اور آخر میں ادب کا مطالعہ میں اس لیے بھی کرتا ہوں تاکہ میں بہتر لکھ سکوں۔ ایک تخلیق کار کے لیے صرف زندگی کے تجربات و مشاہدات ہی بنیادی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ تحریر کو منفرد، پختہ، بامعنی، مربوط اور پُرکشش بنانے میں مطالعے کی وسعت اور گہرائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خیالات کی انوکھی لہریں ذہن میں موجزن ہوتی ہیں، لیکن تخلیقی عمل کے دوران تخلیق کار، شعوری یا لاشعوری طور پر ان میں سے چند خیالات کا انتخاب کرتا ہے اور اپنے قلم کی جنبش سے محسوسات کو گویائی عطا کرتا ہے۔ یہ شعور اسے مطالعے کی بنا پر ہی حاصل ہوتا ہے۔ نمایاں تخلیق کاروں کی تحریریں ہی صحیح معنوں میں ذہنی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں کہ کون سی باتیں کس طریقے سے بیان کی جائیں، تاکہ ادب پڑھنے والے کے ذہن پر زیادہ اثر انداز ہوں۔ میں نے

تخلیقی عمل کے دوران اس بات کو شدّت سے محسوس کیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جب تک میں عمدہ کلام کا مطالعہ نہیں کرتا، اندر سے شعر کہنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ عمدہ شاعری نے ہمیشہ مجھے کچھ کہنے کی تحریک دی ہے۔ اچھی شاعری مجھے اپنے اندر جھانکنے اور خود سے باتیں کرنے کے لیے اُکساتی ہے، اور مطالعے کے بعد میں بحیثیت فن کار اگر دل کی آواز پر لبیک کہنے، جذبات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں تو اس نوع کا مطالعہ مجھے روحانی غذا فراہم کرتا ہے۔ بہتر شاعری سے لطف اندوز ہونے کے بعد فطری طور پر یہ خواہش میرے اندر سر اُبھارتی ہے کہ کاش یہ اشعار میرے قلم سے وجود میں آئے ہوتے اور یہی بنیادی جذبہ مجھے لکھنے کی تحریک دیتا ہے۔

حاضرینِ محفل! یہ تمام باتیں اپنی جگہ درست، لیکن مجموعی طور پر میں ادب کا مطالعہ ذہنی سرشاری کے لیے کرتا ہوں۔ میں ایسی زندگی کا تصوّر نہیں کرسکتا ہوں، جس میں لطف و انبساط کی لہریں نہ ہوں۔

●

ڈاکٹر ریشماں پروین

ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ اس کا جواب مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہو سکتا ہے، مثلاً طلبا اپنی نصابی ضروریات کے تحت ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، کچھ لوگوں کے لیے ادب وقت گزاری کا ذریعہ ہے، بعض لوگ دورانِ سفر، ادب کے مطالعے کو پسند کرتے ہیں، بعض لوگوں کے لیے ادب ذہنی ارتفاع کا ذریعہ ہے اور بعض لوگ تفہیم و تنقید کے لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن اس کا جواب اتنا آسان نہیں ہے جس آسانی کے ساتھ یہ جملے بیان کر دیے گئے ہیں، اس لیے کہ اس سوال کی جڑیں بہت گہرائی تک گئی ہیں اور جب تک یہ بات واضح نہ ہو کہ ''ادب کیا ہے''؟ اس وقت تک اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب تلاش کرنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔ ادب کے بارے میں کسی نے کہا کہ ہر چھپا ہوا لفظ ادب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف اس لیے کافی نہیں ہے کہ ہمارا ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہے یا جو آج تک پتوں یا لکڑی کی چھال پر لکھا ہوا ہے کیا اسے ہم ادب نہیں کہیں گے؟ مجنوں گورکھپوری کی نگاہ میں ادب کے معنی تہذیب و سلیقے کے ہیں یعنی وہ ہمیں تہذیب و سلیقہ سکھا کر ایک مہذب اور شریف انسان بناتا ہے، انھوں نے لکھا ہے:

> ''ادب کوئی بے مقصد حرکت نہیں ہے اس کا بھی مقصد ہے۔ اس کا مقصد نہایت مہتم بالشان ہے۔ ادب انسان کی تہذیب کی علامت اور اس کی ضمانت ہے۔ ادب کا مقصد یہ ہے کہ اس کے اثر سے انسان بغیر

وعظ و تبلیغ کے خود بخود پہلے سے زیادہ مہذّب، زیادہ شریف اور زیادہ نیک ہوتا جائے۔"[1]

سنسکرت زبان کے شاعر اور مفکّر بھرتری ہری نے ایک جگہ کہا ہے کہ:

"انسان کے پاس ادب، موسیقی اور آرٹ نہ ہوتو وہ ایسے جانور کی طرح ہو جاتا ہے جس کے دُم اور سینگ نہیں ہوتے۔"

بھرتری ہری کے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ فن، ادب اور موسیقی وہ چیزیں ہیں جن سے ہم جانور اور انسان میں فرق کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں ادب انسان کو ایک مہذّب انسان بناتا ہے۔

ہم اگر قدیم ادب کا مطالعہ کریں وہ خواہ تامل مفکّر ترووِلُور کی 'کرل ہو یا اوستا ہو' فارسی یا اُردو کی قدیم حکایتیں، کہانیاں (گلستاں، بوستاں) سب ایک بہتر اور بامقصد زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور بھی اخلاقیات اور نیک عمل پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح ادب سبق آموز کہانیوں سے لے کر تفریح و تفننِ طبع تک پھیلا ہوا ہے اس لیے ادب کی کوئی بندھی ٹکی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ادب ہمیں بہتر زندگی کا سلیقہ بخشتا ہے۔

ادب کا ایک پہلو مسرّت آمیز ہوتا ہے، زندگی میں مسرت پیدا کرنے اور اس سے لطف اندوزی کے لیے ادب ایک بہت بڑا ذریعہ ہے، اس سے یہ معنی اخذ کرنا کہ ادب محض تفننِ طبع کا ذریعہ ہے درست نہیں ہوگا۔ ادب ہمیں زندگی کا مقصد سکھاتا ہے، اس میں حسن کی رنگ آمیزی کرتا ہے، زندگی کو بہتر اور خوب صورت بنانے اور ظلم و جبر کے خلاف احتجاج پر آمادہ کرتا ہے اس لیے ادب ہماری زندگی میں بہت اہم مقام رکھتا ہے۔ آج سائنس اور ٹکنالوجی کا زمانہ ہے اور اس کی طرف نئی نسل کی جو یورش ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ادب کی گفتگو اور ادب کا زمانہ ختم ہوگیا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ڈارون کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ اپنے فارمولوں پر غور و فکر

[1] ادب اور مقصد۔ مجنوں گورکھپوری (ادب اور زندگی، ص ۴۱)

کرتے کرتے تھک جاتا تھا تو شاعری پڑھنے لگتا تھا، یعنی ادب ہمیں زندگی کی نئی توانائی بخشتا ہے اور ہمیں اس کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ''کاویہ پرکاش'' میں ممٹ نے لکھا ہے:

> ''شاعری شہرت کے لیے، دولت کے لیے، طرزِ عمل کے لیے، نحوست کے خاتمے کے لیے، فوراً ہی کیف (وجد) کے لیے، اور محبوبہ کی طرح نصیحت دینے کے لیے ہوتی ہے۔''

ممٹ کے ان الفاظ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ادب کے ذریعہ زندگی کی تمام کارآمد چیزوں کا احاطہ کرلیتا ہے۔ اس نے ادب کو سماج اور زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہاں پر ممٹ نے کاویہ یعنی شاعری کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے صرف شاعری مراد نہیں۔ قدیم زمانے میں ادب کے لیے شاعری ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ ادب کی ابتدا شاعری ہی سے ہوئی، اسی لیے ادب کے مطالعے کے لیے شعریات یا (Poetics) کی اصطلاح وضع کی گئی، جس کے ذریعے ادب کی رنگین، وسیع اور تہہ در تہہ دنیا تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے جو علامتوں، استعاروں، اشاروں اور کنایوں میں چھپی ہوتی ہے۔ قاضی افضال حسین نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''........ادب فرد کی انفرادی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے، اس لیے ادب پڑھنا یا پڑھانا فرد کی یکتائی پر اصرار کے مترادف ہے۔''[1]

یہ صحیح ہے کہ ادب انفرادی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے لیکن تخلیق کے بعد کسی فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے دائرۂ اثر میں کرۂ ارض کا وہ تمام حصہ آجاتا ہے جہاں تک اس ادب کی زبان کو بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ادب کا دائرۂ کار بہت زیادہ وسیع ہوجاتا ہے۔ ادب کو بعض لوگوں نے ''زندگی کا آئینہ یا پرتو'' قرار دیا ہے،

---

[1] جمہوریت میں ادب کا نصاب (اُردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۱

اس لیے کہ ادب کا موضوع انسان، اس کے جذبات، تجربات اور احساسات ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا موضوع ہی انسان اور انسانی زندگی ہے تو لامحالہ اس میں وہی تصویریں نظر آئیں گی جن کا تعلق ہماری زندگی سے ہے خواہ وہ زندگی کے خوشگوار پہلو کو پیش کرے یا ناخوشگوار، اطہر پرویز نے لکھا ہے:

"ادب انسانی تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ انسان دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، جو تجربے حاصل کرتا ہے، جو سوچتا سمجھتا ہے اس کے ردِ عمل کا اظہار ادب کی شکل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب زندگی کے وسیع ترین مسائل کا احاطہ کرتا ہے اور اس کے ذریعہ پروان چڑھتا ہے۔"[1]

ظاہر ہے، جب ادب میں ہمیں اپنے مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے تو ادب سے ہماری دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے، ادب میں موجود اعلیٰ قدریں ہمارے شعور و احساس کو متاثر کرتی ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر، نفس و احساس پر چڑھی کثافت کی پرتوں کا تزکیہ ادب کرتا ہے۔ ادب ایک خاص اثر ہمارے ذہن و فکر پر ڈالتا ہے۔ ادب لطیف سے ہم اعلیٰ قدروں سے روشناس ہوتے ہیں۔ قاضی افضال حسین نے لکھا ہے:

"ادب اچھا انسان بنانے میں معاون ہوتا ہے۔"[2]

"اُردو کے تمام شعرا کی شاعری کا عاشق وہ شخص ہے جو انسان کی اعلیٰ بشری صفات سے مزین ہے، اپنے جیسے دوسرے شخص سے محبت، وفاداری، احترام آدمیت اور ایسی دنیا کا تصوّر جو محبت اور اخوت سے لبریز ہے، ہماری عشقیہ شاعری کے بنیادی مقدمات ہیں.........
اُردو کی عشقیہ شاعری میں ایثار، وفاشعاری اور جاں نثاری، بنیادی قدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ شاعری پڑھنا اپنے لیے اقدار کی کائنات کی وہ کائنات کھولنا ہے جو مادّی اور کاروباری رشتوں سے بے نیاز اور آدمیت کے افضل ترین مرتبہ پر فائز ہے۔"[3]

1۔ ادب کا مطالعہ۔ اطہر پرویز (ادب کیا ہے، ص ۳۲، ایڈیشن ۲۰۰۶)
2۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ص ۵، جنوری ۲۰۰۷ء
3۔ جمہوریت میں ادب کا نصاب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ص ۱، جنوری ۲۰۰۷ء)

اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب سے انسانی ذہن و روح دونوں کی تسکین ہوتی ہے۔ انسانی ذہن ہمیشہ سے ذہنی اور روحانی سکون کا متلاشی رہا ہے۔ ہم مادی زندگی کی آسایشوں سے گھبرا کر کسی ایسے گوشے کی تلاش کرتے ہیں جہاں ہماری روح کو تسکین مل سکے۔ ادب روحانی آسودگی کا ذریعہ ہے۔ آج یہ سوال بہت تیزی سے اُبھر رہا ہے کہ آخر ادب کا کیا فائدہ ہے؟ ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟ جب سائنس ہمیں اتنا کچھ دے رہی ہے تو ہم ادب کی طرف کیوں جائیں، اس لیے کہ سائنس سے ہمیں بہت فائدے ہیں۔ خود ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ آپ ادب پر تحقیق کیوں کرتی ہیں؟ سائنس اور ٹکنالوجی پر کیجیے کہ کچھ فائدہ ہو۔ لیکن شاید ڈاکٹر صاحب یہ بھول گئے کہ وہ ایک مشین نہیں ہیں، انسان ہیں۔ انسان جس میں جذبات و احساسات ہوتے ہیں، جو اپنے اندر ایک دھڑکتا دل رکھتا ہے، اسے صرف مشینی ترقی کی نہیں بلکہ محبت و مروّت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیشہ دماغ سے کام نہیں کرتا، اس کا دل اسے زندگی کی رنگینیوں اور رونقوں کی طرف کھینچتا ہے۔ زندگی کی یہ رونقیں، یہ خوشبوئیں، یہ گہما گہمی کس کے دم سے ہے، یقیناً ادب سے۔ اگر ادب نہ ہوتو، ہماری زندگی سے یہ رنگ غائب ہو جائیں، پھولوں کی خوشبو، چڑیوں کا چہکنا، ان کا نغمے گانا، ہمارا محبت کرنا، دوسروں کے لیے قربانی دے کر خوشی حاصل کرنا، یہ سب کیا سائنس میں مل سکتا ہے؟ غرض زندگی کا کوئی پہلو اور انسانی جذبات و محسوسات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو ادب میں نہ مل جاتا ہو۔ وہ شدید مایوسی کے عالم میں ہماری ہمت بڑھاتا ہے، ہمیں مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت دیتا ہے اور بڑی سے بڑی بات کو یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اور یہی ادب ہمیں غم کو انگیز کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے:

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ادب ہمیں زندگی کی بڑی سے بڑی جدوجہد کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ہم نے اپنی غلامی کی اتنی بڑی لڑائی اسی ادب کے سہارے لڑی، انقلاب کا خواب ادب ہی کے ذریعے دیکھا:

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

یہاں پر اشعار دینا مقصود نہیں ہے، لیکن ایسے نہ جانے کتنے اشعار ہیں جو ہمارے جذبات کو تسکین دیتے ہیں، خوشی فراہم کرتے ہیں، حالات سے مقابلہ کرنے کی طاقت دیتے ہیں یا کتھارس یعنی جذبات کی تطہیر کا کام انجام دیتے ہیں۔ ادب کی اس طرح کی مثالیں نثری ادب اور فکشن سے بھی دی جا سکتی ہیں۔ فکشن تو زندگی کا رزمیہ ہے اس لیے زندگی کے سارے نشیب و فراز اور زندگی کی ہر تصویر خواہ وہ دلکش اور خوب صورت ہو یا کریہہ، ہمارے افسانوں اور ناولوں میں نظر آ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب ادب آئینہ بن جائے اور ہمیں اپنی زندگی کی تصویریں سامنے دکھائی دینے لگیں تو اس سے زیادہ بہتر پڑھنے کی اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔

●

ڈاکٹر حمیرا محمود آفریدی

اگر میں ادب پڑھنے کے اپنے ذاتی اسباب بیان کروں تو پہلی بات یہی ہے کہ بچپن میں کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ پریوں کی کہانیاں، جہاں کیک پیسٹری سے سڑکیں بنائی جاتی تھیں۔ پودوں میں ٹافیاں لٹکتی تھیں، مکانوں کی چھتیں چاکلیٹ Cubes سے بنائی جاتی تھیں اور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ غباروں میں بیٹھ کر جاتے تھے۔

وہاں ایلس تھی، سنڈریلا اور اسنو وہائٹ تھیں، Gratel اور Hansel تھے، گویا ہنگامے تھے، حسن تھا، حرارت تھی، حیرتیں اور حسرتیں بھی تھیں۔ سوتیلی مائیں تھیں جو زندگی کی ہولناکیوں سے آشنا کراتی تھیں۔ نیکی اور بدی کا تصادم تھا لیکن آخر کار حق کی فتح تھی۔ ریڈ رائڈنگ ہڈ جب سیدھے راستے پر چلتی تھی تو بالآخر کامیابی اس کا نصیب ہوتی تھی۔

ان کہانیوں کو سنتے سنتے میں تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا میں چلی جاتی تھی جو صرف میری ہوتی تھی۔ میری مرضی کے کردار، جو میری مرضی سے حرکت کرتے تھے۔ میں جب جب اور جب تک چاہتی ان کے ساتھ وقت بتاتی تھی۔ آہستہ آہستہ کہانیاں سنانے والوں نے کہانیوں کو پڑھنے کی جانب راغب کیا اور یوں جب دل چاہتا میں اپنی ذاتی دنیا تخلیق کر لیتی تھی۔

طالب علمی کے دور میں ایم اے تک آتے آتے مختلف اصناف کے ادب پارے پڑھنے کا موقع مل گیا ،اور اچھے ادب پاروں، خاص طور سے نئے پرانے ادیبوں کی کہانیوں نے میرے ادب کے مطالعہ کو پہلے انتہائی شوق اور پھر نشہ میں تبدیل کردیا اور میری مستحکم رائے یہ ہے کہ مجھے ادب پڑھ کر ایک غیر معمولی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت دنیا جو ہمارے چہار طرف پھیلی ہوئی ہے، ہم اس کے چند ہی زاویوں سے تو واقف ہیں ،مگر ادب ہمیں اس کے تمام پہلو اور نیرنگیاں دکھاتا ہے۔ کبھی ادب کا پڑھنا مختلف Moods کے تابع ہوتا ہے اور کبھی ادب ہمارے Moods کو تبدیل کرتا ہے۔ کبھی کہانیاں ہمیں متاثر کرتی ہیں تو کبھی ڈرامہ ہمیں اپنی طرف راغب کرتا ہے اور کبھی شاعری پڑھ کر بہت محظوظ و متاثر ہوتے ہیں۔

ہم ادب اس لئے بھی پڑھتے ہیں کہ یہ براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر مختلف علوم وفنون کی روح ہمارے جسم میں داخل کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا خزانہ ہے جس میں فلسفہ، سیاست، سائنس ،معاشیات ،نفسیات ،تاریخ ،گویا زندگی کے ہر پہلو اور ہر علم کو پیش کردیا جاتا ہے۔ ادب انسان کے تجربات کو پیش کرتا ہے۔ یہ تہذیبوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ جنگ کی ہولناکی اور امن کی دلکشی بیان کرتا ہے، غرض وہ سب چیزیں پیش کرتا ہے جو انسانی جذبات کو اپیل کرتی ہیں اور روشنی عطا کرتی ہیں۔ ادب تو سلسلۂ روز و شب کی پیش کش کا بھی وسیلہ ہے، یہ ایک آئینہ بھی ہے، جو ہمیں، ہمارے اپنے اور سوسائٹی کے دیگر افراد کے چہرے دکھاتا ہے۔ ادب آنے والی نسلوں کے لیے ہمارے تجربات کا Store house بھی ہے۔

سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور انسانی اقدار کے بدلتے رویوں سے ہم بہت کچھ ادب کے ذریعہ ہی واقف ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند کا المیہ ہمارے لیے محض سماجیات ،سیاسیات اور تاریخ کی کتابوں کے اعداد وشمار اور اٹلس کے نقشوں پر منحصر ہوتا اگر ہم نے لاجونتی ،آنگن اور A.Train to Pakistan نہ پڑھی ہوتیں۔ دلت ادب، نسائی ادب اور اسی طرح ادب کی دیگر اقسام ہمیں تمام انسانی طبقات کے حقیقی

جذبات واحوال سے واقف کراتی ہیں۔ ادب ہمیں ہماری مختلف الجہات خامیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے اور یہ نکتہ ایک باشعور اور حساس انسان کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا، ادب بہت سے بلند دماغ اور وسیع مشاہدہ رکھنے والے افراد کے تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ مٹی میں بیج تو اکثر بوئے جاتے ہیں لیکن رسکن بونڈ کے چیری ٹری(The Cherry Tree) کا کلّہ پھوٹتا ہے تو راکی ہمیں احساس دلاتا ہے کہ تخلیق اپنے خالق کے لیے کتنی مسرتیں لاتی ہے۔ کارمن ہمیں یاد دلاتی رہتی ہے کہ انسان جب محبت کرتا ہے تو کتنا بھروسہ، کتنا اعتبار کرنے لگتا ہے۔ وہ نک سے اسی قدر محبت کرتی ہے جتنی ہم اپنے خدا سے کرتے ہیں۔

ہم ادب اس لئے بھی پڑھتے ہیں کہ اس سے ہمیں مسرت کے ساتھ بصیرت بھی ملتی ہے، اس کے مطالعہ کی وجہ سے ہم زندگی کے رموز سے آشنا ہوتے ہیں۔ ادب ہمارے جذبات کو متاثر کرتا ہے، ان کی ترسیل کرتا ہے۔ ہم ادب پڑھتے ہیں کیوں کہ ادب کا حسن ہمیں مسحور کرتا ہے، کبھی ہم ادب تخلیق کرتے ہیں، کیوں کہ ہم اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتے ہیں اور کبھی ہم خود ادب پڑھتے ہیں کیوں کہ ہمیں دوسروں کے تجربات میں حصہ دار بننا اچھا لگتا ہے۔

ادب ہماری مہم پسندی کے شوق کو مہمیز کرتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو کلاسیکی ادب ہمیں قدیم تہذیبوں اور گذرے ہوئے ادوار کے مزاج سے واقف کراتا ہے۔ ادب پارہ بعض اوقات ٹائم مشین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ادب کبھی طنز و مزاح کا سہارا لیتا ہے۔ کبھی سنجیدہ گفتگو کرتا ہے۔ کبھی دل و دماغ کو خوشی سے شاد کرتا ہے، تو کبھی کبھی ہمیں رنج میں بھی مبتلا کر کے تطہیر کے عمل سے گذارتا ہے۔ ادب کبھی زندگی کی تلخی اور کرب کی آنچ سے آشنا کرتا ہے، تو کبھی دکھوں کی حدّت پر محبت بھرے ہاتھوں سے خنک پانی کے چھینٹے دیتا ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم اعلیٰ درجہ کی زندگی جینا چاہتے ہیں اور اس کا عمدہ وسیلہ ادب ہی نظر آتا ہے۔

●

ڈاکٹر سلطان احمد

ادب کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک زبان و ادب کے ارتقائی صورت حال اور مختلف ادبی رجحانات کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کرلیا جائے۔ میرے نزدیک ادب وہ آئینہ ہے جس میں اس کے لکھنے والوں کی اجتماعی اور تہذیبی روح کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ادب کے اشتیاق نے مجھے تاریخ زبان کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح مجھے نہ صرف اُردو بلکہ اس کی معاون زبانوں کے آغاز اور ان کے ارتقائی صورت حال سے گراں قدر واقفیت بہم ہوئی۔

دراصل زبان جب ترقی کے منازل طے کرتی ہے اور اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے تو اس کی کوکھ سے تحریری ادب جنم لیتا ہے۔ اُردو ادب بھی اس مفروضے سے مستثنیٰ نہیں۔ جہاں تک ادب کے مطالعہ کے ذاتی اسباب کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ توضیح کہ ادب کے مطالعہ سے میں نہ صرف ادب کے مختلف ادوار، منفرد اصناف، رجحانات اور نظریات سے متعارف ہوا بلکہ ادیبوں اور شاعروں کی گراں قدر تخلیقات کے توسط سے ان کے افکار و نظریات اور تجربات و مشاہدات سے بھی استفادہ کا موقع میسر ہوا۔ تاریخ ادب کے سنجیدہ مطالعہ سے عہد بہ عہد اخلاقی، اصلاحی، سماجی، سیاسی، معاشی، لسانی اور ادبی صورت حال سے واقفیت بہم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُردو ادب میں رائج مختلف اصناف کے تاریخی پس منظر کے مطالعہ سے مجھے اس کی معاون زبانوں کے ادبی رجحانات، نظریات اور تصورات سے حسب توفیق متعارف ہونے کا موقع ملا۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اگر میں نے قصیدہ اور اس کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا تو زمانۂ جاہلیت اور مابعد تہذیب وتمدن اور لسانی و ادبی منظرنامے سے یقینی طور پر ناواقف ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ قصیدہ کے مطالعہ سے بطور خاص مغلیہ حکومت، شاہان دکن اور شاہان اودھ کی تاریخ، تہذیب، جاہ و تمکنت اور ان کی ادب پروری و ادب نوازی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح میں نے غزل کے عہد بہ عہد ارتقا کا مطالعہ کیا تو مجھے ایران کی تہذیبی و ادبی صورت حال اور وہاں کے شعرا کی تخلیقات سے واقفیت ہوئی۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ اُردو مرثیہ کے مطالعہ سے صنف مرثیہ کی ادبی وفنی خوبیوں کے شعور کے ساتھ ساتھ اس کا تاریخی پس منظر، اہم شعرا، اہل بیت اور معرکۂ کربلا کے واقعات سے تعارف کا موقع میسّر ہوا۔ بعد کے دنوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''شہید اعظم'' کے مطالعہ سے واقعاتِ کربلا سے متعلق بعض حیرت انگیز انکشافات ہوئے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ فنونِ لطیفہ بطور خاص داستان ادب کے مطالعہ سے نسل انسانی کے ارتقا کی موہوم تاریخ، تہذیب، رسوم، روایات، توہمات، مافوق الفطرت واقعات، قدیم قصوں، کہانیوں نیز نثری ادب کے آغاز وارتقا سے واقفیت بہم ہوئی۔

اُردو ادب کے مطالعہ سے یہ بات بھی روشن ہوتی ہے کہ ادب ماضی بھی ہوتا ہے، حال بھی اور مستقبل بھی۔ بہ الفاظ دیگر فی زمانہ ادب آپ اپنے میں ماضی، حال اور مستقبل کا امانت دار بھی ہوتا ہے اور آئینہ دار بھی اور یہ بات صرف اور صرف ادب کے دائرۂ اختیار میں آتی ہے۔ آج ہم ماضی کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو محض اس لیے نہیں کہ ہمیں ادب کے تاریخی سرمایہ سے واقفیت بہم ہوتی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ہماری تہذیب وتمدن اور عظمت رفتہ کا محرم راز بھی ہے۔ ادباء سلف نے جن مسائل، واقعات، حادثات اور معاملات کو بطور موضوع کے اختیار کیا ہے اور ان سے متعلق اپنے خیالات، جذبات اور تصورات کو ادبی صورت دی ہے وہ سبھی ہمارے اپنے معلوم

ہوتے ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں ذہنی، قلبی اور فکری ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا اگر ہم سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو قدیم ادب ہمیں اپنا ہم عصر بنانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتا۔ اور ایسی صورت میں وہ ہمارا اس سے زیادہ اپنا ہو جاتا ہے جتنا ہم توقع کرتے ہیں۔

ادب کی توضیح میں یہ بات کہی اور سُنی جاتی ہے کہ وہ ہم عصر حالات ور جحانات کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ کی اخلاقی و تہذیبی صورت حال، ہماری سیاست و معیشت اور دیگر تمام مسائل جو ہماری روز مرّہ زندگی کا پرتو اور حصہ ہیں لیکن گونا گوں مصروفیات کے سبب ہماری توجہ ان کی طرف نہیں ہوتی، ادیب ان سبھی مسائل اور موضوعات کو مختلف پیرائے میں کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور جذباتی و نفسیاتی طور پر ہمیں ان سے وابستگی کا احساس ہوتا ہے، گویا ادیب کی نظر ہم عصر حالات اور واقعات پر ہوتی ہے اور اس کا ہاتھ اپنے قاری کی نفسیات پر۔

ادب کا مطالعہ کرتے وقت جہاں مجھے لذّت و مسرّت کا احساس ہوتا ہے وہیں بسا اوقات اضطراب و انتشار سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ادب میں جہاں حسن و عشق، جلال و جمال، لطف و کرم، خوشی و شادمانی اور ظرافت و لطافت کا ذکر ہوتا ہے، ہم ذہنی اور قلبی سطح پر ان کیفیات سے خود کو ہم آہنگ اور جہاں کرب و الم، دکھ درد، غم و اندوہ اور مسائل و مصائب کا تذکرہ ہوتا ہے تو ایسے بہت سے معاملات میں ہم خود کو ادیب کا شریک پاتے ہیں اور اُس کی آپ بیتی ہماری اپنی آپ بیتی محسوس ہونے لگتی ہے۔

عصری علوم بالخصوص سائنسی تحقیقات اور نت نئی ایجادات نے جہاں ہمارے لیے بے اندازہ سہولتیں اور آسانیاں مہیا کی ہیں وہی بہت سی دشواریاں اور مشکلیں پیدا کردی ہیں اور نسل انسانی ان ہی متضاد صورت حال میں غلطاں و پیچاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فی زمانہ انسان کے دائرۂ کار میں وسعت اور مصروفیت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے

جس کے باعث اسے ہر لمحہ وقت کی تنگ دامانی کا احساس غالب ہے۔ بھیڑ بھاڑ، بھاگ دوڑ، انتشار و اضطراب اور افراط و تفریط کی اس زندگی میں جب کبھی کم ہمتی، بے بسی، بے کسی، ناکامی، نامرادی، بے یقینی، نا اُمیدی، پژمردگی، شکست خوردگی، بے وفائی، ناقدری، کم نصیبی اور نارسائی جیسے مایوس کن حالات کا احساس ہوتا ہے ادب کا مطالعہ اس طرح کی تمام کیفیات کا جرأت مندانہ مقابلہ کرنے اور خسروانہ وار معرکہ سر کرنے کا درس دیتا ہے۔

فوقیت و فضیلت، جاہ و تمکنت، غرور و نخوت، فخر و مباہات، ظلم و تشدد، عناد و دشمنی، فسق و فجور، ذلالت و رزالت، بے ایمانی و بے حیائی، فحش کلامی و فحش بیانی، بدگوئی و دروغ گوئی، بدمزاجی و بدخواہی، ناقدری و احسان فراموشی، بے اعتدالی و ناانصافی اور ناشناسی و ناسپاسی یہ وہ اوصاف قبیحہ ہیں جو انسانی فطرت کا ناقابل تردید حصہ ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ ادب کا مطالعہ بھی ان تمام کی نفی کرتا ہے، ان سے بچنے کی بالواسطہ رغبت دلاتا ہے اور باشعور قاری کو متنبہ کرتا ہے کہ۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اس طرح ادب کا مطالعہ میرے نزدیک اپنی شناخت اور باطن کی کثافتوں سے پاک ہونے کا عمل بھی ہے۔

●

ڈاکٹر علی عمران عثمانی

اپنے ادب پڑھنے کے اسباب بیان کرنے سے قبل ادب کے بارے میں اپنی فہم اور اپنے مطالعۂ ادب کے محرکات سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

زبان افراد کے درمیان اظہارِ خیال کا وسیلہ ہوتی ہے، جب کہ ادب میں جذبات اور افکار و خیالات مؤثر، خوب صورت اور لطیف انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ادب کے لیے زبان بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان کی بنیادی اکائی، لفظ ہے۔ فن کار کے ذریعہ استعمال کیے جانے والے الفاظ کے حسین و پُرکشش جوڑ اور بندش و ترکیب کا نام اسلوب یا پیش کش کا طریقہ یا اندازِ بیان ہے۔ لہٰذا زبان کے ذریعہ خیالات کی پیش کش جس قدر موثر اور حسین ہوگی، ادب بھی اسی قدر معیاری ہوتا جائے گا۔ یہ بحث اگر چہ قدیم ہو چکی ہے اور اب ان اصطلاحات میں گفتگو بھی نہیں کی جاتی ہے کہ ادب میں مواد اہم ہے یا اندازِ بیان۔ علمائے مشرق نے مواد کے مقابلے میں اسلوب کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ابن خلدون اور قدامہ ابن جعفر کے مشہور اقوال اس کے مظہر ہیں۔ ابتدائی دور کے اُردو ادیب اور شاعروں نے بھی انہی مشرق اصولوں کی اتباع کی۔ چنانچہ شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے آتش نے فرمایا تھا:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

میر انیس اگر ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ: ع　لفظ بھی چست ہو مضموں بھی اعلیٰ ہووے

تو دوسری جانب وہ یہ بھی فرماتے ہیں:　ع　اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اُردو ادب کے مشاہیر نے مواد یا موضوع کی اہمیت کو نظر انداز کیا ہے۔ دراصل فنونِ لطیفہ کے تعیّنِ قدر اور تحسین کے عمل میں اسلوبِ ادا کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دی گئی، چاہے وہ ادب ہو یا مصوری، بت تراشی ہو یا موسیقی۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی عمل کے دوران اسلوب ذریعہ ہے، جب کہ موضوع اس کا مقصد ہے۔ اسلوب بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ یہ مقصد کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور مقصد ہے ابلاغِ خیال۔ چنانچہ مقصد ہمیشہ ذریعہ سے افضل ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر علمائے غرب نے مواد یا موضوع کو زیادہ اہمیت دی۔ اس کے باوجود بھی ہر دور کے علماء اس بات پر متفق رہے کہ اسلوب کو دلکش، موثر اور لطیف ہونا چاہیے، تبھی قاری ادب سے مسرّت اور بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔

چوں کہ ادب اور شاعری میں انسانی جذبات و احساسات کا انعکاس ہوتا ہے، اس لیے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جب تک انسان کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل موجود رہے گا، اس وقت تک ادب کو بھی مقبولیت حاصل رہے گی۔ لیکن اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قاری کے اندر بھی ادب کا ذوق اور تفہیم کی صلاحیت موجود ہو، اور اس کا ذہن تربیت یافتہ ہو۔ اگر قاری کی تفہیم کا معیار بلند نہیں ہوگا تو مشاہیر کے ادب پاروں سے وہ خاطر خواہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور دیگر فکشن نگاروں کی تخلیقات سے مستفید ہونے کے لیے قاری کا زیادہ تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔

قدیم دور میں ادب کی تخلیق کا مقصد تطہیر اور تزکیۂ نفس ہوتا تھا، جیسا کہ ارسطو نے وضاحت کی تھی۔ سنسکرت علماء کے نزدیک ادب کے کئی مقاصد تھے اور ان مقاصد کا تعلق ''رس'' یا جذبے سے ہوتا تھا۔ جس ادب پارے میں جو جذبہ غالب ہوتا، قاری یا ناظر اسے پڑھ کر یا دیکھ کر اسی جذبے کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ لہٰذا ان کے سامنے ادب کا مقصد جذبات کی تسکین تھا۔ میں نے بھی ادب کے مطالعہ کے دوران ذاتی طور پر یہی محسوس کیا ہے اور تب سے میرے ادب پڑھنے کا بھی ایک سبب یہ ہے۔ میں ادب

اس وجہ سے بھی پڑھتا ہوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ عالمی ادب کے ذریعہ دنیا بھر کے لوگوں کے خیالات اور تہذیب کو جانا جا سکتا ہے، اور مجھے واقعتاً اس سے فائدہ پہنچا ہے۔ چوں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اس لیے اس میں ہم خود اپنی تصویر بھی دیکھتے ہیں اور تمام دنیا کی تہذیب وثقافت اور انسانوں کی فطرت و کردار کے بارے میں واقف ہو جاتے ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ ادب کا مطالعہ لطف اندوزی کے لیے کرتے ہیں، ان میں، میں بھی شامل ہوں۔ ادب میں مختلف دانشوروں اور بلند پایہ لوگوں کے افکار سامنے آتے ہیں، اس لیے واقعہ یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی میں ادب پڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں ادب کی تنقید اور تحسین کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔ مطالعۂ ادب انسان کے تخیل کو تحریک دے کر اس کی تربیت بھی کرتا ہے۔ میرے ادب کے مطالعہ کے دوران عموماً اسی قسم کے مقاصد پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ مختلف اوقات میں قاری کے سامنے الگ الگ مقاصد ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں، یا بیک وقت کئی مقاصد بھی پیشِ نظر ہو سکتے ہیں۔

ادب پڑھنا ہماری ضرورت بھی ہے۔ ہمیں چوں کہ مختلف سطحوں پر ادب پڑھانا ہوتا ہے، اس کے لیے، بہت کچھ پڑھنا ہوتا ہے، مثلاً ادبی اصناف، ہر صنف کے نمائندہ فن کار، ہر فن کار کے نمائندہ نمونے۔ ایک استاد صرف نمائندہ نمونوں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ متعلقہ تمام فن پاروں کو بالاستیعاب پڑھتا ہے۔ لہٰذا بیش تر اوقات میرے ادب کے مطالعہ کا یہی محرک رہا ہے۔ ایم.اے اور ریسرچ کے زمانہ سے متواتر پڑھتے رہنے سے ادب کا باقاعدہ شوق پیدا ہو گیا تھا اور حسبِ استعداد ذوق بھی۔ ان معنی میں ادب پڑھنا میری اور میرے ذوق وشوق کی مجبوری بھی ہو گئی۔ اسے بیماری اور عشق کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

کچھ خوش نصیب طالب علموں کو اچھے اساتذہ مل جاتے ہیں اور وہ ان کے اندر ادب کا شوق پیدا کر دیتے ہیں۔ میرا خود اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ بی.اے سے پہلے مجھے اس میدان سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، لیکن مجھے کچھ اساتذہ ایسے ملے،

جنھوں نے میرے اندر ادب کے تئیں رغبت اور شوق پیدا کر دیا۔ خدا کا شکر ہے، ان میں سے بعض اس وقت بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، اور بعض اس جہانِ فانی سے کوچ فرما چکے۔ ادب کا ذوق و شوق ہمارے اندر کس طرح پیدا ہوتا ہے اور ہمیں یہ کس انداز سے مطالعہ کے لیے آمادہ کرتا ہے، یہاں اس کی صرف ایک ادنیٰ مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب ایم۔ اے کی کلاسیز کے دوران مجھے عالمی ادب پڑھایا گیا تو استادِ محترم پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے، خدا اُن کو غریقِ رحمت کرے، میرے اندر ایسی طلب پیدا کردی کہ میں کالی داس کا ڈرامہ شکنتلا، شیکسپیئر کی چاروں ٹریجڈی میکبتھ، اتھیلو، ہیملیٹ اور کنگ لیر، ملٹن کی دونوں آفاقی تخلیقات پیراڈائیز لاسٹ اور پیراڈائیز ریگین، گوئٹے کی فاؤسٹ اور عربی ادب کا شہ پارہ ''سبعہ معلقہ'' سبھی کچھ پڑھ گیا۔ جب انھوں نے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی پڑھائی اور اس ذیل میں ابنِ عربی اور اقبال کا تذکرہ کیا تو میں نے اسی رو میں اقبال کی جاوید نامہ اور ابنِ عربی کی بھی بعض تخلیقات پڑھ ڈالیں۔ جب انھوں نے یونانی ڈرامے پڑھائے تو مجھے پھر مجبور ہونا پڑا اور میں نے سوفوکلیز، یوریپڈیز اور اریسٹوفینز کی متواتر کئی ٹریجڈیز ختم کر ڈالیں۔ اس طرح میرے اکثر اساتذہ نے میری اسی طرح رہنمائی فرمائی اور اکثر مضامین میں میری تقریباً یہی حالت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تو یاد بھی نہیں کہ میں نے اس عالمِ دیوانگی میں کیا کیا پڑھ ڈالا۔ شاید اسی شوق اور دلچسپی کے سبب میں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے دوران ہی اپنی بنیادی معاشی ضرورتوں کو پسِ پشت ڈال کر بے شمار کتابیں خرید لیں اور ان کا سنجیدہ مطالعہ میرا مشغلہ رہا۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا، آج پڑھنا میری ضرورت سے آگے بڑھ کر مجبوری بھی بن چکا ہے۔

●

ڈاکٹر ناز بیگم

ادب کا ہر طالب علم اس نکتے سے واقف ہے کہ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب یا استعمال جس طرح شاعری میں نظر آتا ہے نثر میں نہیں۔ لیکن میری دلچسپی ادب کے کسی خاص حصے فکشن، نان فکشن یا شاعری تک مخصوص نہیں بلکہ کسی بھی طرح کے واقعات، خیالات، جذبات یا تصوّرات کے خوب صورت بیان سے ہے۔ گویا ادب پڑھنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کسی خیال، جذبے یا تصور کا عمدہ بیان میرے لیے لطف کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ایسا لطف جو دوسرے فنونِ لطیفہ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ ادب میں شاعر یا مصنف کسی واقعے، خیال، جذبے یا تصور سے ہم کو واقف نہیں کراتا بلکہ ہمیں اس کا شریک بناتا ہے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ میں اس طرح کے بیان کے مطالعہ میں ایسی گم ہوئی ہوں کہ مجھے اتنا ہوش ہی نہ رہا کہ کوئی بیان پڑھ رہی ہوں یا خود اُس خیال، تصوّر یا واقعہ کی کردار ہوں۔ اپنے افسانے ''چاند کا سفر'' میں بادلوں کے درمیان جو تخیلاتی سیر کرائی ہے اس کو پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ میں خود اس سفر میں شامل ہوں۔

میں کبھی تو محض حصولِ مسرّت کی خاطر ادب پڑھتی ہوں۔ لیکن یہاں پھر کہنا چاہوں گی کہ یہ مسرّت واقعات و جذبات کے فن کارانہ بیان سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، مرحوم کی یاد میں، امتحان کی تیاری اور سنیما کا عشق، کئی کئی

دفعہ پڑھا۔ ان انشائیوں میں بالترتیب کمزور ارادے، سائیکل کی خستہ حالی اور سویرے دیر سے اُٹھنے کی خراب عادت کا جتنا خوب صورت ظریفانہ بیان کیا گیا ہے اس کو بار بار پڑھنے پر بھی لطف کم نہیں ہوتا۔ یہ زبان و اسلوب ہی ان کی بنیادی خوبی ہے۔ اسی طرح غلام عباس کے افسانے ''آنندی'' میں طوائفوں کا شہر سے رفتہ رفتہ ایک الگ بستی بسانے اور دھیرے دھیرے شہر کی دوکانوں کا وہاں پہنچنے کا جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے بستی بستے ہوئے ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

ادب سے دلچسپی کا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں معمولی بات کا ایسا فن کارانہ بیان ہوتا ہے کہ وہ معمولی نہیں رہ جاتی بلکہ اس میں خاص قسم کی جاذبیت و معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً پطرس بخاری کا انشائیہ ''کتے''۔ ایک ایسا جانور جو ہمارے اردگرد کے ماحول میں رہتا ہے ہم روز دیکھتے ہیں۔ ان کی صفات اور ان کی حرکات و سکنات سے واقف ہیں، ہمیں ان میں لطف و مسرّت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، کراہیت البتہ ہوتی ہے، لیکن کتے کی انھیں صفات و حرکات کا جب پطرس بخاری بیان کرتے ہیں، تو دنیا بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کتے کی کسی صفت کو تبدیل کر کے پیش نہیں کرتے نہ ہی اس کا قصیدہ پڑھتے ہیں۔ مصنف ان خصوصیات کو اپنے تخیل اور مشاہدے کی مدد سے بہترین الفاظ اور بہترین انداز میں پیش کرتا ہے اور ادب کے طالب علم کے لیے نایاب تحفہ خلق کرتا ہے۔

اسی بیان کی دوسری صفت اس کا اپنے قاری کو اپنے ماضی سے جوڑنا ہے یعنی اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافت وغیرہ کا بیان بھی مطالعۂ ادب کا باعث بنتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا علم ہمیں تاریخ کے ذریعہ بھی ہوتا ہے لیکن تاریخ میں اوّل تو محض بادشاہوں، نوابوں اور خاص طبقات کا ذکر ملتا ہے، دوسرے وہ محض اطلاعاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' میں جس طرح تہذیب و معاشرت کا جیتا جاگتا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے ایسا کسی دوسرے علم کے ذریعہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح ''گذشتہ لکھنؤ'' میں عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ کے بادشاہوں کے احوال

اور وہاں کی معاشرت اور تہذیب و شائستگی کو اس کی جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ نشست برخاست کے قانون، سلام، مزاج پُرسی، آدابِ محفل وغیرہ سبھی چیزیں اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح ''فسانۂ آزاد'' میں سرشار نے مصاحب، چوبدار، ملازم، جانور اور پرندوں کا دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ تاریخ میں ہمیں اوّل تو یہ جزئیات نہیں ملتیں، دوم معمولی معمولی چیزوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہے۔ خواص سے لے کر عوام تک اور اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ شے تک اور تہذیب و تمدن کی جزئیات کا بیان ''فسانۂ آزاد'' اور ''گذشتہ لکھنؤ'' پڑھنے پر راغب کرتا ہے۔ زبان کا لطف ان سب پر سوا ہے۔

مطالعۂ ادب سے دلچسپی کا ایک سبب اس میں بشری صفات کی تصویر کشی بھی ہے۔ ادب ہمیشہ انسانوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں فن کار کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں اس لیے نہیں کہ انسان کو اپنی قوتِ گویائی اور عقل کی بنا پر اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے بلکہ اس لیے کہ اس کے اندر خیر اور شر کی تمیز، محبت، ہمدردی، رحم، ضبط اور انصاف ایسی صفات ہیں جن سے اس کو تمام مخلوقات پر شرف حاصل ہے۔ ان اوصاف کے حامل کرداروں سے متعلق تخلیقات کی عمدہ مثال ادب کی کلاسیکی شعری صنف مرثیہ ہے۔ مرثیہ ہو خواہ کوئی دوسری صنف جب بھی ادب میں اُن صفات یا کسی ایک صفت کا نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے تو بے ساختہ ہم اپنے آپ میں اُن اوصاف کی تلاش کرنے لگتے ہیں اور اگر ہم ان کو اپنی زندگی میں نہیں بھی اُتار سکیں تو بہر حال خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ادب میں نئے نئے خیالات و تصورات کی پیش کش بھی ادب سے میری دلچسپی کے اسباب میں شامل ہے۔ بالخصوص شاعری میں ہمیں ایسے خیالات و تصورات پڑھنے کو ملتے ہیں جن کے مطالعے سے ذہن متحیر اور دل باغ باغ ہو جاتا ہے مثلاً غالب کا شعر ہے:

ہوں گرمئ نشاطِ تخیل سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اس میں غالب نے اپنی شاعرانہ عظمت کا جو خیال پیش کیا ہے اس کو پڑھ کر دل سے واہ واہ کی صدا آتی ہے۔ اسی طرح۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اس شعر میں حقیقت کا فلسفیانہ بیان ساحرانہ اثر رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ دنیا میں رونق اور چہل پہل انسان کی زندگی تک محدود ہے لیکن اس فلسفیانہ پہلو پر نظر نہیں پڑتی جس کی جانب غالب نے اشارہ کیا ہے کہ چوں کہ دنیا میں رہنے کا زمانہ بہت قلیل ہے اس لیے انسان زیادہ سرگرمی سے کام کو انجام دیتا ہے گویا اسی لیے یہ رونق ہے۔ ممکن ہے کسی فلسفی نے اس پہلو پر غور بھی کیا ہو لیکن اگر وہ اپنے فلسفے کو تحریر میں لائے گا تو دو مصرعوں میں پورا فلسفہ بیان کرنا ممکن نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے بہت سے صفحات درکار ہوں گے۔ غرض کسی بات کو محض دو مصرعوں میں مؤثر طریقے سے بیان کرنے کی صفت ادب میں صرف غزل کو حاصل ہے ------ ایسی بے شمار مثالیں بلکہ یوں کہیے پوری شاعری اس کے جواز میں پیش کی جاسکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کی کون کون سی خصوصیات میرے لیے دلکشی کا باعث ہیں بتانا مشکل ہے، بس اس میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جس کا پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔

میرے ادب کے مطالعہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ادب کے ذریعہ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے جو ہمارے خیالات، جذبات اور کیفیات کے مؤثر اظہار کا ذریعہ بنتا ہے۔ علاوہ ازیں ہماری زبان کو شیریں، شگفتہ بناتا ہے اور لہجہ نرم کرتا ہے۔ ادب کے بغیر لہجہ نرم ہو یہ فطری طور پر یا دوسرے ذرائع سے ممکن ہے لیکن زبان کی شیرینی ادب اور صرف ادب کی خصوصیت ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ تو بہت وسیع ہے لیکن جب اپنی بات کہنے کا موقع آتا ہے تو لفاظی کرنے کے باوجود بات بنتی نظر نہیں آتی۔ گویا عمدہ عمدہ الفاظ جمع کرنے کے باوجود بات میں تاثیر اور گہرائی پیدا نہیں ہو پاتی۔

بہترین الفاظ کا بہترین استعمال ہمیں ادب سکھاتا ہے۔ نہایت آسان اور معمولی الفاظ کو مناسب وقت اور مناسب جگہ استعمال کرنے کا ہنر پیدا کرتا ہے۔ اور معمولی خیال کو بہترین الفاظ میں منتقل کرنا سکھاتا ہے۔ اسی طرح محاورات، ضرب الامثال، اور معانی اور بیان و بدیع کی تمام نزاکتیں ہمیں ادب کے مطالعہ کے ذریعہ ہی معلوم ہوتی ہیں، یہ ہیں وہ وجوہات جو مجھے ادب کے مطالعہ کی طرف راغب کرتے ہیں۔

محمد شہاب الدین

ادب زندگی کے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کے خوب صورت اظہار کا نام ہے۔ یہ اظہار ذات و کائنات کے حوالے سے ایک خوش گوار اور حیرت انگیز تجربہ اور ایک پُراسرار عمل ہے۔ ایک ادیب یا فن کار اپنی ذات اور کائنات کے مختلف رنگوں کو اپنے اندر سمیٹتا، انھیں جذب کرتا، اپنی شخصیت کا عرق ان رنگوں میں شامل کرتا اور پھر انھیں سجا کر صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ اس طرح ادب کی تخلیق ایک پُراسرار عمل بن جاتا ہے۔ ادب کا مطالعہ بھی اس پُراسرار عمل میں شرکت اور اس میں حصہ داری کی ایک لطیف اور خوب صورت کوشش ہے۔

بحیثیت طالب علم متعلقہ ادب پڑھنا ہماری بنیادی اور لازمی ضرورت ہے۔ اس کے ذریعہ ہم اپنی تحقیقی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ادب پڑھے اور تحقیق کے مزاج کا خیال رکھے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جاسکتا، اور نہ ہی موادِ تحقیق اور نتائجِ تحقیق کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ادب پڑھنا ہم جیسے طالب علموں کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ غذا کا استعمال۔ خود لفظ طالب علم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ فرد جس کے وجود کے ساتھ یہ لاحقہ پایا جاتا ہو، وہ طالب علم ہے، اور علم کی طلب کرتے رہنا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ متعلقہ تحقیقی ادب کے مطالعہ میں پوری دیانت داری پیشِ نظر رہتی ہے، مگر ممکن ہے اس دیانت داری کے پس پشت لاشعور میں کوئی خوف بھی کارفرما ہو،

اور اس طرح میرا تحقیقی سفر شوق اور خوف کے درمیان جاری ہو۔ یہ خوف بھی عجیب چیز ہے کہ انسان کو صراط مستقیم پر گامزن رکھنے میں بہت معاون ہے۔ اس خوف کے پس منظر میں مجھے ان طالب علموں کا واقعہ یاد آتا ہے، جن کا ذکر رشید صاحب نے اپنے ایک انشائیہ میں کیا ہے۔ اگرچہ انشائیہ کے واقعات کو عموماً سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا ہے، لیکن بعض اشاروں میں ایسے بصیرت افروز حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں جو سنجیدہ مضامین پر بھاری ہوتے ہیں۔ اسی لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس واقعہ کا تذکرہ کر دیا جائے۔ قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ کچھ طالب علموں کے پرچۂ امتحان میں اتفاق سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ ساتھ ہی ساتھ واقع تھے، ایسے میں بے چارے طالب علموں کے لیے عصا، قُم بـاِذنـی اور لن ترانی وغیرہ کا کیا استعمال ہوتا؟ چنانچہ چند طالب علموں نے لکھا:

''حضرت عیسیٰؑ ایک پیغمبر تھے، جن کا تخلص قُم باذنی تھا۔''

دوسرے صاحب نے فرمایا:

''عصا ایک پیغمبر تھے، جو اپنی لاٹھی مردوں پر پھیر دیتے تھے تو وہ لن ترانی پڑھنے لگتے تھے، اور حضرت موسیٰؑ کے پاس ایک لاٹھی تھی، جس کا نام ید بیضا تھا۔''[1]

جب ذہن میں اس طرح کے واقعات موجود ہوں تو میرے اندر کسی طرح کے خوف کا پایا جانا خلاف توقع نہیں کہا جا سکتا۔

ادب کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے فیصلے کے سبب بھی ہمارے ادب پڑھنے کی ضرورت میں اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا ادب پڑھتے رہنا، ادب کے قدیم و جدید سرمایہ سے کلّی واقفیت اور اس کے مزاج سے آگاہی ہمارے لیے یوں بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ادب کا مطالعہ ہم سے کمال کا تقاضا کرتا ہے اور ہم کبھی اسے بصد شوق اور کبھی بحالت مجبوری بھی پڑھتے نظر آتے ہیں۔

---

[1] رشید احمد صدیقی: امتحانات، مشمولہ: میزان نثر، مرتبین: مہر الٰہی ندیم، لطیف الزماں خان، کراچی، ج ۲، ص ۲۰۷

قرطاس وقلم سے رشتہ استوار ہونے کے ناطے خیالات واحساسات کے اظہار اور ادب کی ترسیل کے لیے بھی ادب پڑھنا ہماری بنیادی ضرورت ہے۔ ادب کے مطالعے میں تحقیق وتدوین سے اپنی فطری وطبعی مناسبت کے سبب میری یہ کوشش رہتی ہے کہ کسی ایسے موضوع، گوشے یا کسی ایسے پہلو کا سراغ لگ سکے، جو محتاج تحقیق ہو، اور جسے عمدہ تحقیقی محنت کے ذریعہ وجود بخشا جا سکے۔ اسی کے ساتھ اس مطالعے میں میری سعی اس شخص کی سعی کے مماثل بھی ہوتی ہے جو سمندر کی گہرائیوں میں سیپ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں کوئی ایسا دفینہ دریافت ہو سکے، جو گراں قدر ہو، اور جسے تہذیب وتدوین کے زیور سے آراستہ کر کے پیش کیا جا سکے۔

مغرب میں اعلا دانش وری کا ایک خاص تصور یہ رہا ہے کہ:

''عالم کا علم کثیر الجہت ہو، اس کی حکیمانہ بصیرت ہمہ گیر ہو، جو اپنے عہد کے بنیادی ذخیرۂ علم کو محیط ہو۔ سائنسی معروضیت سے تحقیق وتفحص اس کی سرشت کا حصہ ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی تخلیقی سوچ اپنے عہد کے فکری سرمایہ میں اضافہ کر سکے۔''[1]

اس دور طالب علمی میں اس نوع کی باتیں تعلّی کے سوا کچھ نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے اس نوع کے خیالات اور حقائق سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ ادب کے میرے مطالعے کا باعث یہ کوشش بھی ہے کہ ایک قلم کار کی حیثیت سے جو کچھ میں پیش کروں وہ لقمۂ تر نہ ہو، بلکہ اس میں اوریجنلیٹی (Originality) ہو، اور گیرائی اور گہرائی ہو۔ ان مواقع پر میرا ذہن مجھے اس پہلو پر بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا میرے لیے کبھی سرمایۂ ادب میں کوئی اضافہ کرنا ممکن ہے؟

رگِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکم غبارے می نویسم

---

[1] قمر رئیس: نیا سفر، دہلی، دور۔۳، شمارہ۔۵، ص۔۱۱

ادب میرے لیے بھی ذوق جمال کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ پیشہ ورانہ ضروریات کے علاوہ فرصت اور فراغت کے لمحات میں کلاسیکی ادبی سرمایہ کے ساتھ ساتھ جدید تر ادب پڑھنا بذاتِ خود میرے لیے زندگی میں حسن و جمال، رعنائی و نشاط اور کیف و سرور پیدا کرنے کا بہت موزوں اور دل کش ذریعہ ہے۔ اس سے زندگی کی ناہمواریوں، ناخوش گواریوں، تلخیوں، ناآسودگیوں اور محرومیوں کا دائرہ تنگ ہوتا ہے، اور زندگی کیف و جمال سے آشنا ہوتی ہے۔ اگرچہ تہذیب نو نے انسانی زندگی کے مسائل میں بے پناہ اضافہ کیا ہے، اور زندگی فطرت سے دور ہو کر بہت حد تک غیر فطری اور مصنوعی ہو گئی ہے، مگر محسوس ہوتا ہے کہ مطالعۂ ادب بھی زندگی کو فطری اور حقیقی رنگوں اور خوشبوں سے آشنا کرنے کا ایک موزوں اور مؤثر ذریعہ ہے۔

ادب کے میرے مطالعے کا ایک اہم محرک یہ حقیقت بھی ہے کہ ادب مہذب زندگی اور بہتر سماجی اقدار کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ادب کے مختلف پیرایۂ اظہار کے ذریعہ جہاں ایک طرف اپنی شخصیت کی تعمیر اور تہذیب عمل میں آتی ہے، وہیں اس کے ذریعہ سماج تعمیر و تشکیل کے اعلیٰ مراحل بھی طے کرتا ہے۔ مگر اس کے لیے ادب میں مثبت عناصر کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگرچہ غیر تعمیری ادب بھی اپنے اندر تعمیر کے کچھ پہلو رکھتا ہے، اور ادب کے مطالعہ میں اس نوع کے ذخیرے کا مطالعہ ایک ناگزیر حقیقت ہے، مگر زندگی کی حقیقی بنیادوں پر تعمیر و تشکیل کے لیے تعمیری ادب کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس حوالے سے ادب کا مطالعہ میرے لیے خاص کشش اور معنویت رکھتا ہے۔

مجھے بحیثیت جونیر ریسرچ فیلو، شعبہ میں کئی سال تک تدریس کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ چنانچہ اگر اس روشنی میں دیکھا جائے تو یہ ترسیل ادب کے علاوہ خود ذوقِ اظہار اور ذہنی و روحانی تسکین کا بہت موزوں اور مناسب ذریعہ ہے۔ اس ذمہ داری کی باحسن ادائیگی اور طلبہ کی علمی، ذہنی اور فکری نشو و نما کے لیے بھی ادب کا مطالعہ پوری دیانت داری کا متقاضی ہے، اور یہ تقاضا مجھے ادب کے مطالعے کی جانب مائل کرتا رہا ہے۔ لیکن اس اعتراف میں بھی کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا کہ ممکن ہے اس عمل کے نتیجے میں ہم کبھی ادب مجبوراً بھی پڑھتے ہوں اور شاید کبھی جبراً بھی۔ ●

دوروزہ قومی مذاکرہ رپورٹ:- ڈاکٹر راشد انور راشد

شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام آرٹس فیکلٹی لاونج میں ۲۹ر اور ۳۰ر مارچ ۲۰۰۷ء کو دوروزہ قومی مذاکرہ ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں؟'' کا انعقاد عمل میں آیا۔ افتتاحی اجلاس ۲۹ر مارچ کو دن کے گیارہ بجے شروع ہوا، جس کی صدارت موجودہ عہد کے ممتاز فکشن رائٹر جوگندر پال نے فرمائی، جبکہ کلیدی مقالہ پروفیسر شمیم حنفی نے پیش کیا۔ شعبۂ اُردو کے سنیئر استاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اس افتتاحی اجلاس کا خصوصی مقالہ پیش کیا، جب کہ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر کے .ایم مشرا نے خصوصی خطبہ کے تحت اپنے گراں قدر خیالات ظاہر کیے۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اُردو کے استاد اور مذاکرہ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر سیّد محمد ہاشم نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔

حسبِ روایت پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پروفیسر سیّد محمد ہاشم نے دوروزہ قومی مذاکرے کے انعقاد سے متعلق کہا کہ روایتی موضوعات سے الگ ہٹ کر گفتگو کے نئے میلانات کی تلاش ہمیشہ سے ہی پروفیسر قاضی افضال حسین کے پیشِ نظر رہی ہے، جس کی بنا پر وہ ایسے سیمینار اور مذاکرے منعقد کرانے میں کامیاب رہے، جن کی جانب کسی اور نے سوچنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ موجودہ مذاکرے کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

صدر شعبۂ اُردو پروفیسر افضال نے اپنی مدلل اور موثر گفتگو کے دوران، مذاکرے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بظاہر یہ موضوع ''ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں'' جتنا سیدھا سادہ اور سامنے کا معلوم ہوتا ہے، اس کا جواب اسی قدر پیچیدہ اور مشکل ہے۔ زندگی میں ہم بہت سی چیزوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، لیکن اسباب بیان کرنے کے سلسلے میں ہمیں بے حد دشواری پیش آتی ہے۔ ادب کے مطالعے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم بھی ادب کا مطالعہ ذوق و شوق سے کرتے ہیں، لیکن کیوں کرتے ہیں، اس کا جواب دینا خود ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے۔ پروفیسر افضال نے کہا کہ ہم میں سے بیش تر لوگ احساسِ جمال اور احساسِ ذوق کی تسکین کے لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم ادب اس لیے پڑھتے ہیں کہ ادب بشر دوستی کی علامت ہے۔ اس کے ذریعے ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔ ادب کا مطالعہ ہمیں دیکھی ہوئی دنیاؤں کو از سر نو دیکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم ادب اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس کی بدولت خود ہماری اپنی فضیلت کے اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔ ہم اہم مسئلوں پر سوالیہ نشان قائم کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے عہد میں ادب کے ذریعے ہی ہم انسان ہونے کا وقار بحال رکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ہماری دانش گاہوں میں ادب کو ثانوی حیثیت دی جانے لگی ہے اور اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہمارے وژن میں اضافہ نہ ہو بلکہ ہم اسکلڈ ورکر بن کر رہ جائیں۔ ایسے نازک دور میں ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری آنے والی زندگی میں انسانیت کی خوش گوار قدریں کس طرح باقی رہ سکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا مطالعہ ہی ہمیں یہ شعور بخشتا ہے کہ ہم اپنے اندر جھانکنے کی زحمت کریں، اپنا محاسبہ کرنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اس دو روزہ قومی مذاکرے میں جہاں شعبۂ اُردو کے تمام اساتذہ، مطالعۂ ادب کے سلسلے میں اپنے افکار و تجربات پیش کریں گے، وہیں نمائندہ ادیبوں کے اچھوتے خیالات سے بھی ہمیں واقف ہونے کا موقع ملے گا۔

مذاکرے کا خصوصی مقالہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''بدمذاقی کا شعور اور ذوقِ سلیم کا لمبا سفر'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اپنے بھرپور مقالے میں انھوں نے مطالعۂ ادب کے ضمن میں اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ متن پڑھنے کا معاملہ میرے نزدیک اپنی شخصیت کی بازیافت کا عمل ہے۔ لکھنے والا جہاں کسی نہ کسی زاویے سے تحریروں میں اپنے حواس ظاہر کرتا ہے وہیں پڑھنے والا بھی پڑھنے کے دوران اپنا محاسبہ آپ کرتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مطالعۂ ادب کے دوران میں نے قدم قدم پر رُک کر سوچنے، غور کرنے اور سوالات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ذوق کی توثیق یا تردید کرنے میں ابتدا سے ہی مطالعۂ ادب نے میری معاونت کی ہے۔ جو لوگ اپنے مطالعے اور ذوق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور ان پر بھروسہ رکھتے ہیں، مجھے ان کی سوچ پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ پروفیسر قاسمی نے کہا کہ مطالعۂ ادب کے سلسلے میں میں نے ہمیشہ متن کے بجائے ماورائے متن تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مثنوی مولانا روم کا بہ طور خاص حوالہ دیا جس کے مطالعے سے حواس ظاہرہ کے ساتھ ذہن کی تطہیر ہوتی ہے۔ فکشن کی بہ نسبت شاعری سے اپنی ذہنی قربت کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انسان ابتدائی عمر میں ادب سے متعلق جن تاثرات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے، اُن میں وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں تبدیلی رونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ جب ادبی شعور بالیدہ ہو جاتا ہے تو ایک سوچتا ہوا ذہن، ذوقِ سلیم پر سوالیہ نشان قائم کرنے لگتا ہے اور یہیں سے ایک نئی فکر جنم لیتی ہے۔ پروفیسر قاسمی نے دیوبند، جامعہ ملیہ اور علی گڑھ کے حوالے سے اپنی تعلیمی سفر کا ذکر کیا جہاں رفتہ رفتہ ان کا ادبی مطالعہ پروان چڑھتا گیا اور پھر علی گڑھ میں مستقل سکونت پذیری نے ادبی ذوق کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے مطالعے کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت کی کہ مختلف تنقیدی نظریات میرے مطالعے کا محور رہے ہیں، لیکن میں نے کسی بھی نظریے کو آنکھ بند کرکے تسلیم نہیں کیا ہے۔ میں ہر طرح کے زاویے سے باخبر رہنا چاہتا ہوں۔ مختلف فکری دھارے ادب میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔

ادب اندر اور باہر سے ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے۔ نئے ادب کو پُرانے زاویے سے اور پُرانے ادب کو نئے زاویے سے دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وقت کے ساتھ مطالعۂ ادب کے معیار تبدیل ہو جاتے ہیں اور میں کسی تنقیدی زاویے کے بغیر ادب پڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایسا کرنا ممکن ہے لیکن پڑھنے کے دوران کہیں نہ کہیں تنقیدی زاویہ شامل ہو جاتا ہے۔ دراصل یہیں پر ایک اچھے اور تربیت یافتہ قاری کی آزمائش ہوتی ہے کہ اس نے متن کو کس طرح پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر قاسمی نے کہا کہ اگر ان کی ساری تنقید کو ایک باذوق قاری کے ردِّعمل کا نام دیا جائے تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ ادب کے حوالے سے میرے لیے ذہنی سرشاری ہی سب سے بہتر اور اہم پناہ گاہ بھی ہے۔

افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ شعبۂ اُردو کے وزیٹنگ پروفیسر شمیم حنفی نے پیش کیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب پڑھنا میرے نزدیک اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ ادب کے ذریعے انسان اپنے آپ سے گفتگو کی سبیل نکالتا ہے، اپنے باطن میں جھانکتا ہے، اپنے آپ کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب جہاں ہمیں تنہا رکھتا ہے وہیں تنہائی سے بچائے بھی رکھتا ہے۔ میں نے ہر ادب پارے کو خواہ وہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو، ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ پروفیسر حنفی نے اس بات پر زور دیا کہ ماقبل کا ادب بھی ہمیں زندگی کے نئے شعور کا زاویہ بخشتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ نوعمری کے زمانے میں انھوں نے آنکھوں کے ساتھ بہت کچھ اپنی سماعت سے بھی پڑھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے حکائی ادب کی مستحکم روایت کا بہ طورِ خاص ذکر کیا اور دیویندر ستیارتھی کی مثال پیش کرتے ہوئے اس بات کو واضح کیا کہ صرف کتابیں ہی نہیں پڑھی جانی چاہئیں کیوں کہ زندگی کو سمجھنے کے بہت سے روپ ہو سکتے ہیں۔ دراصل سارا معاملہ ہمارے رویے کا ہے۔ ہم جس زاویے سے زندگی کو دیکھنے کی کوشش کریں گے، زندگی کی پوشیدہ صورتیں اسی مناسبت سے ہمارے مشاہدے کا حصہ بنیں گی۔ اپنی ذاتی زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے

انھوں نے کہا کہ بزم آرائی نے انھیں کبھی اپنی جانب مائل نہیں کیا، اور یہ سب کچھ ادب کی بعض نادر کتابوں کی رفاقت کی بدولت ممکن ہو پایا۔ کتابوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کوئی بھی وسیلہ کتاب کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ادب خواہ کسی نوعیت کا ہو، اس میں زندگی کی سچائیوں کو بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں نے علاقائی، قومی اور بین الاقوامی ادب کا مطالعہ یکساں دلچسپی کے ساتھ کیا ہے تاکہ میں آفاقیت کے تصور کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کروں۔ پروفیسر حنفی نے اپنے آبائی وطن سلطان پور کی قصباتی اور الہ آباد کی تہذیبی روایتوں کا دل نشیں پیرائے میں ذکر کیا اور بتایا کہ مجھے زندگی کی مادّی آسائشوں نے کبھی متاثر نہیں کیا اور ہمیشہ کتابیں میری ضرورت نہیں بلکہ مجبوری بن کر میری زندگی کا لازمی جزو بنی رہیں۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ موجودہ عہد نے ادب اور آرٹ کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ اب ہمارے صنعت کار ادب کا معیار متعیّن کرتے ہیں۔ لہٰذا انسان خسارے میں ہے، سو ادب بھی خسارے میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کی بدولت آگہی کے دروازے بڑی مشکل سے کھلتے ہیں اور سب کے لیے کبھی نہیں کھلتے۔

آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر کے. ایم. مشرا نے بہ طور خاص طلبا کو اپنی گفتگو میں شریک کیا اور مطالعۂ ادب سے متعلق انوکھے تجربات بیان کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ادب پڑھ کر اندر سے قوت ملتی ہے، دُکھوں سے لڑنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ زندگی کے نازک لمحوں میں جب حوصلے کا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے، صرف ادب کے ذریعے ہم اپنے آپ کو سنبھال پانے کے اہل ہوتے ہیں۔ ادب میں برتے گئے الفاظ سے ہمیں بہت طاقت ملتی ہے، بے پناہ سہارا ملتا ہے۔ پروفیسر مشرا نے اپنے مخصوص انداز میں اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ اگر ہم ادب نہ بھی پڑھیں تو زندگی کے آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری رہے گا، لیکن دنیا کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لیے، انسانیت کی بقا کا جواز فراہم کرنے کے لیے، اندر سے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے بے پناہ قوت ہمیں صرف ادب سے ہی ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سو دو

زیاں سے آزاد ہو کر ہمیں ذہنی تسکین کے لیے ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے، کیوں کہ ادب ہماری زندگی کا ایسا حصّہ ہے جسے ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ پروفیسر مشرا نے اس بات پر زور دیا کہ مطالعۂ ادب کا معاملہ انسان کی صوابدید پر ہوتا ہے، کیوں کہ زبردستی کسی کو ادب نہیں پڑھایا جا سکتا۔ ظلم و زیادتی کے ساتھ نہ ادب لکھا جا سکتا ہے، نہ پڑھا جا سکتا ہے۔ مطالعۂ ادب کا معاملہ تو تپسیا اور سادھنا کا ہے جس میں فائدے نقصان کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا۔

افتتاحی اجلاس کا صدارتی خطبہ ممتاز فکشن رائٹر جوگندر پال نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب میرے نزدیک زندگی کا متبادل ہے، زندگی کے متوازی ہے۔ جس طرح زندگی کے متعلق یہ باتیں بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں کہ زندگی کیا ہے، کیوں ہے، کس طرح اس کا ارتقائی سفر جاری ہے اور کہاں جا کر اس ختم کا خاتمہ ہوگا، بالکل اسی طرح ادب کے متعلق بھی یہ باتیں اپنی معنویت کھو دیتی ہیں کہ ادب کا مقصد کیا ہے، ہم کیوں ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اس سے ہمیں کیا فائدے ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ ادب سے ایک خاص رشتہ محسوس کرتے ہیں، ان کے نزدیک ادب کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہوتا ہے۔ مطالعۂ ادب کا معاملہ ان کے لیے سانس لینے کے عمل کے مترادف ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب پڑھانے کے لیے نہیں لکھا جاتا، صرف پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ ہماری دانش گاہوں میں ادب کی تدریس ایک عرصے سے ہو رہی ہے، اور نئی نسل کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں اس کے خاطر خواہ اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں، لیکن ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ادب پڑھانے کے لیے تخلیق ہی نہیں کیا جاتا۔ زندگی میں مختلف مرحلوں پر ادب ہمیں ذہنی آزمائشوں میں مبتلا رکھتا ہے۔ ہم اپنی فہم اور ذہنی استعداد کے مطابق ادب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اچھا اور بہتر فن پارہ وہ ہوتا ہے جس میں معنی کی مختلف سطحیں موجود ہوں۔ جس طرح زندگی مختلف راہوں کا انتخاب کرتی ہوئی مسلسل آگے کا سفر طے کرتی رہتی ہے اسی طرح ادب میں بھی معنی کی مختلف جہتیں پڑھنے والے پر مسلسل منکشف ہوتی رہتی ہیں۔ جوگندر پال نے مختلف مثالوں کے ذریعے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ اچھے

پڑھنے والوں کی وجہ سے ہی اچھے ادیب پیدا ہوتے ہیں۔ اچھے قارئین کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش میں ادیب بہتر سے بہتر کی راہ پر گامزن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آج اگر ہم یہ شکایت کرتے ہیں کہ اچھا ادب نہیں لکھا جا رہا ہے تو ہمیں اس بات کو بھی پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے کہ سنجیدگی سے ادبی فن پاروں کا مطالعہ کرنے والے لوگ بھی اب نہیں رہ گئے جس کی بنا پر ادب کے معیار کا گراف متاثر ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادیب مرنے کے بعد اگر اپنے پڑھنے والوں کے ذہن میں زندہ ہے تو یہ اس کی تخلیقی قوت کی نمایاں مثال ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے تو جیتے جی ادیب اپنے چاہنے والوں کا کثیر حلقہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی منظر نامہ تبدیل ہونے لگتا ہے اور قلیل مدت میں ہی اس پر جان چھڑکنے والے لوگ اسے بھولنے لگتے ہیں۔ تحریر میں اگر قوت ہو تو وہ اپنا پرستار خود پیدا کر لیتی ہے۔ جوگندر پال نے اس بات پر زور دیا کہ ادب اپنے آپ کو سونپنے کا نام ہے۔ اگر مادّی طور پر ہم ادب سے کچھ حاصل کرنے کے لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا یہ رویّہ کسی اعتبار سے مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب ہم یہ سوچ کر ادب کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ہمیں اس سے کچھ لینا نہیں بلکہ اپنا سب کچھ اس کے لیے سونپ دینا ہے تو زندگی میں خوب صورتی شامل ہو جاتی ہے، ادب کے ذریعے ہمیں یہ آگاہی ہو پاتی ہے کہ زندگی سُکھ دُکھ کا سنگم ہے۔ خوشیوں کے ساتھی تو سبھی ہوتے ہیں، لیکن ادب دراصل غموں کی رفاقت کا ذریعہ ہے۔ جب سبھی لوگوں کا درد ہمیں اپنا درد محسوس ہونے لگے تو زندگی کو ایک مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور یہ شعور صرف ادب پڑھنے کے بعد ہی حاصل ہو پاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تنقید میں مجھے مریضانہ پیشہ وری نظر آتی ہے۔ ادب کی تفہیم کے لیے تنقید کی بیساکھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہر پڑھنے والا اپنے ذہنی استعداد کے مطابق متن سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ایسا کرنے میں وہ پوری طرح حق بہ جانب ہے۔

مذاکرے کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر سیّد محمد ہاشم نے فرداً فرداً تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ حاضرین کی کثیر تعداد اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ افتتاحی اجلاس ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ انھوں نے اُمید ظاہر کی کہ مذاکرے کے آئندہ اجلاس

میں شعبۂ اُردو کے اساتذہ کے علاوہ باہر سے تشریف لائے مہمان تخلیق کار اور قابلِ ذکر نقاد حضرات اپنے پُر مغز خیالات سے دو روزہ قومی مذاکرے کو کارآمد بنانے میں ہر ممکن تعاون دیں گے۔

دوپہر تین بجے اس مذاکرے کا دوسرا اجلاس مشہور ناول نگار پروفیسر قاضی عبدالستار کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر قاضی جمال حسین نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں کل سات مقالے پڑھے گئے۔

پہلا مقالہ ڈاکٹر ریشما پروین نے پیش کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ادب کی تعریف متعیّن کرنے کی کوشش کی، اور اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری اور اطہر پرویز کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مطالعۂ ادب کا معاملہ ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مطالعۂ ادب کے سلسلے میں ذاتی اسباب بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شخصیت کی تعمیر اور ذہن کی تسکین کے لیے میں ادب کا مطالعہ کرتی ہوں۔ زندگی روح کی سرشاری سے عبارت ہے اور اس احساس نے ہمیشہ مجھے ادب کی جانب مائل کیا ہے۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انقلاب کی جدوجہد میں ادب نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔

دوسرا مقالہ راشد انور راشدؔ نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں مطالعۂ ادب سے متعلق اپنے ذاتی اسباب بیان کرتے ہوئے بتایا کہ میں ادب کا مطالعہ اپنے آپ کو از سرِ نو دریافت کرنے کے لیے کرتا ہوں۔ ادب کا مطالعہ مجھے یہ سکھاتا ہے کہ مجھے کس طرح سوچنا چاہیے، کن خوابوں کو آنکھوں میں بسانا چاہیے اور کس طرح انھیں خوب صورت تعبیر سے ہمکنار کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بحیثیت انسان میں اپنی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ادب کے بہترین نمونوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے تطہیرِ نفس کے مرحلے سے گزرنے کی بارہا سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ادب نے ہمیشہ میرے سوئے ہوئے

ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ میرے اندر یہ حوصلہ پیدا کیا ہے کہ ہزار مجبوریوں کے باوجود زندگی سر اُٹھا کر جینے سے عبارت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا مطالعہ میں اپنی ذات کے حوالے سے دنیا کو سمجھنے کے لیے کرتا ہوں۔ بعض افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر میں نے ہمیشہ یہ بات محسوس کی ہے کہ فن پارے میں پیش کی گئی دنیا اور اس کی مختلف جہتیں بہت حد تک دیکھی ہوئی ہونے کے باوجود میری نگاہوں کے تجسس میں اضافہ کر رہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ادب کا مطالعہ مجھے اخلاقی سطح پر بلند ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ معتبر دستاویز کی حیثیت سے میں ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ادب کی حیثیت ایک ایسے سنگم کی ہے جس میں محسوسات کے مختلف دھارے ہمہ وقت شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس خوبی نے مجھے ہمیشہ ہی ادب کی جانب مائل کیا ہے۔

ڈاکٹر خالد سیف اللہ نے تیسرا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ لوگوں کو ادب کیوں پڑھنا چاہیے اور ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں، یہ دونوں سوال اپنی جگہ بے حد اہم ہیں۔ ادب کی اہمیت و افادیت واضح کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ بشری علوم میں سب سے زیادہ اہمیت ادب کو حاصل ہے کیوں کہ اس کا موضوع انسان ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب کا مطالعہ کسی مخصوص نظریے سے نہیں کیا جا سکتا۔ مطالعۂ ادب کے سلسلے میں ذاتی اسباب بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ادب کا مطالعہ میرے نزدیک سادھنا ہے۔ اس سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا اسے واسنا میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ادب کو انھوں نے خود اپنے آپ کو سمجھنے کا بنیادی وسیلہ بتایا اور کہا کہ بچپن میں نصابی ضرورتوں کے تحت ادب کا مطالعہ شروع کیا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ ضرورت مجبوری میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے اپنے مقالے میں ان واقعات پر بھی روشنی ڈالی جن کی بدولت وہ ادب پر پڑھنے کی جانب مائل ہوئے۔

ڈاکٹر خالد جاوید نے اپنے مقالے میں اس بات کی نشان دہی کی کہ جمالیاتی تصور اور تزکیۂ نفس کی خاطر ادب کا مطالعہ میرے لیے بے معنی ہے۔ معاشی مطالبے کی طرح روحانی مطالبے کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور ادب کا مطالعہ میرے لیے روحانی

مطالبہ ہے۔ اپنی روح کو پہچاننے میں زمانہ گزر جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب پڑھنا میرے لیے خود کو دریافت کرنے کا عمل ہے۔ میں بھولے ہوئے خوابوں کو دریافت کرنے کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔ اپنے ضمیر کو جگانے کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔

پیغام آفاقی نے اپنی گفتگو میں مذاکرے کے انوکھے موضوع کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ بے حد اہم موضوع ہے، جس کے نتائج دور رس ثابت ہوں گے۔ انھوں نے مختلف مثالوں کے ذریعے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ اپنے ایمان کی آبیاری کے لیے میں ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ایمان کو روشن تر کرنے کے لیے ادب کے علاوہ کوئی اور موثر وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ اپنے ایمان کی قوت کو بڑھانے اور اپنے ایمان پر قائم رہنے کے لیے مطالعۂ ادب سے مجھے زندگی کی نئی تحریک ملتی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ میں ایسے ادب کو نہیں پڑھتا جس سے مجھے اندازہ ہو کہ اس کا کوئی مقصد ہے۔ جہاں احساس برتری کے لیے، سیاسی مفادات کے لیے، ادب کے نام پر جو کچھ لکھا جاتا ہے، ایسے ادب سے میری کوئی دلچسپی نہیں۔ تفریح کے لیے، لطف اندوزی کے لیے، ادب پڑھنے کے رویے سے انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں ستیم، شیوم اور سندرم، تینوں چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے ادب پڑھتا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھنے کے علاوہ دوسروں کو بہتر طور پر جانچنے اور پرکھنے کے لیے ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ قدرت کے اصولوں سے واقفیت کے لیے، زندگی کے راز و نیاز سے آگاہی کے لیے مجھے ہمیشہ ادب سے مدد ملی ہے۔ پیغام آفاقی نے اوریجنل ادب کی اہمیت و افادیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ مستعار ادب سے مجھے کبھی رغبت نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ ہی اوریجنل متن کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترسیل و ابلاغ کے حوالے سے ادب کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ دوسروں کے محسوسات کو ہم صرف ادب کے توسط سے ہی جان سکتے ہیں۔ اگر ہم ادب کا مطالعہ نہیں کریں تو دوسروں کے ساتھ ترسیل میں ہم کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے کہا کہ ادب سے بے رغبتی جس

قدر عام ہوگی، اسی قدر تہذیب کا زوال ہوگا، فسادات ہوں گے، سماجی امن وسکون کا شیرازہ بُری طرح بکھر جائے گا۔ لہٰذا مستقبل میں خوب صورت خوابوں کے ساتھ جینے کی خواہش اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جب ادب کا مطالعہ زندگی کی اہم ترجیحات میں شامل ہو جائے۔

چائے کے وقفے کے بعد ڈاکٹر سراج اجملی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مطالعۂ ادب سے اپنی رغبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اپنی شخصیت کو منظم اور مرتب کرنے کے لیے میں نے ہمیشہ ادب کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ ذہن سازی کے سلسلے میں ہمیشہ مجھے ادب سے مدد ملی ہے۔ حیات وکائنات کے اسباب پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ ادب نے ہی مجھے ترغیب دی ہے۔ مخصوص کتابوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے مثنوی مولانا روم کا بہ طور خاص حوالہ دیا اور کہا کہ یہ مثنوی بار بار پڑھے جانے کا تقاضہ کرتی ہے اور ہر بار اس کے مطالعے سے زندگی کے اچھوتے گوشے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ابتدا میں ادب کا شعور بالکل مختلف تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے سمجھنے کے رویے میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں اور اسی تناظر میں ادب کا شعور نکھرتا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب کے ذریعے کردار سازی میں بہت مدد ملتی ہے۔ عرفانِ ذات کی منزل سے آگاہی ہوتی ہے اور احساسِ زیاں وردِ نایافت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی نے اپنا مقالہ ''میں خالی ہوں مجھ کو کوئی کام دے'' کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب میں مجبوری میں پڑھتا ہوں۔ ادب کا استاد ہونے کی حیثیت سے پڑھانے کے لیے میں ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مطالعے کو ریاضی کی مشق سمجھا جاتا ہے۔ ادب کا کام بننے کا نہیں۔ جو لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ ادب کو لوگوں نے ایک انڈسٹری بنا دیا ہے، جس پر جتنا افسوس کیا جائے، کم ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب میرے لیے پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں ادب کا مطالعہ اس لیے کرتا

ہوں کہ میں اس کے علاوہ دنیا کا کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتا۔ اگر میری زندگی سے ادب نکل جائے تو میرا وجود ہی ختم ہو جائے۔ میرے پاس ادب کے علاوہ کوئی دوسری جائے پناہ نہیں ہے۔ ادب پڑھنے کے دوران میں تھیوریز اور نظریات سے گریز کرتا ہوں اور خالص ادب پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنی روایت اور تہذیب سے وابستہ ہونے کے لیے ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ قطعات اور رُباعیات میں ادب کم ہوتا ہے اور پتے کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی چیزوں کا مطالعہ میں نہیں کرتا۔ انھوں نے فکشن اور شاعری سے اپنی خاص دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ادب جمہور کے لیے نہیں بلکہ خواص کے لیے ہوتا ہے۔

دوسرے اجلاس کا آخری مقالہ پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب پڑھنے کا معاملہ بالکل ذاتی ہوتا ہے۔ مطالعہ کسی طرح کے جبر کو برداشت نہیں کرسکتا۔ جس طرح ذوق ناشناس کے لیے موسیقی کی غنائیت اور کشش کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اسی طرح ادب کی سحر انگیزیوں سے ناواقف حضرات ادب کے حسن سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ادب کے ذریعے ایک ترنم پھوٹتا ہے، لیکن اس ترنم سے وہی لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں، جو اس کا شعور رکھتے ہیں۔ ادب تو وہ ہے جس میں شگفتگی ہو، رعنائی ہو، زبان و بیان کا حسن ہو، اور دل پر نقش ہو جانے والی اثر انگیزی ہو۔ انھوں نے بتایا کہ مشاہداتی علوم کے طول وعرض، احساس کی گہرائی اور انداز بیان کی گہرائی سے ادب وجود میں آتا ہے۔ حقیقت پسندی، انسان پسندی کی جبلّت ہے اور ادب میں انسان کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے میں ادب کا مطالعہ ذوق وشوق سے کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اچھا ادب دامنِ دل کھینچ لیتا ہے۔ ادب جتنا بامحاورہ اور دلچسپ ہوگا، اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ فطری اور غیر تصنع ادب مجھے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ادب نے ہمیشہ مجھے بیدار رہنا سکھایا ہے، بُرائی سے پرہیز کرنا سکھایا ہے اور زندگی کو نئی اُمنگوں کے ساتھ جینے کی تحریک دی ہے۔ میں کسی دوسرے کی مدد سے نہیں بلکہ خود اپنے ذہن کی رہنمائی قبول کرتے ہوئے ادب کو سمجھنے کی کوشش

کرتا ہوں ۔ ادب مجھے ذہنی گھٹن سے نجات دلاتا ہے ۔ ہم اپنی زندگی کو ادب کے حوالے سے ایک مقصد دینے میں کامیاب ہو پاتے ہیں ۔

صدر جلسہ پروفیسر قاضی عبد الستار نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام مقالہ نگار حضرات کو مبارک باد دی اور کہا کہ بیش تر لوگوں نے اپنے موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ہر چند کہ بعض لوگوں نے ادب پڑھنے کے ذاتی اسباب بیان کرنے کے بجائے ادب کی تعریف و توصیف پیش کرنے میں دلچسپی دکھائی اور اپنی باتیں کہنے کے بجائے دوسروں کے حوالے غیر ضروری طور پر پیش کیے، لیکن مذاکروں اور سیمیناروں میں اتنی گنجائشیں تو لوگ نکال لیتے ہیں ، پھر بھی مجھے ذاتی طور پر بے حد خوشی ہوئی کہ لوگوں نے محنت کی اور ایک انوکھے موضوع پر دلچسپ خیالات سپرد قلم کیے ۔ انھوں نے صدر شعبۂ اُردو پروفیسر قاضی افضال حسین کی قائدانہ صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہمیشہ ہی نئے زاویے سے غور وفکر کے قائل رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دورِ صدارت میں جتنے بھی سیمینار اور مذاکرے منعقد ہوئے وہ روایتی موضوعات سے بالکل مختلف تھے ۔ نئے نئے موضوعات پر لوگوں کو گفتگو کے لیے آمادہ کرنا اپنے آپ میں بے حد مشکل کام ہے اور اس مذاکرے میں شعبۂ اُردو کے تمام اساتذہ کی شرکت بھی اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ آج بھی ہماری دانش گاہ، دوسری دانش گاہوں سے اپنا اختصاص قائم رکھنے میں پیش پیش ہے ۔

۳۰ ر مارچ ۲۰۰۷ء کو صبح دس بجے دو روزہ قومی مذاکرے کا تیسرا اجلاس پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ جس میں پروفیسر شمیم حنفی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے ۔ اس اجلاس میں کل آٹھ مقالات پیش کیے گئے ۔

پہلے مقالہ نگار ڈاکٹر علی عمران عثمانی نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ ادب زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کی تعریف ہر عہد میں تبدیل ہوتی رہی ہے ۔ مطالعۂ ادب کے سلسلے میں اپنے ذاتی اسباب کے متعلق انھوں نے کہا کہ میرا تعلق

عارضی اساتذہ کے اس قبیلے سے ہے جو مجبوری میں ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، ضرورت کے تحت ادب پڑھتے ہیں۔ ادب پڑھنے کے فوائد بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمارے ذہن کے بند دریچے ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کھلتے ہیں اور ہمارے سوچنے سمجھنے کے رویے میں نمایاں تبدیلی آتی ہے۔

محترمہ حمیرا آفریدی نے اپنے مقالے میں اس بات کی وضاحت کی کہ بچپن میں ہی کہانیوں سے ایک خاص تعلق قائم ہوگیا تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ ادب سے دلچسپی کی بنیاد بنتا چلا گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ادب پڑھنے میں خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ادب ایک خزانہ ہے۔ سلسلۂ روز و شب کی پیش کش ہے، جادو ہے، نشہ ہے۔ میں ادب کا مطالعہ اس لیے بھی کرتی ہوں کہ زندگی کی نئی توانائیاں اور اُمنگیں ہمیں سرشار کرسکیں۔

ڈاکٹر سیما صغیر نے مطالعۂ ادب کے سلسلے میں اپنے معروضات بیان کرتے ہوئے اس بات کی نشان دہی کی کہ ادب پڑھ کر کبھی ہم زندگی کو تبدیل ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں، کبھی ہم خود کو اندر سے تبدیل پاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ گھر میں سازگار ادبی ماحول ملنے کی وجہ سے خود بہ خود ادب سے ایک خاص انسیت ہوتی چلی گئی اور شعور میں بیداری کے ساتھ ہی مطالعے کا معیار بنتا چلا گیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے کہا کہ نفسِ انسانی ایک مرکز کے طور پر ادب میں موجود رہتا ہے۔ ادب کی ایک غیر معمولی قوت اس بات میں بھی پوشیدہ ہے کہ اس کے توسط سے پڑھنے والا ان دیکھے زمانوں کا معاصر بن جاتا ہے۔ ادب میں انسانی فکر اور وسعت کا زیادہ اظہار ممکن ہو پایا ہے۔ ادب کے ذریعے حق بینی اور خود شناسی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے اپنے مقالے میں اس بات پر زور دیا کہ مجھے ہمیشہ سے ہی فکشن سے زیادہ شاعری سے دلچسپی رہی ہے، اور بہترین اشعار کو میں نے ہمیشہ ہی رومانی خوابوں اور آرزوؤں کی تمثیل کے طور پر دیکھا ہے۔ فکشن میں بھی تاریخی اور رومانی ناول کے ساتھ جاسوسی ادب کا مطالعہ میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مطالعۂ ادب کے سلسلے میں مختلف نظریات کے تابع ہو کر انھوں نے

کچھ بھی پڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے ذوق کو تبدیل کرنا پڑا، جس کی بنا پر اکثر یہ ہوا کہ جو لوگ ابتدا میں مجھے بے حد پسند تھے، بعد میں ان کی تحریریں مجھے متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ انھوں نے بتایا کہ ادب کی خوش گوار قدریں مجھے عزیز ہیں اور مطالعۂ ادب کے سلسلے میں میں نے روایتی طرزِ فکر کو بھی نظر انداز نہیں کیا، لیکن مجھے جدید پسند رجحان نے ذاتی طور پر زیادہ متاثر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب پڑھ کر کسی کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک زندگی کے تئیں اپنے رویے میں وہ اصلاح نہ کر لے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ادب کا مطالعہ اگرچہ احساسِ جمال کی تسکین کے لیے کرتا ہوں، لیکن میرے فکشن پڑھنے کا طریقہ جدا ہے اور شاعری پڑھنے کا انداز مختلف۔ دونوں کے مقاصد چوں کہ مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ان دونوں کی قرأت علیحدہ طرز پر ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر کنیز خواجہ نے اپنے مقالے میں اس بات کی وضاحت پیش کی ہے کہ ادب کی ایسی حتمی تعریف اب تک نہیں پیش کی جا سکی ہے جس پر تمام لوگ متفق ہوں، اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب بھی ہر لمحہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مختلف مغربی نقادوں اور ادیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ادب شخصیت کی باطنی تہوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ جب تک متن کا سنجیدگی سے مطالعہ نہ کیا جائے، اس کی تہہ داریوں سے واقفیت نہیں ہو پاتی۔ عام قاری اور خاص قاری کا فرق مطالعۂ ادب کے ضمن میں اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مختلف عہد کے قارئین اپنے لحاظ سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ زمانے کی تبدیلی اور معیار کا فرق ان کے مطالعے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قاری اپنی ذہنی استعداد کے مطابق کسی بھی متن سے مخصوص معنی مراد لیتا ہے۔ ڈاکٹر کنیز خواجہ نے ماڈل ریڈر کا بہ طور خاص ذکر کیا جسے پڑھنے کے عمل میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ادب کے ذریعے اپنے محسوسات کو، مختلف تجربوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے راستے بہتر طور پر ادب کے ذریعے ہی کھلتے ہیں۔ ادب کا خاص کمال یہ ہے کہ اس کے

ذریعے ہمیں دیکھی ہوئی دنیا نئی معلوم ہوتی ہے۔ پڑھنے کے ذریعے میں اپنے اندر کے انسان کو تلاش کرتی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کلاسیکی ادب کے ساتھ ہی ہمیں لائٹ ادب کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے ذہن کو یک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے اپنا مقالہ ''ادب سے ہمارے معاملات کی نوعیت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنی پُرکشش تحریر کے ذریعے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ دیکھنے اور محسوس کرنے کا عمل یکساں نہیں ہوتا۔ ادب کے ذریعے پہلے ہم دیکھی ہوئی دنیا کو نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور جب اس دنیا کو مختلف سیاق وسباق میں محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو زندگی کے بہت سے اسرار ہم پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادب مسائل کا حل پیش نہیں کرتا، لیکن مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ ادب ہمیں بستر نہیں دیتا، لیکن آنکھوں میں جھلملانے والے سنہرے خواب بھر دیتا ہے۔ ادب پڑھنے کے اپنے ذاتی اسباب کا بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ زندگی کے نازک لمحات میں مجھے صرف ادب نے ہی سہارا دیا ہے۔ میں ادب پڑھتا ہوں کیوں کہ ادب کا مطالعہ، زندگی کی نئی اُمنگوں سے سرشار کر دیتا ہے، اور ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کے ذریعے ہی مجھے اس بات سے آگاہی ہو پائی کہ طلب کی کوئی انتہا نہیں اور محرومی سے بڑا کوئی عذاب نہیں۔ مجھے ادب نے لذتِ خاموشی سے ہمکنار کیا ہے اور کنجِ تنہائی میں خود کو دریافت کرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔

جناب فرحت احساس نے اپنی فکشنائیز تحریر میں اپنے بچپن کے متعدد واقعات کو بڑے دل نشیں پیرائے میں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ خود آگہی کا پہلا سبق میں نے چار پانچ سال کی عمر میں اس وقت سیکھ لیا تھا جب میں مکتب گیا، لیکن پٹائی دیکھ کر مکتب سے بھاگ آیا۔ انھوں نے ادب کے ساتھ اپنے طویل معاملۂ عشق کا ذکر بڑے موثر انداز میں کرتے ہوئے بتایا کہ ادب کی اندرونی کشش سے متاثر ہو کر ہی میں لاشعوری طور پر ادب کا مطالعہ کم عمری سے ہی کرنے لگا۔ مکتبی تدریس سے میں نے ہمیشہ ہی وحشت محسوس کی ہے۔ ادب کا مطالعہ کسی دباؤ یا جبر کے تحت نہیں کیا جا سکتا اور

میں نے اپنی زندگی میں اس اصول کو اپنے لیے لائق اعتنا گردانا ہے۔ مجھے ادب اپنے آپ کو سالم دیکھنے کی قوت دیتا ہے۔ ادب کا مطالعہ کبھی مجھے خود اپنے آپ سے منکر بناتا ہے، کبھی اپنے آپ کو رد کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے اور رد و قبول کے اس مرحلے میں ہر قدم پر زندگی کا الہام ہمیں حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ فرحت احساس نے کہا کہ ادب میری اپنی توثیق کا ذریعہ ہے۔ کسی بھی زندہ ادب کو پڑھ کر مجھے از سرِ نو اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

تیسرے اجلاس کا آٹھواں اور آخری مقالہ پروفیسر نقی حسین جعفری نے پیش کیا۔ انھوں نے میتھیو آرنلڈ کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ ادب کے ذریعے زندگی کی تلاش ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ادب کی اہمیت تبدیل ہوتی رہی ہے، جس کی بنا پر خود زندگی تغیر و تبدل سے دوچار ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کے ذریعے انسانی صورت حال کا اندازہ بہتر طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ انسان کو بُرے وقت میں ادب کے سہارے جتنی تقویت حاصل ہوتی ہے، اتنی کسی اور وسیلے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مختلف مثالوں کے ذریعے انھوں نے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ تاریخ نویسی میں مخصوص ادب کو اعتبار کا درجہ حاصل ہو رہا ہے۔ ہمیں غدر کے بعد کے حالات کا جائزہ لینا ہو تو کوئی تاریخی دستاویز ہمیں اس عہد کے ذہنی انتشار سے اس طرح واقف نہیں کرا سکتا، جتنا ہم خطوطِ غالب کے ذریعے زندگی کے درد اور کرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں۔ ادب پڑھنے کے اپنے ذاتی اسباب بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ حُزنیہ لے کی بنا پر میں ادب کا مطالعہ بڑے انہماک سے کرتا ہوں۔ کائنات کی ترغیب تو اچھے ادب کی شناخت ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے صدارتی تقریر کے دوران تمام مقالوں پر اپنی مختصر رائے پیش کی اور تمام لوگوں کی کاوشوں کو خاطر خواہ سراہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم محسوسات کی نئی دنیا تلاش کرنے کے سلسلے میں ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہاں تک رسائی ہمیں طمانیت کے جذبوں سے سرشار کر دیتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تطہیرِ نفس کا معاملہ ادب کے علاوہ کسی بھی دوسرے وسیلے سے ممکن نہیں ہو سکتا۔

مذاکرے کا چوتھا اجلاس دوپہر تین بجے پروفیسر نقی حسین جعفری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر شمیم حنفی، مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس اجلاس کی نظامت پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کی جس میں کل سات مقالے پڑھے گئے۔

پہلا مقالہ ڈاکٹر ناز بیگم نے ''مطالعۂ ادب کے اسباب'' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب سے رغبت کے لیے زبان سے واقف ہونا لازمی ہے۔ دیگر فنون میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن ادب کی عمارت، زبان کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہے۔ انھوں نے ادب کو جذبات و تصوّرات کا بہترین اظہار بتایا، جس کے ذریعے پڑھنے والے خاطر خواہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ادب کا ہی کرشمہ ہے کہ معمولی بات میں بھی غضب کی دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ ادب کو انھوں نے تہذیب و معاشرت کا نقشہ اور بشری صفات کا مرکز قرار دیا، اور کہا کہ ادب کا مطالعہ کرنے سے انسان خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے، اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کر سکتا ہے، زبان کی شیرینی کا قائل ہو کر اپنا لہجہ نرم کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی جوہر نے اپنے پُر مغز مقالے میں ادب کی معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی اور موجودہ عہد کے بدلتے ہوئے منظرنامے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ادب آدمی کو انسان بناتا ہے، زندگی کو نئی اُمنگوں کے ساتھ جینے کی تحریک دیتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے اس عہد میں ادب کی اہمیت و افادیت پر سوالیہ نشان قائم کر دیے گئے ہیں، لیکن ہمیں اس بات کو قطعی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ادب نے ہر زمانے میں زندگی کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے اور مستقبل میں بھی ہزار خدشات کے باوجود اس کی اہمیت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ انھوں نے کہا کہ آج جس تیزی کے ساتھ اخلاقی سطح پر ہمارا زوال ہوتا جا رہا ہے، اس کے پیشِ نظر صرف ادب کی بدولت ہی ہمارے قدم لغزشوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے عہد میں ادب کی اہمیت پہلے سے

زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ادب کے وسیلے سے ہی عرفانِ ذات اور عرفانِ کائنات کی منزلوں تک ہماری رسائی ہو پاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا معاملہ مسرّت سے شروع ہو کر بصیرت پر ختم ہوتا ہے۔ ادبی فیصلے بصیرت پر مبنی ہوتے ہیں، جن کے ذریعے زندگی کی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں ۔ ادب اور تاریخ کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے مختلف مثالوں کے ذریعے ادب کی افضلیت ثابت کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ اخلاقی تمدن کی راہ ادب کے بجائے کسی اور وسیلے سے کبھی نہیں کھلتی۔

جناب امتیاز احمد نے ادب سے رغبت کے سلسلے میں ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ گھر میں ہی ادبی ماحول مل جانے کی بنا پر بچپن میں ہی کتابوں سے اٹوٹ رشتہ قائم ہونا شروع ہو گیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے والد محترم کی مسحور کن شخصیت کا خاص حوالہ دیا جن کی بدولت ذہنی تربیت ایک خاص نہج پر ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ ابتدا میں مطالعۂ ادب کا عمل غیر شعوری عمل تھا، لیکن تعلیم کے لیے جب علی گڑھ سے ایک رشتہ قائم ہوا تو یہاں کی سازگار فضا نے مطالعۂ ادب کے لیے سنجیدگی سے راغب کرنا شروع کیا۔ پڑھنے کے سلسلے میں اپنے ذاتی اسباب بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ منتخب کتابوں کے مطالعے کو ہی میں نے ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ نیا ادب مجھے متاثر نہیں کرتا، اس لیے میں نئی کتابیں پڑھنے سے گریز کرتا ہوں۔ مطالعۂ ادب سے اپنے شغف کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ کبھی تو وہ عادتاً پڑھتے ہیں، کبھی ضرورتاً اور کبھی ذہنی سرشاری کی غرض سے کتابوں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے اپنے مقالے میں اس بات کو واضح کیا کہ مطالعۂ ادب کے سلسلے میں ذاتی اسباب کا بیان بے حد مشکل ہے۔ زندگی میں ہم بہت سے کام کرتے تو ہیں لیکن کیوں کرتے ہیں اس کی وجہ بتانا آسان نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ میں ادب کا مطالعہ اس لیے کرتی ہوں کہ اس کے ذریعے قلب و ذہن کو نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔ زبان کا بہتر شعور ادب کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔ شاعری اور فکشن

دونوں سے انھوں نے اپنی پسندیدگی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ شاعری ان کے لیے دل کی سہیلی ہے اور فکشن بڑے عمر کی محبوب۔ شاعری پڑھتے ہوئے انسان محسوسات کی بازیافت کرتا ہے، جب کہ فکشن پڑھتے ہوئے کرداروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچپن میں ہی کتابوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جس کے لیے گھر کا سازگار ادبی ماحول خاص اہمیت کا حامل تھا۔

پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے مقالے میں ادب کے متنوع پہلوؤں کو نشان زد کیا اور بتایا کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ انسان کے محسوسات کا عکس ہے، اور ادب انھیں محسوسات کو دائمی شکل میں پیش کرنے کا موثر وسیلہ ہے۔ انسانی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو جتنے بہتر طریقے سے ہم ادب کے ذریعے جان سکتے ہیں، کسی اور وسیلے سے نہیں جان سکتے۔ انھوں نے کہا کہ ادب انسانی زندگی کی اکائیوں کو توڑتا نہیں، جوڑتا ہے۔ جیتی جاگتی صورت حال کو اُجاگر کرتا ہے، نفس کو پاک کرتا ہے، خوشی کی سوغات تقسیم کر کے زندگی کے درد کو بھلا دیتا ہے۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل ادب کے ذریعے ہمارے سامنے نمایاں ہوتے ہیں، جن سے نبرد آزما ہونے کی قوت بھی ہمیں ادب سے ملتی ہے۔ ادب پڑھنا انسان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کچھ عرصے قبل تک ہر شعبے کے لوگ ادب سے دلچسپی رکھتے تھے، لیکن اب یہ صورت حال تبدیل ہو گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیشنلزم نے ادب کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ تصورِ زمان یا تصورِ کائنات کا زوال ہو رہا ہے۔ اس کائنات میں سب کچھ ہے، لیکن انسان نہیں ہے۔ ادب کی اہمیت واضح کرتے ہوئے پروفیسر چھتاری نے اس بات پر زور دیا کہ فلسفہ اور سائنس کسی میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ گزرے ہوئے زمانے کو تھامے رکھے۔ ادب گزرے ہوئے زمانے کو حال بناتا ہے اور انسان کو عرفان کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ دوسرے علوم کسی بھی طرح ادب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ ادب ہمارے تجربات کی عمر طویل سے طویل کرتا ہے۔ ادراک، وجدان، بصیرت اور بصارت کے دروازے ادب کے ذریعے ہی ہم پر کھلتے ہیں۔ ہم جو کچھ نہیں دیکھ پاتے، انھیں صرف ادب کے وسیلے سے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے ادب سے اپنے تعلق کی وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب ان کے لیے زندگی کے متنوع پہلوؤں کی مانند ہے۔ کبھی میں شوق سے ادب کا مطالعہ کرتا ہوں، کبھی میرے مطالعے میں ضرورت کا دخل ہوتا ہے اور کبھی بہ حالت مجبوری بھی ادب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ادب کے ذریعے تحیر بیدار ہوتا ہے اور تجسس میں اضافہ ہوتا ہے۔ بچپن کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس زمانے میں مقبول عام ادیبوں کی تحریروں سے خاص رغبت ہوا کرتی تھی اور ابن صفی میرے پسندیدہ ادیب تھے، جن کے بعض کرداروں کو میں خود اپنے اندر سانس لیتا ہوا محسوس پاتا تھا۔ زندگی میں خیر وشر کا تصادم ہمیشہ میری پریشانیوں میں اضافے کا باعث ہوتا، لیکن ادب کے ذریعے ہی مجھے اس بات سے آگاہی ہوئی کہ شر خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو، بالآخر اس کی شکست ہوتی ہے اور خیر کا پہلو یعنی حق ہمیشہ سُرخرو ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب اور غیر ادب کا فرق ادب کے بہترین نمونوں کو پڑھ کر معلوم ہوا۔ پروفیسر افراہیم نے اس بات پر زور دیا کہ ادب ایک فنِ لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے اور انسانی محسوسات اس کے سرچشمے ہیں۔ ادب زندگی کی پیچیدگیوں سے واقف کراتا ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے، اور اس خوبی کی بنا پر ادب دوسرے تمام علوم سے سربلند ہے۔ ادب ایک دریافت ہے، انکشاف ہے، جو جلدی گرفت میں نہیں آتا۔ ادب زندگی اور تہذیب کا عکاس ہے۔ ادب ذہن کے نازک ترین احساسات کو بہترین زبان عطا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں انور سجاد کے ناول ''خوشیوں کا باغ'' کے فنی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا۔

چوتھے اجلاس کا ساتواں اور آخری مقالہ، معروف فکشن رائٹر شموئل احمد نے پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ذوقِ جمال کی تسکین کے لیے میں ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ادب کا مطالعہ میری داخلیت کی بازیافت ہے۔ بہ طور انجینئر میں اپنی داخلیت میں مرتا رہا ہوں، اور اسی ذہنی اذیت سے نجات کے لیے میں نے ادب کے دامن میں پناہ لینے

کی کوشش کی ہے۔ انجینئرنگ کے پیشے نے مجھے اخلاقی طور پر مسخ کردیا تھا۔ میں نے ازسرنو اپنے آپ کو دریافت کرنے کے لیے ادب کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ انسان ادب کے ذریعے بہ یک وقت دو زندگیوں کو جینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک زندگی تو وہ کہ جسے وہ مجبوراً جیتا ہے اور دوسری وہ کہ جسے وہ جینا چاہتا ہے، لیکن جی نہیں سکتا۔ انسانی زندگی کا سب سے عظیم نقصان خوابوں کا چھن جانا ہے۔ شموئل احمد نے بتایا کہ ادب میرے لیے چارہ گر ہے۔ ادیب اپنی دنیا کا خدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے تخیل، اپنے مشاہدے اور تجربات سے ایک انوکھی دنیا کی تخلیق کرتا ہے، اور زندگی کو خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نئے زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسانی دوستی کا شعور ادب پیدا کرتا ہے۔ سیاست جہاں انسان کو کاٹتی ہے وہیں ادب کے ذریعے انسان کو جوڑنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد شام پانچ بجے مذاکرے کا پانچواں اور آخری اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت بھی پروفیسر نقی حسین جعفری نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں کل چھ مقالے پیش کیے گئے۔

پہلا مقالہ جناب شہاب الدین نے پیش کیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے سب سے پہلے تو ادب کی تعریف پیش کی اور پھر ادب کی بنیادی خصوصیات کے حوالے سے اپنے ادب پڑھنے کے معروضات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ ذوقِ جمال کے لیے میں ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ادب سے کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ زندگی کی ناہمواریوں اور تلخیوں سے نجات ملتی ہے۔ ادب ہمیں جینے کا حوصلہ بخشتا ہے۔

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب نے اپنے مقالے میں اس بات کی وضاحت کی کہ مطالعۂ ادب کا معاملہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کا ہے۔ دوسرے لوگ جس زاویے سے ادب کو دیکھتے ہیں، ممکن ہے میں کسی اور نہج پر ادب کو پرکھنے اور اپنے اندر محسوس کرنے کی کوشش کروں۔ انسان کی صواب دید پر اس بات کا انحصار ہے کہ وہ کسی فن پارے کو کس سیاق و سباق میں دیکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سائنسی ترقی نے ادب

کی اہمیت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے اور یہ بلا شبہ لمحۂ فکریہ ہے۔ ادب کی اہمیت قرأت سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اچھا خاصہ زمانہ گزر جانے کے باوجود مخصوص عہد کا ادب ہماری زندگی کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ہمارے قدموں کو لغزشوں سے بچاتا ہے۔ جو لوگ شاعری پر تنقید کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ انھوں نے فلپ سڈنی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ادب انسانی تخیل کو مہمیز کرتا ہے۔ ادب کو سائنس پر فوقیت حاصل ہے۔ ضیافتِ طبع، ترتیب و تنظیم کا سلیقہ اور شعور ادب کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہی محرومیوں و نامرادیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ جن قوموں کی زبان اور تہذیب زندہ رہتی ہے وہ کبھی نہیں مرتیں۔ اچھا ادب ہمیں مسرّت کے ساتھ بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ زندگی سے ادب کا رشتہ ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جس نے ادب نہیں پڑھا وہ معقول نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ''ادب کا بڑا باغ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مادّی وجود تک رسائی تو کسی اور وسیلے سے بھی ممکن ہے، لیکن آگہی و شعور کا وجود صرف ادب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ نسل انسانی کی ساری شادمانیاں ادب کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ ادب کی بنیاد تجربے یا احساس پر ہوتی ہے۔ ادب میں تخیل کی نادر کاری نت نئے جلوؤں میں نمایاں ہوتی ہے۔ ادب کا ساحرانہ عمل اسے دوسرے علوم سے ممتاز کرتا ہے۔ پُرانی اشیا اور قدریں ادب کے وسیلے سے ہی نئی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ بے زبانوں کو زبان اور گونگوں کو گویائی ادب کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔ انسان خود آگاہی کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کے ذریعے باطن کی تطہیر ہوتی ہے۔ زبان و بیان کی سحر انگیزیوں کو ادب کے وسیلے سے ہی قوت ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں جوش ملیح آبادی کے ایک پُر لطف، لیکن طویل خط کو من وعن نقل کر کے یہ بتانے کی کوشش کی کہ زبان و بیان کی چاشنی کیسے کیسے جلوے دکھاتی ہے۔

قومی مذاکرے کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر سیّد محمد ہاشم نے ہزار مصروفیتوں کے باوجود مقالہ پیش کیا اور ادب سے متعلق بنیادی باتوں کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا مطالعہ انسان کو منکسر المزاج ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ نرم گفتاری کا سبق صرف ادب کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مختلف فلسفیوں کے حوالے سے انھوں نے اس حقیقت کی نشان دہی کی کہ دنیا نے ادب، بے ادبوں سے ہی سیکھا ہے۔ ادب کے ذریعے ہی ہمیں یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ ہم کن باتوں کو زندگی میں اختیار کریں، اور کن باتوں سے پرہیز کرنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ ادب ذہن کی تشکیل میں حددرجہ معاون ہوتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہی ذہنی افق روشن ہوتا ہے، لطف و انبساط حاصل ہوتا ہے، جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے، روحانی قدروں کی بازیافت ہوتی ہے، اخلاقی سطح پر بلند ہونے کی تحریک ملتی ہے اور بحیثیت مجموعی ایک بہترین انسان بننے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے، دوسری زبان اور قوم کے لوگوں سے رابطے کی سبیل پیدا کرتا ہے۔ انسان دوستی کے تصور کو وسعت بخشتا ہے۔

پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے مقالے میں اس بات کی نشان دہی کی کہ ذاتی نوعیت کے سوالات کے تشفی بخش جوابات دینا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ اگر آپ کا روئے سخن خود اپنی جانب ہو تو اپنا محاسبہ کرنا اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔ انھوں نے کہا کہ ادب طے شدہ اصولوں اور منصوبوں کی روشنی میں نہیں پڑھا جاسکتا۔ انھوں نے بتایا کہ ابتدا میں انھوں نے ضرورت اور مجبوری کے تحت ادب کا مطالعہ شروع کیا جو بعد میں شوق بن گیا۔ انھوں نے بتایا کہ مختلف اوقات میں ادب پڑھنے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی لکھنے کی خواہش کے مطابق ادب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، کبھی خود کو معاصر ادبی صورت حال سے باخبر رکھنے کی خواہش مطالعۂ ادب کی جانب طبیعت کو مائل رکھتی ہے۔ کبھی ارتکاز اور ذہنی یکسوئی کی خاطر بھی ادب کے مطالعے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ کبھی عادتاً ادب پڑھنا ذہن کو سکون بخشتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان و بیان کے مختلف اسالیب ادب کے ذریعے ہمارے حافظے میں محفوظ

ہو کر ہمیں زندگی کا انوکھا شعور بخشتے ہیں۔ کبھی لہجے کی موزونیت ہمارے ذوق کو جلا بخشتی ہے، کبھی خیالات کے لطیف اور نازک فرق کو ہم ادب کے ذریعے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں، کبھی باطن کے حیرت کدے کو دیکھنے اور دکھانے پر اصرار کرتے ہیں، کبھی مادّی وجود سے ماورا ہو جاتے ہیں اور کبھی سرشاری کا لمحہ عرفانِ ذات کی منزلوں سے آشنا کراتا ہے۔

دو روزہ قومی مذاکرے کے روحِ رواں اور صدر شعبۂ اُردو پروفیسر قاضی افضال حسین نے پانچویں اجلاس کا آخری مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ادب کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ادب نے ہمیشہ ہی انسان کا بہترین مطالعہ پیش کیا ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انسانوں کے متعلق ہر اصول بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے اور اس بنا پر انسان کو سمجھنے کی راہیں مزید پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہیں، لیکن ادب ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے توسط سے اس پیچیدہ گتھی کو بہت حد تک ہم سلجھانے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے فرائیڈ کے حوالے سے لاشعور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ادب کے ذریعے انسان کی نفسیاتی گرہوں کو بہت حد تک سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بارہ سال کی عمر میں انھیں ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی جو وقت کے ساتھ ساتھ ایمان کا روپ اختیار کرتی چلی گئی۔ بچپن میں ناولوں کو زیادہ شوق سے پڑھا کرتا۔ کالج کے دنوں میں جب ذہن میں تھوڑی پختگی آئی تو شاعری نے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا۔ پروفیسر افضال نے اس بات پر زور دیا کہ ادب تخیل کو فروغ دیتا ہے، قوتِ متخیلہ کو متحرک کرتا ہے۔ ادب پڑھتے ہوئے میں نے ہمیشہ ہی فن پارے کے کرداروں میں خود کو محسوس کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادیب اپنے ذہن سے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ دنیا حقیقی دنیا سے بلا شبہ قدرے مختلف ہوتی ہے، لیکن مجھے حقیقت کے بجائے حقیقت کا واہمہ زیادہ خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ ادب کی زبان بدلتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا بدل گئی ہے۔ انھوں نے میر اور غالب کی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری نے ہمیشہ میرے اندر زندگی کی نئی تحریک اور خود اعتمادی پیدا کی ہے۔

پروفیسر نقی حسین جعفری نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اس انوکھے مذاکرے میں شرکت کر کے مجھے بے پناہ خوشی حاصل ہوئی۔ ایک بالکل نئے موضوع پر تمام لوگوں نے جس ہنر مندی کے ساتھ اظہار خیال کیا اور اپنے مقالات میں جن باتوں کی نشان دہی کی وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے ورثے کے طور پر زبان اور ادب کی انوکھی دولت پائی ہے، اور اس دولت کی حفاظت ہمیں اپنے وجود کی طرح کرنی چاہیے۔

آخر میں صدر شعبۂ اُردو پروفیسر قاضی افضال حسین نے تمام مقالہ نگار حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا جن کی بدولت دو روزہ قومی مذاکرہ کامیابی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔ انھوں نے شعبۂ اُردو کے تمام اساتذہ کی کاوشوں کو بے حد سراہا اور اس بات کی خوشی ظاہر کی کہ رفقاء نے ان کے اعتماد کو جس طرح مستحکم کیا وہ بھلایا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے کہا کہ بعض لوگوں نے جس بے رحمی سے صداقتوں کا بیان کیا ہے، اس سے ان کے اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔ ادب پڑھنے کے اپنے ذاتی اسباب کا بیان کرنا، کنفیشن لکھنے جیسا ہے اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کنفیشن لکھنا آسان بات نہیں کیوں کہ اس کے ذریعے ہر آدمی ایک آئینہ بناتا ہے اور اس آئینے میں وہ اپنے آپ کو خوب صورت دیکھنا چاہتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر حد درجہ طمانیت ظاہر کی کہ شعبۂ اُردو کے اساتذہ آج بھی دوسری دانش گاہوں کے اُردو اساتذہ سے ہر معاملے میں منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں جو کچھ کرنا چاہیے وہ پوری مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی شعبۂ اُردو کے تمام اساتذہ نے اس دو روزہ قومی مذاکرے میں اپنے مقالے پیش کیے اور مذاکرے کو ہر طرح سے کامیاب بنایا۔ انھوں نے قومی مذاکرے کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر سیّد محمد ہاشم کی انتھک محنت اور جد و جہد کی بہت تعریف کی، جن کی بدولت یہ مذاکرہ کامیابی سے ہمکنار ہو پایا۔

●